شاہین
2019-20
گورنمنٹ زمیندار پوسٹ گریجوایٹ کالج
گجرات
شاہین 2019-20
گورنمنٹ زمیندار پوسٹ گریجوایٹ کالج، گجرات
The Shaheen
2019-20
Govt. Zamindar Postgraduate College
Gujrat

بسم الله الرحمن الرحيم

2019-20

مجلسِ ادارت

سرپرست:

پروفیسر غلام عباس (پرنسپل)

نگران:

پروفیسر ڈاکٹر محمد اقبال بٹ (وائس پرنسپل)

مدیر اعلیٰ:

سید وقار افضل (اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ اردو)

مدیر حصہ انگریزی:

راشد اللہ بٹ (اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ انگریزی)

مدیر حصہ پنجابی:

ڈاکٹر سید وسیم رضا گردیزی (اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ پنجابی)

مدیر حصہ اردو:

محمد مہدی خاور (اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ اردو)

معاون مدیران اساتذہ:

محمد جاوید ساغر (شعبہ انگریزی)، سید سعادت مہدی (شعبہ انگریزی)

محمد سعید (شعبہ فزکس)

طالب علم مدیران:

رافعہ ارشد، سدرہ شہزادی، کومل

ارمین ملک، فیمان، حسین طاہر، عبداللہ

Printed By:
KASHISH PRINTERS
Ph: 042-37157719, 37157726
E-mail: kashish9299@gmail.com

پرنسل کا پیغام
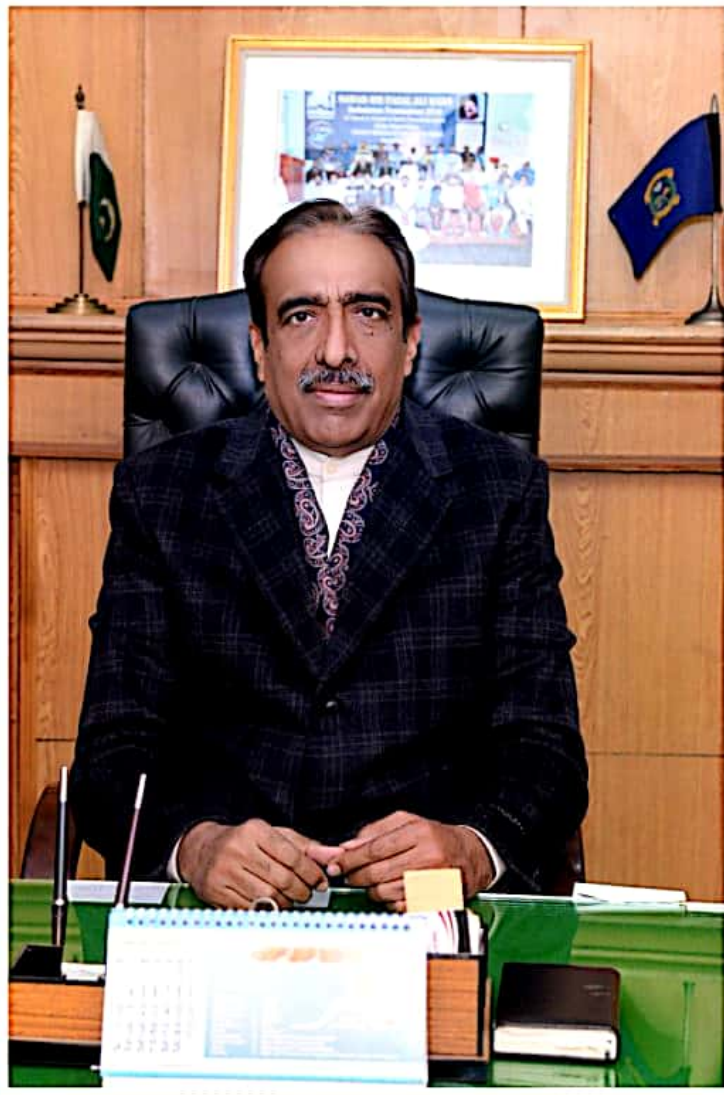
مطالعہء کتب سے نہ صرف فکر و آگہی کے نئے در کھلتے ہیں بلکہ اس کے ذریعے ہم خالص حسی اور ادراکی تجربات کو متنوع تحریری اسالیب میں پیش کرنے کا فن بھی سیکھتے ہیں۔ اس لیے کہا جاتا ہے کہ اچھا لکھنے کے لیے اچھا پڑھنا ضروری ہے۔ میں مجلہ "شاہین" کی اشاعت پر مجلسِ ادارت میں شامل تمام اساتذہ کو مبارک باد پیش کرتا ہوں کہ ان کی زیرِ نگرانی طلبہ و طالبات اپنے تجربات، مشاہدات اور احساسات کو احاطہء قلم میں لانے کی طرف مائل ہورہے ہیں۔

پروفیسر غلام عباس (پرنسپل)

مجلسِ ادارت

2019-20

دائیں سے بائیں اساتذہ: محمد سعید، محمد جاوید ساغر، راشد بٹ، ڈاکٹر محمد اقبال بٹ (وائس پرنسپل)، پروفیسر غلام عباس (پرنسپل)، سید وقار افضل، محمد مہدی خاور، ڈاکٹر سید وسیم رضا گردیزی، سید سعادت مہدی

طالب علم مدیران: رافعہ، ارمین، سدرہ، کومل، فیمان، عبداللہ اور حسین

فہرست

نقد و نظر

پیارے لوگ (خاکے)

افسانہ نامہ

مزاحیات

متفرق مضامین

گوشۂ طارق محمود طارق

رنگِ سخن

پنجاب رنگ

نگارشات کے نفسِ مضمون کی ذمہ داری کلیتہً لکھنے والے پر ہے ۔ ادارے کا مصنفین کے خیالات سے متفق ہونا ضروری نہیں۔ ان کی آراء کو مجلسِ ادارت کی آراء متصور نہ کیا جائے۔ اگر سرقہ، چربہ یا تحریف پائی جائے تو صرف مصنفین جواب دہ ہیں۔

(ادارہ)

اداریہ

تعلیمی اداروں میں نصابی تعلیم کے ساتھ ساتھ ہم نصابی سرگرمیوں کے فروغ کی اشد ضرورت ہے۔ نصاب کے ذریعے محض علم کی ترسیل ہوتی ہے لیکن علم کی عملی صورت کے اظہار کا طریق کار ہم نصابی سرگیوں کی ترویج میں مضمر ہے۔ امتحانات میں نمبرات، گریڈ اور پوزیشن کی دوڑ نے طلبہ کو نصاب کے تنگ دائروں کے اندر اس قدر محدود کر دیا ہے کہ وہ نوٹس، گیس پیپرز، امدادی کتب اور ٹیوشن اکیڈمیز کے گرد چکر لگا لگا کر اپنی فطری صلاحیتوں کی ناگزیریت سے لاعلم ہور ہے ہیں۔ اسی طرح اسباق کو رٹا لگانے والے اور لگوانے والے اس فکری گہرائی سے نابلد ہیں کہ آخر ہمارے " کل" کا کیا ہوگا؟ اس الم ناک صورتِ حال کا نتیجہ یہ ہے کہ اب ہمارا مستقبل یعنی ہمارے طلبہ، علم کی معنویت کو اپنے گرد و پیش پھیلی ہوئی دنیا کے ساتھ منطبق کر کے، نئے اور مفید نتائج اخذ کرنے سے قاصر ہیں۔ یہی سبب ہے کہ وہ اب رائج نظام میں اجتماعی کی بجائے انفرادی بقا کی تگ و تاز میں مصروفِ عمل دکھائی دیتے ہیں۔

سبھی جانتے ہیں کہ نئے اسکول، کالجز اور یونیورسٹیاں کھل رہی ہیں، لیکن ہمارا تعلیمی نصابات سے حاصل کیا ہوا علم، ہمارے عملی کردار کی روشن دلیل بننے کی بجائے، محض ہماری یادداشتوں کے ظلمت خانوں میں جمع ہو رہا ہے۔ اور اسی لیے ہم، عملی طور پر معاشرے میں اسی غیر فعال اور روایتی کردار کو دہراتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں، جو کبھی تاریک ادوار کے افراد کا خاصا تھا۔ یہ وہی کردار ہے جو صدیوں تک آدمی کے انسان بننے کی راہ میں حائل رہا ہے۔ اب ہمیں اس حقیقت کو ماننا پڑے گا کہ تعلیم کا مقصد اچھی ملازمت یا ڈگری کا حصول نہیں، بلکہ نئے دور کے تقاضوں کا مقابلہ کرنے کے لیے تخلیقی اور عملی کردار کو سنوارنا ہے۔ اس لیے موجودہ ترقی یافتہ دور میں انسانی پرورش و پرداخت کا یہ عمل، نصاب اور ہم نصاب کے باہمی اشتراک اور فروغ کے بغیر ناممکن۔

دراصل ہم نصابی سرگرمیاں تجربہ گاہ کی حیثیت رکھتی ہیں، جو نصاب کتابوں میں پڑھا جاتا ہے، اسے، ہم عملی صورت میں، ان سرگرمیوں کی مدد سے نہ صرف تعلیمی اداروں کے اندر وقوع پذیر ہوتا ہوا دیکھتے ہیں بلکہ ان کا حصہ بن کر، فارغ التحصیل ہونے کے بعد عملی زندگی کے نئے چیلنجز سے نبرد آزما ہونے کا ہنر بھی سیکھتے ہیں۔

ہم نصابی سرگرمیوں کی کئی ایک صورتیں ہیں۔ ان میں سے ایک، کسی ادارے کا سالانہ مجلہ بھی ہے۔ جس کے ذریعے طلبہ کو تحریری اظہاریئے کی طرف راغب کیا جاتا ہے۔ اس طرح طلبہ اپنے علم، مشاہدے، تجربات اور احساسات کو تخیلاتی قوت سے منظم کرنے کے بعد، نئے جمالیاتی اور فکری زاویے منظرِ عام پر لانے کی عملی تربیت حاصل کرتے ہیں۔

تعلیمی اداروں کے مجلّات کی اشاعت کا بنیادی مقصد، طلبہ کو تحریری اظہار کے سلیقے سے روشناس کرانا ہے۔ یہ بات مبنی برحقیقت ہے کہ کالج میگزین میں طلبہ کی تحریری کاوشوں کی اشاعت کا عمل، انھیں تحریر کی ایک ایسی مشق فراہم کرتا ہے، جس سے وہ لفظیاتی اکائیوں کی پہچان، انتخاب، جملہ سازی اور شعری مصرعوں کی بنت کا ہنر سیکھتے ہیں۔ اور یوں وہ نظم و نثر کے وسیع تخلیقی میدان میں داخل ہو کر تخلیقی اظہار کے بنیادی اصول وضوابط کا شعور حاصل کرتے ہیں۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ تخلیقی فعلیت سے منسلک طلبہ کی یہ وہ پہلی تجربہ گاہ ہے، جہاں سے وہ تخلیقی قوت کے اظہار کو موثر بنانے کے فہم سے آشنا ہوتے ہیں۔

یہ حقیقت ہے کہ زمیندار کالج کی بیاسی (82) سالہ علمی، ادبی اور تخلیقی فضا سے مجلہ شاہین کے کردار کو منہا کرنا ممکن نہیں۔

38۔ 1937 میں اس کالج کے قیام کے بعد 1939 میں کالج میگزین کا اجرا ہوا۔ محققین کی تحقیق کے مطابق (بشمول موجودہ پرچے کے) اب تک شاہین کے نواسی (89) شمارے شائع ہو چکے ہیں۔ بعض ادوار میں شاہین کی اشاعت، سال میں دو مرتبہ بھی ہوئی اور کچھ سال ایسے بھی گزرے، جن میں اس کی اشاعت کے عمل کو نامعلوم وجوہ کی بنا پر نظر انداز کیا گیا۔ اس سال بھی مجلہ کی اشاعت ناممکن نظر آرہی تھی کیونکہ کالج کے اساتذہ اور موجودہ پرنسپل جناب پروفیسر غلام عباس کے سامنے، بی۔ایس پروگرام کے حوالے سے نئے چیلنجز تھے۔ بہرحال اس ساری صورتِ حال کے باوجود اب شاہین کا تازہ شمارہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ اس کے علاوہ ایک خوش آئند بات یہ ہے کہ یکم نومبر 2019 سے زمیندار کالج میں، مختلف مضامین (اردو، انگلش، فزکس، کیمسٹری، اکنامکس اور اسلامیات) میں بی۔ایس کی کلاسز کا آغاز ہو چکا ہے۔ اگرچہ اس نئے تعلیمی نظام سے متوقع نتائج کے حصول کے لیے، ابھی ادارے کو بہت کچھ درکار ہے، لیکن جس طرح پرنسپل صاحب محدود وسائل کے باوجود کھلے دل سے کالج کے انتظامی معاملات کو بہتر کرنے میں سرگرمِ عمل ہیں، اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہ زمیندار کالج کو ترقی کی نئی راہ پر گامزن کرنے کے کس قدر خواہاں ہیں۔ اس مقام پر اس بات کا ذکر بہت اہم ہے کہ پرنسپل جناب پروفیسر غلام عباس، زمیندار کالج میں تقریباً چھتیس سال پر محیط، اپنی تدریسی اور انتظامی خدمات کے بعد یکم ستمبر 2020 کو ریٹائر ہو رہے ہیں۔ انھوں نے یکم اکتوبر 1984 کو بطور لیکچرر (انگریزی) زمیندار کالج سے اپنے تدریسی سفر کا آغاز کیا اور اپنی تمام سروس اس عظیم درسگاہ میں بطور معلم کے گزاری۔ پرنسپل بننے کے بعد انتظامی مصروفیات کے باوجود بھی وہ ایم۔اے کی کلاسز کو پڑھا رہے ہیں۔ مذکورہ تمام حقائق کو مدِنظر رکھتے ہوئے مجلہ شاہین کی مجلسِ ادارت نے ان کی خدمات کو خراجِ تحسین پیش کرنے کے لیے "شاہین" کے موجودہ شمارے (20–2019) کو ان کے نام منسوب کیا ہے۔ ہماری دعا ہے کہ زندگی کے ہر قدم پر کامیابی ان کے ساتھ رہے۔ آمین۔

مجلہ شاہین کے اس تازہ شمارے کے حوالے سے یہاں اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ اس شمارے میں تحریری نگارشات کا تقریباً ہر رنگ موجود ہے۔ پہلے کی طرح اس بار بھی کالج کے طلبہ اور اساتذہ کے علاوہ معروف لکھاریوں کی تحریریں مجلّے کی زینت ہیں۔ مزید برآں اس شمارے میں ایک مختصر گوشہ، سابق صدرِ شعبہ اردو (انچارج مدیر مجلہ شاہین) جناب پرفیسر طارق محمود طارق (مرحوم) کی علمی و ادبی خدمات کو خراجِ تحسین پیش کرنے کے لیے مختص کیا گیا ہے۔

آخر میں بس اتنا کہنا ہے کہ شاہین کی سابق روایات کو مدِنظر رکھتے ہوئے، مجلّے کی موجودہ اشاعت کا بنیادی مقصد، یہی ہے کہ طلبہ کی تحریری کاوشوں کو زیادہ سے زیادہ سراہا جائے۔ کیونکہ یہ اُن کی پہلی اڑان ہے۔ یقیناً اگر ہم آج ان کی حوصلہ افزائی کریں گے تو کل وہ اپنی اڑان سے تخلیقی فضاؤں کو تسخیر کریں گے۔ شکریہ۔

سید وقار افضل
اسسٹنٹ پروفیسر
شعبۂ اردو

نقد و نظر
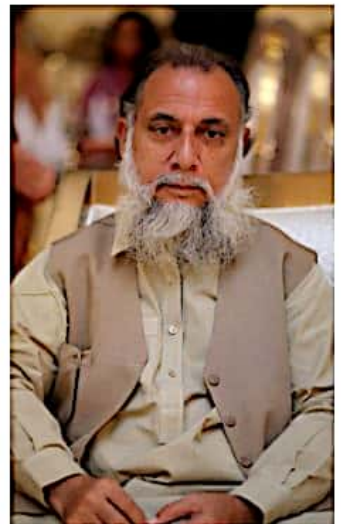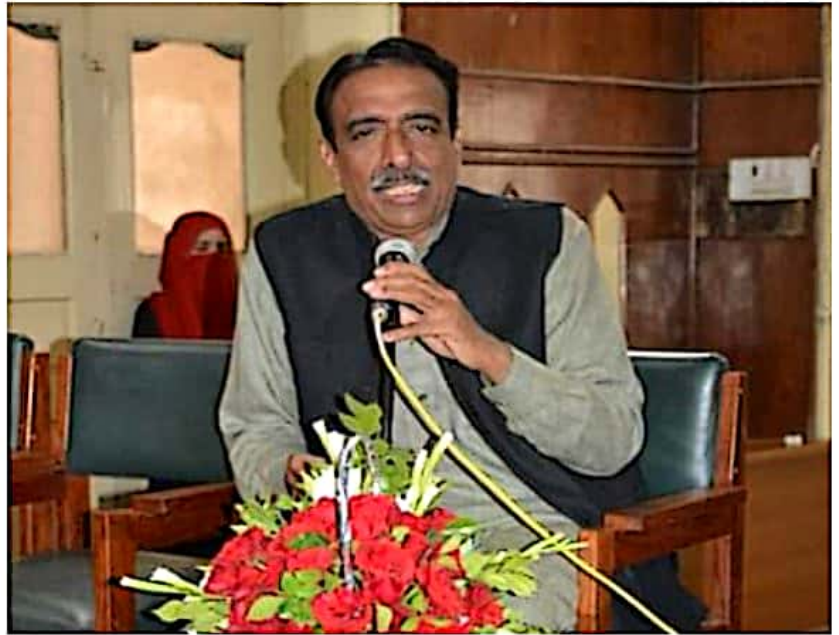
مقدمہ سفرِ جمال*

میاں انعام الرحمٰن

اسسٹنٹ پروفیسر: شعبہء سیاسیات

گورنمنٹ پوسٹ گریجویٹ اسلامیہ کالج گوجرانوالہ

جہاں سوال اٹھانا احساسِ گناہ میں مبتلا کردے وہاں مذہب استحصالی آلہ بن جاتا ہے

ہمیں کہا گیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اتباع کریں۔سوال یہ ہے کیا نبی کی اتباع ممکن ہے؟ نبی تو خدا کا چنیدہ بشر ہوتا ہے۔خدا کے چنیدہ ہونے کی وجہ سے نبی ہماری طرح بشرِ محض نہیں رہتا، فوق البشر ہوجاتا ہے نوری ہوجاتا ہے۔ہم بشرِ محض، فوق البشر کے نقشِ قدم پر کیسے چل سکتے ہیں؟ جواب یہ ہے بشرِ محض ہونے کے باوجود ہمارے لیے نبی کی پیروی اس لیے ممکن ہے کہ خود نبی کی شخصیت کی بشری جہت نے فوق البشر نوری جہت کی اطاعت کی ہوتی ہے:

لَا شَرِيْكَ لَهٗ ۚ وَبِذٰلِكَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ (الانعام ۶: ۱۶۳)

''کوئی نہیں اس کا شریک، اور یہی مجھ کو حکم ہوا اور میں سب سے پہلے مسلم ہوں''

مسند احمد کی روایت (رقم ۲۴۸۲۳:) کے مطابق حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے بھی مروی ہے کہ:

''رسول اللہ ﷺ لوگوں کو کسی ایسے کام کا حکم دیتے جس کی وہ طاقت رکھتے ہوں اور وہ کہتے کہ ہم آپ ﷺ کی طرح نہیں ہیں اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کے اگلے پچھلے سارے گناہ معاف فرما دیے ہیں تو نبی ﷺ ناراض ہوجاتے حتیٰ کہ اس ناراضی کے آثار چہرہ مبارک پر نظر آنے لگتے، پھر آپ ﷺ فرماتے کہ میں اللہ تعالیٰ کے متعلق سب سے زیادہ جانتا ہوں اور تم سب سے زیادہ ڈرتا ہوں''

اس لیے خیر البشر ﷺ اس اعتبار سے قابلِ تقلید کامل نمونہ ہیں کہ ہم عام انسانوں نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اس بشری جہت کی اطاعت کرنی ہے جو نبوت کے آگے مکمل سرنگوں ہوچکی ہے۔(صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)

-----۲-----

قرآن مجید کے مطابق یہ ایسا کلام ہے پہاڑ پر نازل ہوتا تو وہ ریزہ ریزہ ہوجاتا:

لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰى جَبَلٍ لَّرَاَيْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ ؕ وَتِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ (الحشر ۵۹: ۲۱)

''اگر ہم اتارتے یہ قرآن ایک پہاڑ پر تو تو دیکھ لیتا کہ وہ دب جاتا پھٹ جاتا اللہ کے ڈر سے اور یہ مثالیں ہم سناتے ہیں لوگوں کو تاکہ وہ غور کریں''

اللہ رب العزت کے اس کلام کو سہارنے کی سعادت خاتم الانبیا ﷺ کے حصے میں آئی۔اس سے جہاں تمام تر مخلوقات پر آپ ﷺ کی فوقیت و افضلیت کی شہادت ملتی ہے وہاں آپ ﷺ کے ظرف کا بھی کچھ اندازہ ہوتا ہے کہ کتنا وسیع ظرف ہے جو اللہ کے اس کلام کو

اپنی تمام تر معنویت سمیت سہار گیا اپنی شخصیت میں رچا بسا گیا۔ یوں سمجھیے جیسے ہم سورج کو نہیں دیکھ سکتے کہ آنکھیں چندھیا جاتی ہیں لیکن اسی سورج کی روشنی کو چاند میں منعکس ہوتے آسانی سے دیکھ لیتے ہیں اور خوب محظوظ ہوتے ہیں، اسی طرح قرآن مجید کی چندھیا دینے والی رفعت و عظمت جب محمد رسول اللہ ﷺ کے توسط سے ہم تک پہنچی تو چاند کے مانند دیکھے جانے اور محظوظ کیے جانے کی صورت میں ڈھل چکی تھی۔ اللہ رب العزت نے شاید اسی لیے اپنے محبوب کو ''سراجا منیرا'' کی نہایت بلیغ تشبیہ سے متصف کیا ہے۔ ایسا روشن چراغ جو رفعت وعظمت کے اعتبار سے پورے آسمانِ نبوت کو اتنا روشن ومنور کیے ہوئے ہے کہ باقی سب ستارے ماند پڑ گئے، لیکن ساتھ ہی اس تک رسائی اتنی سہل کہ نوع انسانی کا ہر بشر فیض اٹھا سکتا ہے۔ دیکھا جائے تو نبی خاتم ﷺ کی ذاتِ گرامی بزمِ کائنات میں خدا کی تخلیق کا نقطہ کمال ہے ایسا بشر کہ تمام انبیا پر سبقت لے گیا اور ایسا نور کہ جس کی پیروی عام سے بشر کے لیے بھی مشکل نہ رہی۔ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)

-----۳-----

ہمارے ہاں الطاف حسین حالی مرحوم کے کہے ''اتر کر حرا سے سوئے قوم آیا'' کو کچھ ایسا رومانوی روپ دے دیا گیا جس سے مجموعی طور پر اسلام اور پیغمبر اسلام کے حقیقی مزاج سے مغایرت و بے گانگی (alienation) کے رویے نے خوب فروغ پایا۔ حالاں کہ کسی انسان کی خو بو اور مزاج کا صحیح پتا اس وقت چلتا ہے جب وہ متاہل زندگی (married life) بسر کرے یا اس کے ساتھ سفر کیا جائے یا مال و دولت کا کوئی معاشی معاملہ طے کیا جائے۔ معاملہ طے کرنے کے دوران میں اور طے پا جانے کے بعد اس کا رویہ اس کے حقیقی مزاج کی خبر کرتا ہے۔ چوں کہ نبی خاتم ﷺ صرف نور نہیں بلکہ بشر بھی ہیں اور بشر کی ارضی زندگی میں ازدواجی و معاشی سرگرمی بنیادی اہمیت رکھتی ہے، اس لیے اس ازدواجی و معاشی سرگرمی کی بنیادی اہمیت کو اجاگر کرنے اور انہی سے پھوٹتے بشری رویے کو تدین کا معیار بنانے کی خاطر اللہ رب العزت نے نبی خاتم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خالصاً بشری حیثیت میں معاشی انصاف پر مبنی معاہدے (حلف الفضول)، تجارت وسفرِ تجارت اور شادی جیسے مراحل سے گزارا۔ ذرا غور کیجیے کہ تجارت وسفر تجارت اور متاہلانہ زندگی (بشمول بیٹیوں کا باپ ہونے اور ان کی شادیاں تک کر دینے) کی جاں گسل راہ سے گزار کر انسانی معاشرے کو ایک ''بشری معیار'' دینے کے بعد محمد ﷺ کو ختم نبوت کے منصب پر فائز فرمایا گیا۔

سیرت کے باب میں یہ مراحل، نبوت کے باقاعدہ عطا کیے جانے سے قبل کے ہیں۔ تاریخی اعتبار سے ان کی حیثیت انسانی — سماجی نوعیت کی ہے۔ پوری انسانی تاریخ میں انسان اور سماج کے ہمیشہ دو بڑے مسائل رہے ہیں؛ ازدواجی رشتہ اور معاشی رشتہ۔ کتنی لطیف بات ہے کہ رہبر عالم ﷺ نے انسانی اور سماجی دونوں اعتبارات سے دونوں رشتے مثالی انداز میں نبھائے ہیں۔ سیرت نگاری میں نبی خاتم ﷺ کی حیاتِ طیبہ کے اسی نوع کے پہلو (بات کو غلط انداز میں نہ لیا جائے) سیکولر منہج سے بیان کرنے چاہییں تا کہ کثیر مذہبی دنیا کے عام بشر کو راہنمائی مل سکے کہ وہ کیسے اور کیوں کر ازدواجی و معاشی رشتوں سے انصاف کر سکتا ہے۔

-----۴-----

واقعہ یہ ہے کہ دنیا میں جہاں کہیں انسان بستے ہیں وہاں درحقیقت مرد اور عورت بستے ہیں۔ مرد اور عورت کا ازدواجی تعلق اور اس تعلق کی نوعیت انسانی معاشرت کے دیگر رشتوں کا تعین کرتے ہیں۔ انسانی معاشرت کی بلندی و پستی کا سراغ مرد اور عورت کے ازدواجی تعلق سے لگایا جا سکتا ہے۔ نبی خاتم ﷺ نے کس نوعیت کے رشتوں اور قدروں پر مبنی انسانی معاشرے کی بنیاد رکھی، یہ دیکھنے جانچنے کے لیے نبی

کریم ﷺ کی متاہل زندگی کا مطالعہ کلیدی اہمیت رکھتا ہے۔ اس حوالے سے سید المرسلین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے (باقاعدہ) دورِ نبوت کے دورانیے کا (ظاہری) آغاز و اختتام، عالمِ انسانیت کے لیے انتہائی قابلِ غور ہے۔ پہلی وحی کے بعد آپ ﷺ گھر تشریف لائے تو آپ ﷺ کی رفیقہ حیات ام المومنین سیدہ خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا نے آپ ﷺ کے فرمان زملونی زملونی کے مطابق آپ ﷺ کو چادر اوڑھا دی۔ جب نبی رحمت ﷺ کے وصال کا وقت قریب آیا تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا اللھم فی الرفیق الاعلی، آپ ﷺ کا سر مبارک ام المومنین سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی گود میں تھا۔ سیرت کے باب میں نبی خاتم ﷺ کی حیاتِ مطہرہ کا یہ پہلو، مرد کی زندگی میں عورت کی بطور رفیقہ حیات اور پھر رفیقہ حیات کے بہت بلند سٹیٹس پر دلالت کرتا ہے۔ مسند احمد کی روایت (رقم ۲۴۵۳۵) کے مطابق حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے:

> ''رسول اللہ ﷺ نے اپنے کسی خادم یا کسی بیوی کو کبھی نہیں مارا اور اپنے ہاتھ سے کسی پر ضرب نہیں لگائی سوائے یہ کہ اللہ کی راہ میں جہاد کر رہے ہوں''

اس لیے سیرت نگاری کے باب میں، آثار و تاریخ میں خاص طور پر عورت کے سٹیٹس کے حوالے سے کی گئی ایسی ملمع کاری سے چوکنا رہنا چاہیے جس کا نبی رحمت ﷺ کے اسوہ سے دُور کا بھی کوئی تعلق واسطہ نہیں۔

-----۵-----

واقعہ یہ ہے کہ امت مسلمہ کی بے عملی کی وجہ سے نبی کریم ﷺ کی سنت، تعاملِ امت کی صورت میں باقی نہیں رہی۔ اس لیے فی زمانہ تعاملِ امت کی اصابت قابلِ لحاظ نہیں رہی۔ اب قرآن وحدیث اور آثار و تاریخ کے ذریعے سنت کو تلاشا جاتا ہے۔ سیرت نگاری ایک پہلو سے اس تلاش کا نتیجہ ہے اور دوسرے پہلو سے خود ایک ذریعہ بھی ہے۔ یہ دونوں پہلو ایک بنیادی تقاضا کرتے ہیں کہ سیرت نگاری کو ''فن'' کے اظہار کا ذریعہ ہرگز نہیں بنانا چاہیے، مثلاً بغیر نقطوں کے سیرت کی کتاب۔ سیرت نگاری کے باب میں فن کو مخدوم نہیں، خادم ہونا چاہیے۔ ورنہ فن کے مخدوم ہونے کی صورت میں سیرت کے پیغام کی روح اور اس سے چھلکتی تاثیر، ہم سے غیر محسوس انداز میں چھنتی چلی جائے گی۔ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)

-----۶-----

قرآن وحدیث اور آثار و تاریخ پر مبنی سیرت نگاری بنیادی طور پر علمی بیانیہ ہے۔ علم کا جوہر، حسنِ نیت اور حسنِ عمل ہے اس لیے علم وہی ہے جو انسان پر طاری ہو جائے۔ اس کا ایک مطلب یہ ہوا، حسنِ نیت اور حسنِ عمل سے مزین ہو کر ایسی سیرت نگاری کرنی چاہیے جس کے تاثیری جلوے صاحبِ قلم اور اس کے مخاطبین کو اپنے حصار میں لے سکیں۔ حسنِ نیت و حسنِ عمل پر مبنی سیرت کا کوئی شاہکار جب کسی کی نظر سے گزرتا ہے تو اس کا دل بے اختیار اس شاہکار کی تصدیق کرتا ہے:

مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰى (النجم ۵۳: ۱۱)

''دل نے اس کی تکذیب نہیں کی جو آنکھوں نے دیکھا''

اس ضمن میں خدا سے انسان کے تعلق کے تنزیہی اور تشبیہی پہلوؤں کو مسلسل نظر میں رکھنے سے، سیرت کے باب میں ایسا متوازن

مرقع سامنے آسکتا ہے جس میں ایک طرف نبی پاک ﷺ کی تنزیہی تعظیم کا پورا پورا اہتمام ہو اور دوسری طرف تشبیہی پہلو کی وساطت سے امت کا آپ ﷺ کے ساتھ زندہ وجاوید تعلق بھی قائم رہے۔ اس کا دوسرا مطلب یہ ہے کہ انسان سے قطعی غیر متعلق، مجرد علمی مباحث کا سیرت نگاری سے کوئی تعلق نہیں۔ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)

-----۷-----

سیرت نگاری میں یہ بات پیشِ نظر رہنی چاہیے کہ اسوہ حسنہ، محمد مصطفی احمد مجتبیٰ ﷺ کی سوانح عمری نہیں۔ اس لیے زمانی ترتیب کا لحاظ اس کا بنیادی مطالبہ بھی نہیں۔ زمانی ترتیب ناگزیر اور لازمی قرار پاتی اگر قرآن مجید نزولی ترتیب سے ہم تک پہنچتا۔ قرآن مجید کی نزولی ترتیب نبی پاک ﷺ کی حیاتِ مطہرہ کی زمانی ترتیب سے ہم آہنگ ہے۔ جب قرآن مجید کی نزولی ترتیب کو اٹھا لیا گیا اسے باقی نہیں رکھا گیا اور اسی وجہ سے قرآن مجید اپنے نزول کے مخصوص دور سے ماورا ہو کر آفاقی اور قیامت تک کے لیے ہدایت کا آخری سرچشمہ قرار پایا، تو پھر نبی خاتم ﷺ کے اسوہ کو زمانی ترتیب سے منسوب کر کے ایک مخصوص دور کے لیے محدود کیوں کیا جائے؟

قرآن مجید میں انبیا علیہم السلام کے قصے بھی زمانی ترتیب سے بیان نہیں کیے گئے۔ اہم بات یہ ہے کہ بیشتر انبیا علیہم السلام کا تذکرہ تک قرآن مجید نے نہیں کیا:

وَرُسُلًا قَدْ قَصَصْنٰهُمْ عَلَيْكَ مِنْ قَبْلُ وَرُسُلًا لَّمْ نَقْصُصْهُمْ عَلَيْكَ ۚ وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا (النساء ۴:۱۶۴)

''اور بھیجے ایسے رسول جن کے قصے سنائے ہم نے آپ کو اس سے پہلے، اور ایسے رسول جن کے قصے نہیں سنائے آپ کو''

جن انبیا کرام کا ذکر اللہ تعالیٰ نے نہیں کیا، غالباً اسی وجہ سے نہیں کیا کہ ان کے زمانی ترتیب کے حامل قصے صرف اپنے دور تک کے لیے تھے۔ لہٰذا قصص الانبیا کے بیان میں خدا نے جو اسلوب اور منہج اختیار کیا، سیرت نگاری میں اس سے بھرپور استدلال کرنا چاہیے کہ سیرتِ طیبہ ﷺ کا بیان ایک اعتبار سے قصے کا بیان بھی ہے لیکن فرق یہ ہے کہ اس کا رائٹر انسان ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ (قرآن میں مذکور) ہر نبی کا قصہ ایک اعتبار سے اس کی سیرت کا بیان ہے اور کسی کی بھی سیرت کو مکمل اور زمانی ترتیب سے پیش نہیں کیا گیا بلکہ ہر ایک کی سیرت میں سے ایسا 'انتخاب' کیا گیا ہے جو ابدی ہونے کے باعث تا قیامت انسانوں کی راہنمائی کر سکتا ہے۔ ایک لحاظ سے یہ انتخاب 'رسالت مآب ﷺ کی خاتمیت پر سابقہ انبیا کی تاریخی مہر' ثبت کرنے کی علامت بھی ہے۔

قرآن مجید کی نزولی ترتیب کے بدل دیے جانے سے قرآن مجید بھی (سابقہ آسمانی صحائف کے منتخب کلام کے مانند) قیامت تک کے لیے منتخب کلام کی حیثیت اختیار کر جاتا ہے۔ ایک اعتبار سے یہ زمانی ترتیب کے حامل (قرآنی) کلام میں سے قیامت تک کے لیے باقی رہنے والے کلام کا انتخاب ہے جسے قرآن مجید کی حتمی ترتیب کی صورت میں باقی رکھا گیا ہے۔ اسی طرح صاحبِ قرآن کی حیاتِ مطہرہ کو بھی زمانی ترتیب سے منزہ کر کے قیامت تک کے انسانوں کے لیے اسوہ حسنہ قرار دیا گیا ہے۔ خاتم الانبیا ﷺ کی سیرت جب (قرآن کی حتمی ترتیب کے مانند) زمانی ترتیب سے منزہ ہوتی ہے تو اس کی حیثیت سابقہ انبیاؑ کی سیرتوں میں سے اس 'ربانی انتخاب' کے مانند ہو جاتی ہے جنھیں خدا نے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے قرآن مجید میں سمو دیا ہے۔

قرآن مجید نے بخوبی آگاہ کیا ہے کہ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اسوہ کو قصے کے طور پر بیان کیا جائے تو اس قصے کا مطاف یا غرض و غایت کیا ہونی چاہیے:

فَاقْصُصِ الْقَصَصَ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ (الاعراف۷:۱۷۶)

''پس قصے بیان کر، تا کہ وہ فکر کریں''

اس کا مطلب یہ ہوا، اللہ رب العزت نے انبیا کرام کے قصے بعینہ لینے کے بجائے، اپنی تخلیقی فعلیت کے ذریعے قرآن مجید کے پورے بیانیے سے ایسے مربوط کر کے پیش کیے ہیں کہ نوع انسانی کے غور و فکر کی ایک سبیل نکل آئے۔ سیرت نگاری میں بھی اسوہ نبی خاتم ﷺ قصے کے طور پر بیان کرتے وقت، تخلیقی فعلیت کا بھر پور اظہار کرتے ہوئے، اسے سیرت طیبہ کے پورے بیانیے سے مربوط کر کے پیش کرنا چاہیے تا کہ نوع انسانی کے غور و فکر کی راہ کشادہ تر ہو جائے۔ خیال رہے غور و فکر کی یہ راہ کوئی معلق راہ نہیں، قرآن مجید نے اس کی بابت بھی صراحت کر رکھی ہے:

قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ ۚ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ ۭ وَسُبْحٰنَ اللّٰهِ وَمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ (یوسف۱۲:۱۰۸)

''(اے نبی) تم کہہ دو میری راہ تو یہی ہے۔ میں اور میری اتباع کرنے والے اپنی بصیرت کی بنا پر اللہ کی طرف بلاتے ہیں اور اللہ پاک ہے اور میں شرک کرنے والوں میں سے نہیں ہوں''

تو معلوم ہوا (عَلٰى بَصِيْرَةٍ) تخلیقی فعلیت اور (اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ) راہِ فکر کی سمت کا تعین ہے۔

-----۸-----

سیرت کی کسی ایک جہت پر قلم اٹھانے والے سیرت نگار کو اسوہ حسنہ کی ''کلیت'' دھیان میں رکھنی چاہیے۔ ایسا نہ کرنے کی صورت میں وہ اس طبّی ماہر جیسا ہوگا جو پورے جسم کا لحاظ رکھے بغیر صرف متعلقہ عضو کی دیکھ بھال کرنے کی کوشش کرے۔ اس کے نتیجے میں دیگر اعضا تو متاثر ہوتے ہی ہیں، متعلقہ عضو بھی آخر کار مزید بگاڑ کا شکار ہو جاتا ہے۔ سیرت کے باب میں خواہ مخواہ کے اعتراضات اٹھانے والے مستشرقین و مستغربین اور دیگر افراد اسی نوع کے 'ماہر' ہیں کہ اسوہ حسنہ کی کلیت ان کی نظروں میں سما نہیں پاتی۔ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)

-----۹-----

سیرت نگاری کا مواد 'نقلی' اور اس مواد کو برت کر سیرت نگاری میں ڈھالنا 'عقلی' کام ہے۔ نقلی ہونے کی وجہ سے مواد پر عام طور پر اعتراض نہیں ہوتا۔ یہ سیرت نگاری میں مواد کو برتنے کی تکنیک ہے جو بعض اوقات ہدفِ تنقید ٹھہرتی ہے۔ سیرت نگاری کی تکنیک مواد کی مطابقت میں نہ ہوگی تو اخلاص کے باوجود معترضین کو انگلی اٹھانے کا موقع دے گی۔ تکنیک میں اسلوب اور اپروچ کی بنیادی اہمیت ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ سیرت نگاری میں اسلوب اور اپروچ لازماً مواد کی مطابقت و موافقت میں ہونے چاہییں۔

قرآن مجید میں ارشاد ربانی ہے:

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ ۚ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ

(آل عمران ۳: ۱۵۹)

''پس اللہ کی رحمت سے ان کے لیے نرم دل ہیں، اگر آپ تند خوسخت دل ہوتے تو وہ آپ کے پاس سے ضرور منتشر ہو جاتے''

لہذا سیرت نگاری میں اسلوبِ نگارش نرم اور شُستہ ہونا چاہیے اور اپروچ میں بھی سیرتِ مطہرہ کی نرم و لچک دار تصویر پیش کرنی چاہیے تاکہ نوع انسانی اسوہ حسنہ کی جانب کھنچی چلی آئے۔ اب کسی بھی سیرت نگار کو یہ تو معلوم ہے کہ نبی خاتم ﷺ رحمۃ للعالمین ہیں لیکن جب وہ اسلوب و اپروچ میں رحمت کی للعالمین جہت سے انصاف نہیں کر پاتا تو (کسی نہ کسی درجے میں) اپنے علم پر گمراہ ہو جاتا ہے اور اس کی تکنیک مواد کی مطابقت میں ہونے کے بجائے اِدھر اُدھر بھٹک جاتی ہے :

اَفَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ وَاَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰى عِلْمٍ وَّخَتَمَ عَلٰى سَمْعِهٖ وَقَلْبِهٖ وَجَعَلَ عَلٰى بَصَرِهٖ غِشٰوَةً ؕ فَمَنْ يَّهْدِيْهِ مِنْۢ بَعْدِ اللّٰهِ ؕ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ (الجاثیۃ ۴۵: ۲۳)

''کیا تو نے دیکھا ہے کہ جو شخص اپنی خواہش کو اپنا معبود بنا لیتا ہے اور اللہ اسے علم پر گم راہ کرتا ہے اور اس کی سماعت اور اس کے قلب پر مہر لگا دیتا ہے اور اس کی آنکھ پر پردہ ڈال دیتا ہے پس اللہ کے بعد کون اسے ہدایت دے سکتا ہے تو کیا تم پھر بھی نصیحت حاصل نہیں کرتے''

خیال رہے یہ مواد نہیں بلکہ بنیادی طور پر مواد کو برتنے کی تکنیک ہے جس کی وجہ سے وہ اپنے علم (بشمول مواد) پر گمراہ ہو جاتا ہے۔ اس سلسلے میں قرآن مجید کا کہنا ہے کہ:

وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ؕ اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْـُٔوْلًا (بنی اسرائیل ۱۷: ۳۶)

''اس چیز کے پیچھے نہ چل جس کا تجھے علم نہیں۔ بے شک سامعہ اور باصرہ اور قلب سب کے سب اپنی اپنی جگہ جواب دہ ہیں''

سوال یہ ہے تکنیک کو مواد کی موافقت میں کیسے لایا جا سکتا ہے؟ اسلوب اور اپروچ کی تہذیب کیوں کر ہو سکتی ہے؟ اس بارے میں ارشادِ ربانی ہے :

اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِى الْاَرْضِ فَتَكُوْنَ لَهُمْ قُلُوْبٌ يَّعْقِلُوْنَ بِهَآ اَوْ اٰذَانٌ يَّسْمَعُوْنَ بِهَا ۚ فَاِنَّهَا لَا تَعْمَى الْاَبْصَارُ وَلٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِىْ فِى الصُّدُوْرِ (الحج ۲۲: ۴۶)

''کیا انھوں نے اس زمین میں سیر نہیں کی کہ ان کے لیے قلوب ایسے ہو جاتے کہ ان کے ساتھ سمجھتے یا کان ایسے ہو جاتے ان کے ساتھ سنتے۔ یقیناً یہ بات نہیں کہ ان کی آنکھیں اندھی ہیں بلکہ ان کے سینوں میں جو قلوب ہیں وہ اندھے ہیں''

قرآن کے مطابق مواد (نقل) کو عقلی طور پر برتنے کا کام قلب سلیم کرے تو تکنیک، مواد کے عین موافق و مطابق ہو جائے گی۔ لطیفے بات یہ ہے کہ اس قلب کو سلامتی یا بصیرت سیر افلاک سے نہیں 'سیر فی الارض' کے ذریعے ہی مل جائے گی۔ یہ سیر فی الارض ہے جس کے توسط سے زندگی کی واقعیت اور اس کو تشکیل دینے والے عناصر کا پتا چلتا ہے۔ مختلف نسلوں زبانوں تہذیبوں رنگوں اور ثقافتوں سے پالا پڑتا ہے جس کے نتیجے میں انسان اپنے ماحول کے جبر سے اٹھ کر معروضی انداز میں حقائق کو جانچنے پرکھنے کی پوزیشن میں آ جاتا ہے۔ سیر فی الارض سے مراد تاریخ کا غیر جانب دار وسیع متنوع مطالعہ بھی ہے اور سیر فی الارض کا منشا خیانت و تعصب کی تکذیب بھی ہے۔ لہذا سیرت نگاری میں

سیرتِ طیبہ بالعموم اور اس کی رحمۃ للعالمین جہت سے بالخصوص، قلبی بصیرت (مبنی بر سیر فی الارض) کے بغیر انصاف نہیں کیا جاسکتا۔

ارشادِ ربانی ہے:

وَمِنْ اٰيٰتِهٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافُ اَلْسِنَتِكُمْ وَاَلْوَانِكُمْ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّلْعٰلِمِيْنَ (الروم ۳۰::۲۲)

"اور آسمانوں اور زمین کی تخلیق اور تمہاری زبانوں اور رنگوں کا اختلاف اس کی آیات میں سے ہیں بے شک اس میں ضرور تمام عالمین کے لیے آیات ہیں"

اس کا مطلب یہ ہوا سیرت نگار کسی بھی زبان اور نسل سے ہو اس کی رنگت کیسی بھی ہو ثقافت جیسی بھی ہو، اس کی تکنیک قلبی بصیرت پر مبنی ہوگی تو اس کا مرقع سیرت، نبی کی رحمت کے بیان میں عالمین کے لیے بوقلمونی آیت بن جائے گا۔ سیرت نگاری کے ضمن میں نبی کی رحمت کے للعالمین پہلو کو سورت توبہ کی اس آیت سے ملا کر دیکھیے :

لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ (التوبۃ ۹:۱۲۸)

"بلاشبہ تم میں ایک رسول آیا ہے جو تم میں سے ہے تمھیں جو تکلیف پہنچے وہ اس کے لیے نہایت گراں ہے تمہاری بھلائی پر وہ حریص ہے مومنوں کے لیے رووف ورحیم ہے"

غور کیجیے کہ 'مومنوں کے لیے رووف ورحیم ہے' سے قبل کا بیان تمام عالمِ انسانیت کے لیے ہے تمام زمانوں کے لیے تمام مقاموں کے لیے۔ خاتم المرسلین ﷺ کا نوعِ انسانی میں سے ہونا، نوعِ انسانی کا تکالیف میں ہونا آپ ﷺ پر شاق گزرنا اور نوعِ انسانی کی بھلائی و ہدایت کے واسطے آپ ﷺ کا حریص ہونا، یہی آپ ﷺ کی رحمت عامہ کی وہ للعالمین جہت ہے جس کا اظہار سیرت نگاری کے وہ نمونے ہیں جن کے خالق غیر مسلم ہیں۔ اس لیے مسلم تخلیق کاروں کی ذمہ داری بہت بڑھ جاتی ہے کہ وہ سیرت نگاری میں مواد سے موافق تاثر لانے کے لیے ایسی تکنیک کا استعمال کریں جو سیرتِ مطہرہ کی تمام جہات پوری معنویت کے ساتھ نوعِ انسانی کے سامنے کھول کر رکھ دے۔

(صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)

-----۱۰-----

سیرت کے ہر قاری کو خاص طور سیرت نگاری میں دلچسپی رکھنے والے قاری کو پوری ہوش مندی اور تنقیدی نظر سے مطالعہ سیرت کرنا چاہیے کیوں کہ سیرت سے متعلق مواد کے چناو اور پھر اس کی پیش کش میں راوی مولف مصنف مرتب ہر کسی کا اپنا اپنا مزاج رجحان اور ذوق لازماً اثر انداز ہوتا ہے۔ اس لیے سیرت نگار میں کم از کم اتنی صلاحیت ضرور موجود ہونی چاہیے کہ وہ کسی بھی کتاب سیرت کے مطالعہ کے دوران میں اخذ کرتے وقت، کتاب کے مصنف مولف یا مرتب کی افتادِ طبع اور ذوق ورجحان کو ہر لحہ دھیان میں رکھ پائے۔

چوں کہ محمد مصطفی احمد مجتبیٰ ﷺ، نبی آخر الزمان ہیں نبی خاتم ﷺ ہیں، اس لیے آپ ﷺ کی سیرتِ طیبہ کا بیان محض مسلمانوں کا داخلی معاملہ نہیں، کہ آپ ﷺ تو نوعِ انسانی کے ہر فرد بشر کے لیے مشعلِ راہ ہیں۔ اس لیے سیرت نگاری صرف مسلم مخاطبین کو پیش نظر رکھ کر

نہیں کرنی چاہیے۔ یہ صرف اور صرف مسلم مخاطبین کو پیشِ نظر رکھ کر کی گئی سیرت نگاری ہے جو نہ صرف زندگی کی واقعیت سے دور جا پڑتی ہے بلکہ مطالعہ سیرت کے غیر مسلم قاری کو شش و پنج میں مبتلا کر دیتی ہے۔ اسی اپروچ کا نتیجہ ہے کہ مطالعہ سیرت کا روایتی بیانیہ، آپ ﷺ کے رحمۃ للعالمین اور خاتم النبیین ہونے سے لگا نہیں کھاتا۔ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)

-----۱۱-----

جیسے کوئی معاندانہ لکھی ہوئی کتاب کہ خالص مخالفانہ ذہن اور دلی کدورت سے لکھی جاتی ہے، کوئی وزن یا اہمیت نہیں رکھتی، اسی طرح عشقِ نبی ﷺ پر مبنی سیرت نگاری ایمان کی پختگی اور عقیدت کے اظہار کے باوجود سیرت نگاری کے اصولوں سے انحراف کی علامت ہے۔ عشق ایسی کیفیت کا نام ہے جس کا انتقال الفاظ میں ممکن نہیں۔ اس لیے بسا اوقات عشق کے اظہار کے ایسے اسالیب اختیار کر لیے جاتے ہیں، جن کا دفاع بعد میں الفاظ کے ذریعے ممکن نہیں ہوتا۔ بہتر تو یہ ہے کہ عشقِ نبی ﷺ میں سرشار سیرت نگار نعت کہے۔

(صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)

-----۱۲----

سیرت کے باب میں ناگزیر ضمنی پہلوؤں کے بیان میں بہت احتیاط اور توازن سے کام لینا چاہیے۔ ایسے پہلوؤں کے بیان کے دوران میں سیرت سے وابستہ ان بنیادی خصوصیات وصفات کے اظہار و ابلاغ کی پوری ذمہ داری اٹھانی چاہیے جو پوری انسانی تاریخ میں محمد مصطفی احمد مجتبیٰ ﷺ کے منفرد پیغام کی منفرد پہچان ہیں۔ وہ خصوصیات تین ہیں:

۱۔ ابراہیمی اساس

۲۔ خاتمیت

۳۔ دعوت و جہاد

جزئیات نگاری کے دوران میں یہ تین خصوصیات بین السطور موجود رہیں تو پھر بھی پیغامِ محمد ﷺ کی اصالت باقی رہے گی۔

-----۱۳-----

سیرت نگاری اس جج کے مانند نہیں کرنی چاہیے، جو سچ کی واقعیت سے پوری طرح آگاہ ہونے کے باوجود انصاف پر مبنی فیصلہ محض اس لیے نہیں کر پاتا کہ اسے لازمی طور پر موجود قوانین اور شہادتوں کے دائرے میں رہنا پڑتا ہے۔ سیرت نگار کو آثار و تاریخ اور روایات کے علاوہ ایسی قرآنی تفسیرات و تعبیرات سے بھی باہر جھانکنے کی جرات کرنی چاہیے جو اسوہ حسنہ ﷺ کے باب میں واقعیت پر مبنی کسی سچائی کی راہ میں مزاحم ہوں۔ زمانے کی تحرک انگیز قوت، تکوینی سطح پر علم و ہنر کے گلستان میں جو نت نئے پھول کھلاتی ہے سیرت نگار کو ان کی خوشبو سے محظوظ ہوتے رہنا چاہیے۔ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)

-----۱۴-----

سیرت نگار کو یاد رکھنا چاہیے کہ سیرت طیبہ ﷺ کلمہ طیبہ ہے۔ کلمہ طیبہ کا جوہر کیا ہے؟ اللہ رب العزت نے اسے ایک مثال کے ذریعے سمجھایا ہے:

اَلَمْ تَرَ كَيْفَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ()تُؤْتِيْٓ اُكُلَهَا كُلَّ حِيْنٍۢ بِاِذْنِ رَبِّهَا ؕ وَيَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ(ابراھیم ۱۴: ۲۵،۲۴)

''کیا تم نے غور نہیں کیا کہ اللہ نے پاکیزہ بات کی مثال کس طرح بیان کی ہے جو ایک پاکیزہ درخت کے مانند ہے۔اس کی جڑ مضبوط ہے اس کی شاخیں آسمان تک پھیلی ہوئی ہیں وہ اپنے رب کے حکم سے ہر وقت پھل دیتا ہے اور اللہ نوع انسانی کے لیے مثالیں بیان کرتا ہے تا کہ وہ یاد کریں''

اس آیت کے اختتامی الفاظ بھی قابلِ غور ہیں کیوں کہ(لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ)'تا کہ وہ یاد کریں' کا بہت گہرا پُرمعنی تعلق کلمہ طیبہ کی تذکیر سے ہے۔کلمہ طیبہ کے جوہری عناصر اُس کی جڑیں مضبوط شاخیں آسمان تک پھیلی ہوئیں اس کا ہر وقت پھل دینا اور پھر اسے یاد رکھا جانا' سیرتِ مطہرہ کے بیانیے میں رچے بسے ہونے چاہییں۔'اپنے رب کے حکم سے ہر وقت پھل دیتا ہے' کے بیان سے اشکال کا شکار نہیں ہونا چاہیے کہ جب سیرت نگار نے پہل کرتے ہوئے جڑیں مضبوط اور شاخیں آسمان تک پھیلا دیں تو تب بھی خدائی حکم کی اطاعت کی(ورفعنا لك ذكرك)اس کے بعد بھی خدائی مشیت اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے لازماً اس کے شاملِ حال رہے گی اور سیرت طیبہ کا کلمہ طیبہ سے مملو بیانیہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ثمر آور رہے گا :

جَمِيْعًا ۭ اِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ يَرْفَعُهٗ (فاطر ۳۵: ۱۰)

''اس(اللہ)کی طرف پاکیزہ باتیں(اَلْكَلِمُ الطَّيِّبُ)چڑھتی ہیں اور وہ عملِ صالح کو بلند کرتا ہے''

سیرت نگاری بطور'عمل صالح' بلند ہوتی ہی ہے۔۔۔۔۔۔سیرتِ مطہرہ میں مذکور کلماتِ طیبات کے صعود کا تعاقب کون سی آنکھ کرے؟ کہ اسوہ حسنہ کا بیان مقامِ محمود کا بیان ہے۔(صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)

-----۱۵-----

سیرت نگاری میں مخالفین ومعترضین کے اٹھائے گئے سوالات سے گھبرانا نہیں چاہیے۔قرآن مجید میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

الَّذِيْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا ۭ مَا تَرٰى فِيْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ ۭ فَارْجِعِ الْبَصَرَ ۙ هَلْ تَرٰى مِنْ فُطُوْرٍ()ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَيْنِ يَنْقَلِبْ اِلَيْكَ الْبَصَرُ خَاسِئًا وَّهُوَ حَسِيْرٌ (الملک ۶۷: ۳،۴)

''وہ اللہ ہے جس نے ساتوں آسمانوں کو متناسب وہم آہنگ پیدا کیا،تم الرحمن کی تخلیق میں کوئی تفاوت نہیں دیکھو گے چنانچہ نگاہ پلٹ کر پھیرو تم ان میں کوئی نقص نہیں دیکھو گے، پھر نظر کو جتنی بار چاہو پلٹ پلٹ کر ان کی طرف پھیرو، وہ نظر ذلیل وشرمندہ اور تھکی ماندی تمہاری طرف لوٹے گی''

اگر احسن الخالقین کا یہ چیلنج آسمانوں کی تخلیق کے متعلق ہے کہ جتنی بار چاہو پلٹ پلٹ کر دیکھو تمہاری نظر شرمندہ وتھکی ماندی تمہاری طرف لوٹے گی تو اس ہستی ﷺ کی جامعیت وکاملیت کس درجے کی ہوگی جو خاتمیت کی حامل ہے؟ واقعہ یہ ہے سیرت نگار اگر سہل انگار نہ ہو

اور دیانت کا دامن چھوٹنے نہ پائے تو سیرت طیبہ ﷺ پر کسی بھی نوعیت کے اٹھائے گئے سوالات کے جواب میں لازمی طور پر اس کے قلم سے ایسے کلماتِ طیبات وارد ہوں گے جن کے ذریعے نبی خاتم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شخصیت اور حیاتِ طیبہ کے کئی مستور گوشے، منور و تاباں ہو کر معاشرتِ انسانی کے لیے روشنی کا عظیم مینارہ ثابت ہوں گے۔ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)

-----۱۶-----

اخلاق عالیہ رحم دلی اور انسان دوستی وغیرہ کے نام پر سیرت نگاری میں معذرت خواہانہ اسلوب ہرگز اختیار نہیں کرنا چاہیے کہ زندگی کا جمالی پہلو ہی زندگی نہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ جلال و جمال ایک وحدت میں ڈھلتے ہیں یا کسی وحدت کے دو اجزا بنتے ہیں تو زندگی کی ایک توانا اور نظر نواز صورت جنم لیتی ہے۔ پوری انسانی تاریخ میں ایک بھی قوم ایسی نہیں گزری جس نے کبھی جنگ نہ کی ہو۔ یہ اس دنیاوی زندگی کی واقعیت ہے جس سے مفر ممکن نہیں۔ اس لیے اخلاق اور رحم بھی تلوار اٹھانے کا مطالبہ کرتے ہیں۔ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے اللہ کے رسول ﷺ کے اخلاق کے بارے میں استفسار کیا گیا تو ام المومنین رضی اللہ عنہا نے ارشاد فرمایا کیا تم قرآن نہیں پڑھتے؟ اللہ کے نبی ﷺ کا اخلاق قرآن ہی تو ہے۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے نبی کریم ﷺ صرف بشیر ہوتے نذیر نہ ہوتے تو کیا پھر بھی خلق عظیم سے متصف ہوتے؟ محمد مصطفی احمد مجتبیٰ ﷺ کے پیغام میں للکار نہ ہوتی تو آپ ﷺ کا اسوہ، کیا پھر بھی اسوہ حسنہ قرار پاتا؟ خدا کی قسم! اگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بدر و احد کے میدان میں تلوار اٹھائے نہ نکلتے تو اللہ رب العزت آپ ﷺ کو رحمۃ للعالمین قرار نہ دیتے۔

سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے ارشاد (اللہ کے نبی ﷺ کا اخلاق قرآن ہی تو ہے) کا ایک مطلب یہ بھی ہے کہ قرآن سیکھنا، درحقیقت اللہ کے نبی ﷺ کا اخلاق سیکھنا ہے۔ مسند احمد کی روایت (رقم ۲۴۸۷۸:) کے مطابق ام المومنین سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے ہی مروی ہے:

> ''ایک آدمی کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے اچھائی کے ساتھ تذکرہ ہوا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ کیا تم نے اسے دیکھا نہیں کہ وہ قرآن سیکھ رہا ہے''

چاہے نبی ﷺ کے اخلاق کے ذریعے قرآن مجید سمجھا جائے یا قرآن مجید سمجھ کر نبی ﷺ کے اخلاق تک پہنچا جائے، سیرت نگاری کے دوران میں بھی ہر دو صورتوں میں، خود ساختہ مجہول اخلاقیات کو در آنے کا موقع ہرگز نہیں دینا چاہیے۔ اس لیے یہ بہت ضروری اور ناگزیر امر ہے کہ نبی خاتم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات طیبہ کے جمالی اور جلالی پہلو، پہلو بہ پہلو بیان کیے جائیں کہ ان کی وحدت کا نام اسوہ حسنہ ہے ان کی وحدت کا نام خلق عظیم ہے اور ان کی وحدت کا نام ہی رحمۃ للعالمین ہے۔ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)

-----۱۷-----

حقیقت تو یہ ہے کہ سیرت کے بیانیے میں جمال و جلال کی 'دوئی' ہی محل نظر ہے۔ اوّل، جمالِ محض کا کہیں وجود نہیں۔ دوم، اگر ہے بھی تو زندگی کی انتہائی پست حقیر اور جامد اقدار کو جمال کا لبادہ اوڑھا کر دھوکہ دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ انجذاب و انفعال اور معذرت خواہی پر مبنی جمالِ محض، زندگی کو سڑانڈ اور تعفن کے سوا کچھ نہیں دے سکتا۔ یہ جلال کی آمیزش ہے جو جمال میں حیات بن کر دوڑتی ہے تب جمال اپنا آپ منکشف کرتا ہے۔ اس سلسلے میں طوالت سے بچنے کی خاطر قرآن مجید میں مذکور 'اسما الحسنیٰ' کی ترکیب پر ذرا گہری نظر ڈالیے: (أَيًّا مَّا تَدْعُوا فَلَهُ الْأَسْمَاءُ الْحُسْنَىٰ) ''جس نام سے پکارو، اس کے سب نام اچھے ہیں''۔ الحسنیٰ بدیہی طور پر فی نفسہ جمالی ہے قرآن مجید کی داخلی

شہادت اس کے جمالی ہونے کی مزید تصریح کرتی ہے:

قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ ؕ اَيًّامَّا تَدْعُوْا فَلَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى (الاسراء ۱۷ : ۱۱۰)

''کہہ دو کہ تم اللہ پکارو یا الرحمن، جس نام سے پکارو اس کے سب نام اچھے ہیں''

سورۃ الاسراء کی آیت میں 'الرحمن' کا محل دیکھے جانے کے قابل ہے۔ اس آیت میں بیان کی غرض سے اسما الحسنیٰ میں سے ''الرحمن'' کا ربانی انتخاب، کم از کم دو حقائق آشکار کرتا ہے:

۱۔ ''اللہ'' اگر ذاتی نام ہے تو یہ ذاتی نام بھی پورے کا پورا ''الرحمن'' میں مکمل طور پر رنگا ہوا ہے۔

۲۔ ''الرحمن'' ایسا صفاتی نام ہے جو ذاتی نام ''اللہ'' کی نمائندگی کا حق ادا کرتا ہے۔

یہ دو حقائق، اسما الحسنیٰ کی ایک اساسی نسبت کو اجاگر کرتے ہیں کہ تمام کے تمام اسما کی 'الحسنیٰ' سے مناسبت، درحقیقت اللہ یا الرحمن سے مناسبت میں پوشیدہ ہے۔ اس کا ایک مطلب یہ ہوا کہ اسما الحسنیٰ، اللہ یا الرحمن کی نوع سے ہیں ان سے مماثل ہیں اور دوسرا مطلب یہ ہوا کہ اسما الحسنیٰ میں اللہ یا الرحمن کی خصوصیات بتام و بکمال لازماً پائی جاتی ہیں۔ اس لیے آیت کے یہ الفاظ (اَيًّامَّا تَدْعُوْا فَلَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى) اگرچہ متبادل اسما کی عمومیت پر دلالت کرتے نظر آتے ہیں کہ کسی بھی نام سے پکارا جائے اس کے سب نام اچھے ہیں، لیکن یہ سب اچھے نام (الحسنیٰ کے بلیغ پیرائے میں) اللہ یا الرحمن کی (اول و آخر) تمام مناسبتیں، اپنے باطن میں لازمی طور پر سموئے ہوئے ہیں۔

اس مختصر بحث سے واضح ہو جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی جلالی صفات (المتکبر القهار الجبار، وغیرہ) ایک تو تعداد کے اعتبار سے جمالی صفات (الرحمن الرحیم الحلیم الکریم الحکیم اللطیف المصور الغفور الجمیل الرافع المنیر، وغیرہ) سے نسبتاً کم ہیں، دوسرا کم ہونے کے علاوہ (حقیقت میں) جمالِ الٰہیہ کا ہی پرتو یا عکس ہیں۔۔۔۔لیکن ہیں۔ ان کی لازمی موجودگی ایک اعتبار سے یہ گواہی دیتی ہے کہ ان کی عدم موجودگی میں جمال 'جیسا کہ وہ ہے' کا اظہار ممکن نہ تھا۔ تنقیح کے لیے قرآن مجید کی ان داخلی شہادتوں پر غور کیجیے:

قُلْ لِّمَنْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ قُلْ لِّلّٰهِ ؕ كَتَبَ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ (الانعام ۶ : ۱۲)

''پوچھو کہ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے کس کا ہے؟ کہہ دو اللہ کا۔ اس نے اپنی ذات پر رحمت کو لازم کر لیا ہے۔''

كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ ۙ اَنَّهٗ مَنْ عَمِلَ مِنْكُمْ سُوْٓءًۢا بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَاَصْلَحَ ۙ فَاَنَّهٗ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (الانعام ۶ : ۵۴)

''تمہارے رب نے اپنی ذات پر رحمت کو لازم کر لیا ہے کہ جو کوئی تم میں سے جہالت سے کوئی برائی کر بیٹھے پھر اس کے بعد توبہ کر لے اور نیکوکار ہو جائے تو وہ بخشنے والا مہربان ہے''

''اللہ نے اپنی ذات (نفس) پر رحمت لازم کر رکھی ہے'' کے قرآنی مفہوم کو ذہن میں رکھتے سورۃ آل عمران کے اس بیان کو دیکھیے:

وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ (آل عمران ۳ : ۳۰)

''اور اللہ تم کو اپنے (نفس) سے ڈراتا ہے''

اب یہاں ایک متناقضہ (paradox) سامنے آتا ہے کہ ایک طرف اللہ رب العزت نے اپنی ذات پر رحمت لازم کر رکھی ہے

اور دوسری طرف وہ اپنی ذات سے ''حذر'' کی تلقین بھی کرتا ہے۔ اس قولِ محال کی توجیہ قرآنی منشا تلاشنے سے ہوجاتی ہے۔ اسما الحسنیٰ کے (داخلی وخارجی دلالتوں پر مبنی) مفاہیم چونکہ جلالی صفات کو بھی جمالِ الٰہیہ کا ہی پرَتو قرار دیتے ہیں، اس لیے اللہ تعالیٰ کی اپنی ذات سے حذر کی تلقین، حقیقت کے اعتبار سے رحمت کے لزوم کا پیرایہ لیے ہوئے ہے۔ اس کی تصریح اسی آیت کے تکمیلی الفاظ سے بھی ہوجاتی ہے:

وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ ۗ وَاللّٰهُ رَءُوْفٌۢ بِالْعِبَادِ (آل عمران ۳: ۳۰)

''اور اللہ تم کو اپنے سے ڈراتا ہے اور اللہ اپنے بندوں پر نہایت مہربان ہے''

اللہ سے ڈر اصل میں دوسرے تمام ڈراووں کے خاتمے کے لیے ہے، اس لیے بظاہر جلالی صفات بھی اپنے اندرون اور حقیقت میں جمالی ہیں۔ سورت النسا کا یہ بیان پڑھیے:

فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ يَخْشَوْنَ النَّاسَ كَخَشْيَةِ اللّٰهِ اَوْ اَشَدَّ خَشْيَةً (النساء ۴: ۷۷)

''پھر جب انہیں قتال کا حکم ہوا، تو اسی وقت ان میں ایک جماعت ڈرنے لگی لوگوں سے، جیسا اللہ سے ڈرنا چاہیے، یا اس سے بھی زیادہ سخت ڈر''

اس آیت میں ''یا اس سے بھی زیادہ سخت ڈر'' قابلِ غور ہے۔ اس سے اللہ سے ڈرنے کا جو دائرہ اللہ نے طے کر رکھا ہے اس کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ اللہ سے ڈر انسانی فعالیت (جس میں قدم قدم پر غلطی کا احتمال موجود ہے) کو کہیں بے جا محدود و مسدود اور مجروح نہ کر دے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اختیار سے نواز کر، اس کے بعد اپنا ایسا ڈر مسلط نہیں کیا کہ جس سے دیا گیا اختیار مذاق بن کر رہ جائے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰى جَبَلٍ لَّرَاَيْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ ۗ وَتِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ (الحشر ۵۹: ۲۱)

''اگر ہم اتارتے یہ قرآن ایک پہاڑ پر تو تو دیکھ لیتا کہ وہ دب جاتا پھٹ جاتا اللہ کے ڈر سے اور یہ مثالیں ہم سناتے ہیں لوگوں کو تا کہ وہ غور کریں''

سورت الحشر کی اس آیت کا ایک مطلب یہ ہوا کہ جس ہستی ﷺ پر قرآن مجید نازل کیا گیا وہ لازمی طور پر ایسے ظرف کی حامل تھی کہ اس کلام اور اس کے متکلم سے وابستہ ڈر سے دبنے پھٹنے کے بجائے ربانی منشا کے مطابق اسے پوری طرح سہار سکتی۔ اس آیت کا دوسرا مطلب یہ ہوا کہ قرآن مجید کی تنزیل کا مطلوب ومقصود خدا کا ایسا ڈر ہرگز نہیں جس سے اس کے مخاطبین خوف زدہ ہو کر دبک کر بیٹھ جائیں، بلکہ ایسا ڈر ہے جو غور و فکر پر مجبور کر دے۔ اب اگر کوئی اللہ کے ڈر سے بھی زیادہ ڈر کا شکار ہوجائے تو اس کی زندگی، مادی اخلاقی اور روحانی اعتبار سے کس درجے کی ہوگی، اس کی بابت باقاعدہ کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ سورت النسا کی آیت (۷۷) ایک واضح پیغام دیتی ہے کہ ڈر کی آخری حد اللہ سے ڈرنا ہے اور اللہ سے ڈرنے کا بھی ایک دائرہ ہے تو پھر باقی ڈراووں کی کیا اہمیت؟ یہ جعلی ڈراوے ہیں جو انسانی زندگی کو مجہول ومفعول اور مقہور کر کے تحت الثریٰ میں دھکیل دیتے ہیں جب کہ اصلی ڈر انسانی زندگی میں نیت کی تصحیح کو فروغ دے کر تخلیقی فعلیت کی سمت درست

رکھتا ہے جس کے نتیجے میں انسان اوجِ ثریا تک جا پہنچتا ہے۔اس آیت کے بین السطور یہ واضح ہوجاتا ہے کہ اللہ کا ڈر بجائے خود مقصود نہیں، بلکہ اللہ کا ڈر تو اللہ سے محبت کی طرف لے جانے والا ہے۔اس لیے اللہ تعالیٰ کا جلال بھی جمالی رنگ لیے ہوئے ہے تا کہ انسانی اختیار اور اس سے وابستہ تخلیقی فعلیت ڈر سہم کر دبک کر نہ بیٹھ جائے۔

مذکورہ بالا نکات پیشِ نظر رہیں تو سیرت نگاری نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے انذار کو لازمی طور پر بشارتی رنگ میں لینے کا نام ہے۔کیوں کہ جیسے اللہ رب العزت کا جلال جمالی آہنگ لیے ہوئے ہے اسی طرح اس کے محبوب ﷺ کا جلال بھی جمال میں رنگا ہوا ہے۔

مسند احمد کی روایت (رقم ۲۴۷۶۳:) کے مطابق حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

> ''اے اللہ میں بھی ایک بشر ہوں جیسے کسی بشر کو غصہ آتا ہے مجھے بھی آتا ہے،سو میں نے جس مومن یا مومنہ کو بددعا دی ہو تو اسے اس کے حق میں تزکیہ وطہارت کا سبب بنا دے''

اس روایت سے معلوم ہوا کہ نبی ﷺ کا جلال حقیقت میں جمال کا ہی پرتو ہے اس لیے سیرت نگار کو نبی رحمت ﷺ کا جلال پیش کرتے وقت لازمی طور پر خیال رکھنا چاہیے کہ اس کے بیان سے سیرت طیبہ ﷺ کا قاری بے جا ڈر خوف کا شکار ہو مغالطوں کی تحت الثریٰ میں نہ گرنے پائے۔(صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)

-----۱۸-----

دین اپنی حقیقت میں نظامِ تناسبات ہے۔دین کے احکامات اور ان کے مختلف پہلو جس 'تناسب' سے ایک کُل کی صورت گری کرتے ہیں اسے پائے بغیر ہم مقاصدِ شریعت حاصل نہیں کر سکتے۔نبی کریم ﷺ کی ذاتِ گرامی اس تناسب کا مجسّم نمونہ ہے۔مسند احمد کی روایت (رقم ۲۴۷۷۳:) کے مطابق حضرت زرارہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:

> حضرت سعد بن ہشام نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی پھر مدینہ منورہ آگئے اور اپنی زمین وغیرہ بیچنے کا ارادہ کیا تا کہ اس کے ذریعے سے اسلحہ اور گھوڑے وغیرہ خرید سکیں اور مرتے دم تک روم والوں سے جہاد کریں۔ان کی مدینہ والوں میں سے کچھ لوگوں سے ملاقات ہوئی تو انھوں نے حضرت سعد کو اس طرح کرنے سے منع کیا اور ان کو بتایا کہ اللہ کے نبی ﷺ کی حیات طیبہ میں بھی چھ آدمیوں نے اس طرح کا ارادہ کیا تھا تو اللہ کے نبی ﷺ نے انھیں ایسا کرنے سے منع کیا اور فرمایا کیا میری زندگی میں تمہارے لیے بہترین نمونہ (اسوہ حسنہ) نہیں ہے؟

یہ دین میں تناسبات کا لحاظ ہے جس کی وجہ سے قرآن مجید کے نزول کے وقت بھی کسی ایک عامل کے متعلق تمام احکامات کے بجائے مختلف النوع عوامل کے متعلق متفرق احکام نازل ہوتے رہے۔ایسا ہرگز نہیں ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے ایک ہی موضوع کے متعلق تمام احکامات بتدریج نازل کر دیے اور ان کے درمیان کسی دوسرے موضوع کے متعلق کوئی آیت نہ اتاری۔مثال کے طور پر یہ نہیں ہوا کہ سب سے پہلے نماز کے متعلق تمام آیات نازل کر دی گئیں،اس کے بعد جہاد کے متعلق اور پھر اس کے بعد سود (وغیرہ) کے متعلق تمام احکامات دے دیے گئے، بلکہ ایسا ہوا کہ ایک موضوع کے متعلق حکم کے بعد کسی دوسرے موضوع کے متعلق آیات نازل کی گئیں،اس طرح ایک ہی موضوع کے متعلق احکامات، دیگر موضوعات کے متوازی،ارتقائی منازل طے کرتے رہے۔موضوعاتی احکامات کی اس تناسبی ترتیب سے یہ بات واضح

ہو جاتی ہے کہ کسی سماج کی تشکیل، تبدیلی اور ارتقا کے پیچھے کوئی واحد عامل کارفرما نہیں ہوتا، بلکہ کئی عوامل بیک وقت اپنا کردار ادا کر رہے ہوتے ہیں۔ اگر قرآن مجید کی محض موضوعاتی ترتیب ہوتی، تو قاری کسی موضوع کی تلاوت کر کے اسی مخصوص موضوع کے سیاق میں قرآنی حکمت دریافت کرنے کی کوشش کرتا۔ ایسی کوشش پورے قرآنی سیاق سے محرومی کے باعث، قرآنی منشا تک رسائی کے تقاضوں سے عہدہ برآنہ ہو سکتی۔ قرآن مجید کی حتمی ترتیب میں، ایک ہی موضوع سے متعلق آیات کے درمیان والی آیات، موضوع کے مکمل ادراک کے ساتھ ساتھ قرآن مجید کے نظامِ تناسبات کو (مخصوص) موضوع میں سمونے کا سبب بنتی ہیں اور پھر یہ تناسبی رجحان، ایک موضوع کا دیگر موضوعات سے ربط و تعلق قائم کر کے فہمِ قرآن کا بنیادی تقاضا پورا کرتا ہے۔ مثال کے طور پر جہاد و قتال سے متعلق آیات کو اگر کتاب الجہاد کے عنوان سے ایک الگ باب میں جمع کر دیا جائے اور فقط انھی آیات کو پیشِ نظر رکھ کر جہاد و قتال کے متعلق احکام اخذ کیے جائیں تو پورے قرآنی سیاق سے غفلت کے باعث بھٹکنے کا احتمال موجود رہے گا، کیونکہ قرآن مجید کا نظامِ تناسبات ایسی تخصیص کی نفی کرتا ہے۔ لیکن برعکس صورت میں جہاد و قتال کے قرآنی احکامات ان تمام پہلوؤں سمیت سامنے آسکیں گے جس حد تک بشری استعداد میں ممکن ہے۔ قرآن مجید کے اسی نظامِ تناسبات کو سیرت نگاری کے دوران میں خاص طور پر دھیان میں رکھنا چاہیے ورنہ اسوہ حسنہ تک رسائی مشکل ہی نہیں ناممکن بھی ہو جائے گی۔ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)

-----۱۹-----

ابھی تک یہ اصول مسلّمہ سمجھا جاتا ہے کہ ایک ہی موضوع پر قرآنی احکامات، اپنی نزولی ترتیب کے اعتبار سے جن مراحل سے گزرے ہیں، وہ مراحل بعینہٖ مستقل نوعیت کے حامل ہیں اور ایک ہی موضوع پر آخری حکم، حتمی حکم (ناسخ) کا درجہ رکھتا ہے۔ اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ اصول اتنا درست نہیں ہے جتنا سمجھا جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن مجید کی حتمی ترتیب نے نزولی ترتیب کے احکامات کا 'ارتقائی نظم' گڈ مڈ کر دیا ہے۔ اب حتمی ترتیب میں ایک ہی موضوع پر احکامات، اس ترتیب کے ساتھ نہیں پائے جاتے جس ترتیب کے ساتھ یہ نازل ہوئے تھے۔ نزول کے وقت چونکہ ایک خاص سماج مخاطب تھا، اس لیے اس کے مخصوص تقاضوں کے مطابق ایک خاص ترتیب کے ساتھ احکامات نازل ہوئے اور بتدریج آخری حکم دے دیا گیا۔ بعد میں نزولی ترتیب کے خاتمے اور حتمی ترتیب کے اجرا سے، ارتقا کے اس اصول کو بھی خیرباد کہہ دیا گیا۔ بعض لوگ سیرت کے باب میں غلطی کے مرتکب ہو رہے ہیں جب وہ (نزولی ترتیب سے مربوط ارتقائی مراحل کی بنا پر) کہتے ہیں کہ ہم ابھی مکی دور سے گزر رہے ہیں۔ انھیں جاننا چاہیے کہ اگر قرآن مجید کی حتمی ترتیب اپنے موضوعاتی بکھراؤ کے جلو میں، ایک ہی موضوع کے متعلق مختلف احکامات کو ارتقا کے (پرانے مراحل کے) بجائے، نظامِ تناسبات کے اثبات کے ساتھ نئے زمانی احوال، سماجی مقتضیات اور ثقافتی متغیرات کے حوالے سے دیکھتی ہے تو پھر صاحبِ قرآن ﷺ کی حیاتِ طیبہ کیوں کر (پرانے ارتقائی مراحل کی) پابند رہ سکتی ہے؟ سیرتِ مطہرہ کے باب میں، قرآن مجید کی حتمی ترتیب سے وابستہ حکمت اور قرآنی نظامِ تناسبات کا لحاظ نہ رکھنے کا نتیجہ ہے کہ علمی و عملی میدان میں 'غلو' کی نت نئی عجیب و غریب صورتیں ظہور پا رہی ہیں۔

---

*سیرت طیبہؐ پر لکھی گئی کتاب کا مقدمہ، جس پر مصنف کو بین الاقوامی سیرت ایوارڈ سے نوازا گیا

مکالمہ بین المذاہب اور سوشل میڈیا کا کردار

ڈاکٹر سید محمد اسماعیل

ایسوسی ایٹ پروفیسر، صدرِ شعبہ علوم اسلامیہ

گورنمنٹ زمیندار پوسٹ گریجویٹ کالج گجرات

جدید الیکٹرانک میڈیا جس کی ایک شاخ سوشل میڈیا ہے، یقیناً یہ عقل کو بے حد متاثر کرنے والا میڈیا ہے، جو انگلیوں کے لمس اور آنکھ کی پتلی میں دنیا بھر کے تعلقات اور معلومات کو لے آیا ہے۔ اس کے متعلق یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ حواس کی دسترس کس قدر وسیع ہے اکیسویں صدی میں انسان کو اس کا ادراک اس میڈیا کے ذریعے ممکن ہوا ہے۔ بہت سی معلومات جن تک رسائی طویل جدو جہد کا نتیجہ ہوا کرتی تھی اب لمحوں میں آنکھوں کے سامنے ہوتی ہے، بالکل ملکہ صبا کے تخت کی طرح کہ کسی جنّ نے پلک جھپکنے میں انہیں لا کر سامنے رکھ دیا ہو۔ اسی طرح بھولے بسرے تعلقات پھر سے ایسے قائم ہو جاتے ہیں کہ جیسے دل میں بسے خواب و خیالات کہ جنہیں آنکھ بند کر کے دیکھا جاتا تھا اب وہ کھلی آنکھوں کے سامنے ہوتے ہیں۔ مادی وسائل پر انحصار کرنے والوں کے لئے جدید میڈیا ایک لحاظ سے مستقل علم یا ذریعہ علم کا درجہ اختیار کر چکا ہے۔ یہ بات مذہبی تعلیمات بالخصوص اسلامی تعلیمات کے مقابلے میں کسی صورت قابل قبول نہیں ہے۔ یہ جدید دور کا ایک بہت بڑا دھوکہ ہے جس نے عقل انسانی کو علمائے علوم اسلامیہ کی پورے عالم پر بالا دستی کے طویل عہد زریں کے بعد عوام النّاس کو اپنی طرف متوجہ کر کے پھر سے بہت بڑا چیلنج دے دیا ہے۔ اس چیلنج کو سمجھنے کے لئے مرزا اسد اللہ خاں غالب کا یہ شعر نہایت ہی موزوں ہی کہ:

ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ

دیتے ہیں دھوکہ یہ بازی گر کھلا

سمجھنا چاہئے کہ بنیادی اعتبار سے سوشل میڈیا ایک آلہ رسل و رسائل ہے جس میں چکا چوند اور مادی وحسّی کشش موجود ہے۔ مگر کیا یہ مذہب یا فلسفہ کے بنیادی سوالات کے قابل اطمینان جوابات خود سے مہیا کرے گا ایسا بالکل نہیں ہے۔ بلکہ یہ اس کا کام ہی نہیں ہے۔ یہ جو کچھ وسیع پیمانے پر پھیلاتا ہے وہ انسانوں ہی کے خیالات و نظریات ہیں جو کہ بغیر کسی معتبر سہارے کے عام حالت میں ادھورے ہی ہوتے ہیں۔ یہ سوال سے سوال نکالنے اور بات سے بات بحث کو بڑھانے کے لئے صرف پلیٹ فارم مہیا کرتا ہے۔ سادہ الفاظ میں کہیں تو کسی بھی قانون اور ضابطہ کی پابندی اس کی ترقی میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ اس کی اپنی کوئی ایمانیات ہیں اور نہ ہی ایمانیات کا فروغ اس کے پیش نظر ہے۔ یوں یہ عوام الناس میں تشکیک کے فروغ اور مذہب و اخلاق سے دوری کا سبب بن گیا ہے۔ شاید اسی بات نے سوشل میڈیا کو عالمی استعماری طاقتوں کے لئے ایک مقبول ترین ہتھیار بنا دیا ہے۔ سوشل میڈیا بہت سی سہولیات کا حامل ہیاور بظاہر ہمیں یہ لگتا ہے کہ ہم اس کے ذریعے ہاتھ کے اشارے سے پوری دنیا کو احکام جاری کر رہے ہیں لیکن معاملہ اس کے برعکس ہوتا ہے۔ ہم اس سوشل میڈیا کے ذریعے عالمی استعمار جو اس کو کنٹرول کرتا ہے کے ہاتھوں میں ہاتھ دے کر ایک طرح سے اس کی بیت کر کے خود اس کے مرید بن جاتے ہیں۔ یوں ہم غیر محسوس طور پر استعماری طاقتوں کے آلہ کار بن جاتے ہیں۔ جبکہ یہ بات تو واضح ہے کہ عالمی استعمار، عالم کفر کا نمائندہ ہے۔ جو اب سوشل میڈیا کے ذریعے پوری دنیا کے مسلم ممالک بالخصوص پاکستان میں انتہائی نقصان دہ کردار سرانجام دے رہا ہے۔ پاکستان میں سوشل میڈیا کا کردار

کیا ہے؟ تنقیدی اعتبار سےاس سے متعلق اہم نکات کو یوں بیان کیا جاسکتا ہے:

- تشکیک کا سبب، وسیع پیمانے پر غیر مصدقہ اور ادھوری معلومات کی تیز ترین ترسیل
- سا کت اور سی سی ٹی وی کیمرہ فوٹیج کی غیر قانونی وغیر اخلاقی دستیابی
- غیر شرعی تعلقات قائم کرنے کے بین البراعظمی مواقع اور ذرائع
- بین البراعظمی تشہیر اور حصول شہرت کی لامحدود اشتہاء پیدا کرنا
- نجی یا ذاتی زندگی کا خاتمہ اور بلا ضابطہ دخل اندازی کا کردار
- خاندانی نظام کے خاتمے کا کردار
- حقیقت چھپانے یا دھندلانے کی مہارت
- متشدد اظہار رائے کو انتہائی آسانی سے پھیلانا
- نامکمل نمونہ، ماڈل یا مثال کو بڑھا چڑھا کر پیش کرنا
- مذہبی، مسلکی اور فرقہ ورانہ مباحثوں کے لامحدود اور غیر منظور شدہ پلیٹ فارم

پاکستان میں سوشل میڈیا کے بڑھتے ہوئے استعمال کو دیکھتے ہوئے سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ سوشل میڈیا جس نے پوری دنیا کے انسانوں کو ایک طرح سے جوڑنے کا کردار ادا کیا ہے تو کیا اس سے مکالمہ بین المذاہب کی صحت مندانہ فضا قائم کرنے میں بھی کوئی پیش رفت ہوئی ہے یا نہیں؟ سوشل میڈیا کے مذکورہ بالا استعمال کے تناظر میں اگر یہ کہا جائے کہ جدید دور میں بین المذاہب مکالمہ کسی بھی جانب سے کیا ہی نہیں جا رہا تو غلط نہیں ہوگا۔ معلومات لی جا رہی ہیں، معلومات دی جا رہی ہیں، بحث برائے بحث بڑھتی جا رہی ہے کہ یہ ریٹنگ کے حصول کا بڑا ذریعہ ہے، مکالمہ کی فضا پیدا کرنے پر ہر جانب سے شور مچایا جا رہا، مکالمہ کی دعوتیں دی جا رہی ہیں، اس کی اہمیت اور ضرورت کو اجاگر کیا جا رہا ہے، اس پر سیمینار پر سیمینار ہو رہے ہیں اور بالخصوص مسلم مما لک میں تو ضرورت سے زیادہ ہی ہو رہے ہیں، مگر حقیقت میں کیا مکالمہ کیا جا رہا ہے، یا کہیں مکالمہ بین المذاہب فی الواقعہ ہو بھی رہا ہے تو اعداد وشمار کسی بھی ایسے مکالمہ کے موثر طور پر کئے جانے کو بیان نہیں کر رہے۔ یوں اس وقت مکالمہ کی فضا اگر فی الواقعہ ہے تو انتہائی محدود پیمانہ پر موجود ہے۔ بلکہ یوں نظر آر ہا کہ مکالمہ کی آڑ میں طے شدہ اہداف حاصل کئے جا رہے ہیں، اسلام اور مسلم مما لک کے خلاف مقاصد کے حصول میں پیش رفت ہو رہی ہو تو" ڈومور" کا راگ سننے کو ملتا ہے جبکہ اس کے بر عکس نقصان یا پسپائی نظر آنے کی صور میں فوراً مکالمہ" ڈائیلاگ" کا راگ الاپنا شروع کر دیا جاتا ہے۔ حالیہ امریکہ افغانستان جنگ کے تناظر میں یہ بات کسی سے ڈھکی چھپی نہیں ہے۔

یہ طرز عمل اس لئے ہے کہ اسلام کی حقانیت فکری دنیا پر مکالمہ کے میدان میں ایسی واضح ہو چکی ہے کہ اس کے زیر اثر یا تو اسلام کو مان لیا جائے یا پھر عناد کو ہوا دیتے ہوئے عالم اسلام کے خلاف ہر سطح پر ہر طرح سے یلغار اور محاذ آرائی کو برقرار رکھا جائے۔ اس اعتبار سے جدید دور میں سوشل میڈیا کا کردار ایک بہت بڑے ہتھیار کے طور پر ابھر کر سامنے آیا ہے۔ یہ سوشل میڈیا مکالمہ بین المذاہب کی صحت مند فضا قائم کرنے کی بجائے فی الحال بڑے پیمانے پر ایمان کو تشکیک میں بدلنے اور پھر مذہب سے بدظن کرنے میں انتہائی فعال کردار ادا کر رہا

ہے۔جس کے لیے ایسے ایسے شارٹ کلپ، مختصر دورانئے کی ڈاکومینٹریز، سی سی ٹی وی اور موبائل کیمرہ فوٹیجز، بہت سی مختصر تحریریں اور آن کی آن میں وائرل کرنے کی غرض سے اخلاق باختہ پہلوؤں کا بے تحاشا استعمال اور اس طرح کی اور بہت سی ایپلیکیشنز ہیں کہ جن کا کام ہی صرف اور صرف تشکیک کو پھیلانا ہے۔جس کے نتیجے میں مذہب سے دوری اور پھر اس سے بڑھ کر مذہب بیزاری کا کام خود بخود ہوتا چلا جاتا ہے۔

الٰہیات پر تشکیک کے سدباب کے لئے علم الکلام کو علوم اسلامیہ میں ایک منفرد مقام حاصل ہے۔تاریخ اسلام کے ہر دور میں متکلمین اسلام نے امت کو تشکیک میں مبتلا ہونے سے بچانے کے لئے اپنے اپنے دور کے تقاضوں کے مطابق بھر پور کردار ادا کئے تھے۔ ماضی میں تشکیک پیدا کرنے کا جو کام منطق اور فلسفہ نے سرانجام دیا تھا متکلمین نے بخوبی اس کا سد باب کیا تھا۔اب وہی کام قدرے نئے اسلوب میں سیکولر اور لبرل نظریات سرانجام دے رہے ہیں اور اس مقصد کے لئے جدید سوشل میڈیا کا بے دریغ استعمال اس انداز میں کیا جا رہا ہے کہ وہ مختلف طریقوں سے تشکیک ہی میں اضافہ کا سبب بن رہا ہے۔اس کا سد باب نہ ہوسکنے کی وجہ عالم اسلام کے متکلمین کا کمیاب ہونا ہے۔موجودہ دور جس میں اسلامی تعلیمات یا مطلق مذہب سے متعلق تشکیک پھیلانے کا بیڑا جن عناصر نے اٹھا رکھا ہے وہ بڑے پیمانے پر ہر ہاتھ میں موجود اس سوشل میڈیا چینلز کو ففتھ جنریشن وار کے ایک موثر ترین ہتھیار کے طور پر استعمال کر رہے ہیں۔ساتھ ہی ساتھ یہ چیز سرمایہ دارانہ استعماری نظام کے استحکام کا سبب بھی ہے۔ لہذا وقت کے متکلمین کے لئے ایک بڑا چیلنج یہ ہے کہ انہیں اس ہتھیار کو ناکارہ بنانے کے لئے حکمت عملی ترتیب دینی ہوگی۔تاکہ مسلمانوں کی ایمانیات کو لاحق خطرات سے اپنی آئندہ نسلوں کو محفوظ بنایا جا سکے۔اس ضمن میں جس پہلو پر کاری ضرب لگانے کی ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ سوشل میڈیا خدا کی بندگی سے غافل کرنے والی مقابلہ کی لایعنی دوڑ پیدا نہ کر پائے اور ضابطہ اخلاق کا ایسا پابند بنایا جائے کہ تشکیک ومنافرت پیدا کرنے والا کردار ختم ہوجائے۔

جو بات عالم اسلام کے خلاف ہے وہی عالم کفر کا مطلوب ہے۔لہذا ایسی سوشل میڈیا جسے پوری دنیا میں انتہائی تیزی سے پذیرائی ملی اور تنقیدی جائزہ لئے بغیر ہر کوئی اس کو مفید ہی مفید سمجھ کر اپنائے جا رہا ہے، تو سمجھنا چاہیئے کہ اس کے پیچھے حواس کی تسکین کا وہی سامان ہے جو یہ اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے۔شرعی حدود وقیود، حسیّات کی بے جا تسکین کے انہی سامانوں پر بند باندھتی ہیں جو کہ طبیعت کے لئے گراں ہوتی ہیں۔حالانکہ جب حواس کی دسترس کا وسیع ادراک اس کے ذریعے ممکن ہوا ہے تو ہونا تو یہ چاہیئے تھا کہ انسان کائنات کی حقیقتوں کو جاننے کے بعد حقیقت اعلیٰ، اللہ رب العزت جو خالق کائنات ہے اس کی کاریگری کو تسلیم کرتا۔پھر نہ صرف خود کو جدید ایجادات کے سحر سے بچاتا بلکہ بنی نوع انسان کو قانونی واخلاقی ضابطوں کی پابندی سے نکلنے نہ دیتا۔لیکن حق وباطل کی کشمکش اور دنیا کے دارالعمل اور امتحان گاہ ہونے کی حقیقت، تقدیر کے لکھے کو بتدریج سامنے لاتی جا رہی ہے۔فیصلے کا جو محدود اختیار انسان کو دیا گیا ہے قدرت نئے روپ میں اس کو آزما رہی ہے۔یقیناً یہ پہلو چشم بصیرت سے دیکھنے والوں سے پوشیدہ نہیں ہے۔لہذا تشکیک سے بچاؤ اور اصلاح امت کے لئے فقہائے، متکلمین اور صوفیائے عظام کے بے مثال کردار اور مساعی جمیلہ پر جمی گرد کو صاف کر کے ہر فرد تک ایمان افروز حقائق کا پہنچانا، وقت کی ناگزیر ضرورت ہے۔

هذا هو المرام والله اعلم بحقيقة الكلام

مابعد جدید دنیا اور اُردو فکشن

Post Modern World and Urdu Fiction

ایم۔خالد فیاض
ایسوسی ایٹ پروفیسر، صدر شعبہ اردو
زمیندار کالج گجرات

ہم آج جس دنیا میں رہتے ہیں اسے مابعد جدید دنیا کہا جاتا ہے۔ یہ مابعد جدید دنیا کیا ہے؟ عام طور پر ہمارے ناقدین اور مفکرین، فلسفے کی بحثوں کو جو مابعد جدیدیت کا فکری پہلو ہیں، حوالہ بنا کر اسے ایک پیچیدہ اور الجھا ہوا معاملہ بنا دیتے ہیں۔جس سے اس سماجی صورت حال کو الگ سے سمجھنے میں بہت دشواری ہوتی ہے، جس میں ہم سانس لے رہے ہیں۔

یوں تو مابعد جدید صورت حال سے مراد یہ لی جاتی ہے کہ نئے معاشرے کی تیزی سے بدلتی ہوئی صورت حال، نئے معاشرے کا مزاج، مسائل، ذہنی رویے یا معاشرتی وثقافتی فضا یا کلچر کی تبدیلی جو کرائسس کا درجہ رکھتی ہے یعنی مابعد جدیدیت کا معاشرے کے مزاج اور کلچر کی صورت حال سے تعلق ہے۔مگر سوال یہ ہے کہ تیزی سے بدلنے والی اس صورت حال کی اصل شکل کیا بنتی ہے؟ اصل میں مابعد جدید دنیا موجودہ دور کے اُس طور یا صورت حال کا نام ہے جس میں ہر چیز مارکیٹ کا بکاؤ مال ہے، جس میں غلبے کو فوقیت حاصل ہے، جس میں ہر خیال، احساس، جذبہ حتیٰ کہ اظہارِ رائے بھی تشکیل دی جاتی یعنی بنائی جاتی ہے، جہاں تشدد کو ایک اصول کا درجہ مل چکا ہے اور دہشت گردی فلسفۂ حیات بن چکی ہے، جہاں مقامی اور عالمی کلچر کی کش مکش بڑھ چکی ہے اور جس میں طاقت ور ثقافت کم زور ثقافت کو کھا جاتی ہے، جہاں قریب کا فرد دور اور دور کا فرد قریب ہو گیا ہے کیوں کہ افراد سے ہم بالمشافہ نہیں مشین کے ذریعے ملتے ہیں، کمپیوٹر انسانوں پر حکمرانی کر رہے ہیں، معلومات کو علم کا درجہ حاصل ہو گیا ہے اور یہ کہ ہم دنیا کا مشاہدہ اپنی آنکھوں سے نہیں، سکرین کے ذریعے کرنے پر مجبور ہیں، اور یہ نہیں جانتے کہ سکرین اصل حقیقت کو نہیں، تشکیلی حقیقت کو دکھاتی ہے۔

دوسری عالمی جنگ کے بعد دنیا کی شکل تیزی سے بدلنا شروع ہوئی۔نوآبادیاتی اور استعماری قوتوں نے کم زور اقوام پر اپنا غلبہ قائم رکھنے کے لیے کئی ہتھکنڈے آزمائے۔ سائنس کی بے پناہ ترقی جہاں انسان کے لیے بہت سی آسائشیں لائی وہیں طاقت وروں اور استحصال کرنے والوں کے ہاتھ مضبوط کرنے میں بھی انتہائی معاون ثابت ہوئی۔ سائنس اور سائنس کے نتیجے میں فروغ پانے والی صنعتی ترقی نے پہلے بھی انسانی دکھوں میں اضافہ کر رکھا تھا مگر اب ان دکھوں کو گننا مشکل ہو گیا، کیوں کہ اب صنعت کاری نے صارفیت کو متعارف کروایا جس نے انسانی استحصال کا بالکل نیا راستہ کھول دیا۔ صارفیت نام ہے صنعت کاری کے اُس عمل کا جس میں شے کی پیداوار صارف یا خریدار کی ضرورت کی محتاج نہیں رہتی بلکہ صنعت کار جو شے بھی پیدا کرتا ہے اُسے خریدار کی ضرورت بنا دیتا ہے اور اس کے لیے وہ ایڈورٹائزمنٹ کا سہارا لیتا ہے جو الیکٹرانک اور پرنٹ میڈیا کے ذریعے لوگوں تک پہنچتی ہے۔ اس طرح صارفی معاشرے میں میڈیا کا کردار بھی واضح ہوتا ہے۔ صارفیت کے نظام میں صنعت کار اشیا کا انبار یہ سوچ کر لگاتا ہے کہ وہ صارفین کو پروپیگنڈا کے ذریعے یہ احساس دلا دے گا کہ یہ اشیا آپ کی زندگی کے لیے انتہائی ضروری ہیں اور یوں وہ اُن کو اپنا خریدار بنا لے گا۔ صارفیت میں ہر معاملہ ہر بات ہر احساس، ہر جذبہ، ہر رشتہ، علاج، تعلیم اور حتیٰ کہ

ادب، سب کچھ پہلے 'شے' بنایا جاتا ہے اور پھر اُسے بیچا جاتا ہے۔ اسی لیا کہا جاتا ہے کہ دنیا کی مارکیٹ میں آج ہر چیز بکتی ہے۔ صارفیت کے اس نظام کو ہی مابعد صنعتی نظام بھی کہا جاتا ہے اور اسی سے ہائپر ریئلیٹی اور گلوبلائزیشن کے تصورات واضح ہوتے ہیں۔

ہائپر ریئلیٹی کو اُردو میں تشکیلی حقیقت کہتے ہیں یعنی ایسی حقیقت جسے تشکیل دیا جائے، بنایا جائے۔ مجھے کیا چاہیے، اس کا فیصلہ اب میں نہیں بلکہ جیسا کہ ابھی ذکر ہوا، الیکٹرانک میڈیا کرتا ہے جو ایڈورٹائزمنٹ کے ذریعے اس پروپیگنڈا کو فروغ دیتا ہے جس کا مجھے شکار کیا جانا ہوتا ہے۔

ہماری زندگی کو اب کیمرہ اور سکرین کنٹرول کرتے ہیں۔ آپ کا سارا دارومدار سکرین پر ہے مگر یہ نہیں جانتے کہ سکرین حقیقت کو نہیں تشکیلی حقیقت کو دکھا رہی ہے۔ کیوں کہ سکرین کیمرے کی محتاج ہے اور کیمرے کا زاویہ بدلنے سے ایک ہی چہرہ بھیانک بھی دکھایا جا سکتا ہے اور انتہائی خوب صورت بھی۔

گلوبلائزیشن اصل میں پوری دنیا کو ثقافتی سطح پر ایک رنگ میں رنگنے کا نام ہے۔ آج سے پہلے دنیا میں امن قائم کرنے کی خاطر عالم گیر حکومت کی تجاویز پیش ہوتی رہی ہیں۔ جس میں آئن سٹائن جیسے سائنس دان اور برٹرینڈ رسل جیسے مفکر پیش پیش رہے ہیں۔ مگر گلوبلائزیشن اصل میں ملٹی نیشنل کمپنیوں کا ایجنڈا ہے جو پوری دنیا کو یک رنگا دیکھنا چاہتا ہے، اور اس کے پیچھے امنِ عالم جیسا کوئی مقصد نہیں بلکہ صارفیت کو فروغ دینے کا مریضانہ رجحان ہے جس کا مقصد محض اپنی منڈیوں میں اضافہ کرنا ہے۔ آئیے اسے ایک مثال سے سمجھتے ہیں۔

پہلے زمانے میں ہمارے ہاں خواتین مہندی وغیرہ یا لسّی یا کسی اور مقامی گھریلو نسخے سے سر کے بال دھویا کرتی تھیں، اب ہر کوئی شیمپو استعمال کرتا ہے۔ شیمپو بنانے والی کمپنی کو زیادہ سے زیادہ گاہک یعنی خریدار چاہئیں، لہٰذا اب اگر کوئی اپنی ثقافت کے تحت وہی پرانے گھریلو نسخوں کا استعمال جاری رکھتا ہے تو شیمپو بنانے والی کمپنی کا اس میں نقصان ہے۔ اُس کی خواہش یہی ہوگی کہ ساری دنیا کی عورتیں اُن کا شیمپو استعمال میں لائیں، جیسا کہ ہو بھی رہا ہے، تا کہ اُن کے بنائے ہوئے شیمپو کی کھپت میں اضافہ ہو اور جس قدر یہ اضافہ زیادہ ہوگا کمپنی کو منافع زیادہ ہوگا، اس لیے کمپنیاں مقامی کلچرز کو کبھی برداشت نہیں کر سکتیں۔ وہ عالمی گاؤں کی حمایت کرتی ہیں، گلوبلائزیشن کا نعرہ لگاتی ہیں مگر لوگوں کے کسی فائدے کے لیے نہیں بلکہ اپنی پراڈکٹس مارکیٹ میں بیچنے کے لیے۔ اور اب ہم ان ملٹی نیشنل کمپنیوں اور ان کی مارکیٹنگ کے صارف ہیں یعنی گلوبلائزیشن کا حصہ ہیں۔ ہم اسی دنیا میں جی رہے ہیں۔

آپ یہ جان کر حیران رہ جائیں گے کہ گلوبلائزیشن اور صارفیت کے اس عہد میں تعلیم بھی ایک پراڈکٹ بن چکی ہے۔ اگر آپ لیوتارڈ کی کتاب The Post Modern Condition کا مطالعہ کریں اور صرف اسی کتاب کا مطالعہ ہی نہیں، اگر آپ اپنے اردگرد نظر دوڑا کر دیکھ لیں تو بھی یہ معلوم ہو جائے گا کہ اس عہد میں علم بھی بیچا جا رہا ہے۔ پہلے جو لوگ تعلیم حاصل کرتے تھے وہ طالب علم کہلاتے تھے (دھوکے میں مبتلا کرنے کے لیے اب بھی یہی کہا جاتا ہے) لیکن اب تعلیم حاصل کرنے والے اصحاب، بنیادی طور پر علم کے خریدار یا صارف ہیں۔ یہ علم خریدنے اور بیچنے کا عہد ہے۔ آپ علم خرید سکتے ہیں تو تعلیمی اداروں کا رخ کیجیے آپ کو ڈگری اور اسناد دے دی جائیں گی، دوسری صورت میں آپ کا گھر بیٹھے رہنا یا مزدوری کرنا اس مابعد جدید دنیا کے لیے قطعاً نا گوار نہیں ہے۔

دوسری بات یہ کہ اس عہد میں علم کو طاقت کا ہتھکنڈا اپنا لیا گیا ہے۔ علم اب صرف اس لیے پیدا کیا جاتا ہے کہ منڈی کی معیشت میں

اس سے منافع اندوزی کی جا سکے جو طاقت کو بڑھانے میں معاون ہے۔ یہی کچھ ہماری دنیا میں ہو رہا ہے۔ اصل میں ایک بات اور بھی ذہن میں رکھنے کی ہے کہ یہ کمپیوٹر عہد یا کمپیوٹر معاشرے کا علم ہے۔

آج کا دور بلاشبہ کمپیوٹر ایج کہلاتا ہے جس میں ہر انسانی معاملہ کمپیوٹر کا محتاج ہے۔ آئندہ کے سماج کا سارا دارومدار کمپیوٹر کے علم پر ہے۔ اور چوں کہ اب طاقت کا تعلق کمپیوٹر سے ہے اس لیے علم اور طاقت ایک ہی سکّے کے دو رخ ہو گئے ہیں۔

اور اس سب نے ایک طرف مقامی اور عالمی ثقافت کے درمیان کش مکش کو بڑھایا ہے اور دوسری طرف تشدد اور دہشت گردی کو رواج دیا ہے۔ جس کی وجہ سے ہمیں ایک انتہائی خطرناک صورت حال کا سامنا ہے۔

اب ہم یہ دیکھنا چاہیں گے کہ ہماری اس مابعد جدید دنیا کو ہمارے فکشن نے کس طرح، کس حد تک اور کن کن حوالوں سے اپنا موضوع بنایا ہے۔ اصل میں یہ کہے بغیر چارہ ہی نہیں کہ یہ ادب ہی ہوتا ہے جو اپنے عہد کی روح کی صحیح ترجمانی کا فریضہ ادا کرتا ہے۔ اور اس میں فکشن کو فوقیت حاصل ہے اور وہ اس لیے کہ میرے خیال میں زمانے اور معاشرے کی بدلتی ہوئی صورت حال کی دستاویز سب سے زیادہ افسانوں اور ناولوں میں مرتب ہوتی ہے، اور وہ زیادہ بامعنی بھی بن جاتی ہے کیوں کہ کہانی میں ایک ایسا جوہر ہوتا ہے جو ایک فرد کو دوسرے افراد، معاشروں اور زمانوں کی زندگی جاننے کا لطف دیتا ہے۔

اُردو کے موجودہ افسانے اور ناول اپنے اس عہد کو یعنی مابعد جدید دنیا کو دکھانے کا کردار بہ خوبی ادا کر رہے ہیں۔ وہ صارفیت زدہ کلچر کی بھی نمائندگی کر رہے ہیں، گلوبلائزیشن کے اثرات کو بھی بیان کر رہے ہیں، علم کی بے توقیری کو بھی موضوع بنا رہے ہیں، تاریخ کے بدلے ہوئے تصورات کا بھی اظہار کر رہے ہیں، تشدد اور دہشت گردی کے مختلف حوالوں کو بھی ریکارڈ میں لا رہے ہیں اور کمپیوٹر عہد کی تصویر کشی کا فریضہ بھی ادا کر رہے ہیں۔

یہاں سب ناولوں یا افسانوں کا ذکر تو ممکن نہیں مگر چیدہ چیدہ تخلیقات سے تعارف کرانا ضروری ہے جس سے معلوم ہو کہ ہمارا فکشن اس مابعد جدید دنیا کو کس قدر سنجیدگی سے پیش کر رہا ہے۔ پہلی مثال مرزا اطہر بیگ کے ناول ''صفر سے ایک تک'' کی ہے جس میں آج کے کمپیوٹر عہد کو موضوع بنایا گیا ہے۔

ناول ''صفر سے ایک تک'' اصل میں کمپیوٹر پروگرامنگ، انٹرنیٹ اور اس کے استعمال کی نئی نئی دریافتوں کا بیانیہ ہے۔ یہ ناول سائبر اسپیس کے ایک منشی کی سرگزشت ہے جس کو اطہر بیگ نے اپنے جدید اور انوکھے انداز میں قاری کے سامنے پیش کیا ہے۔ مصنف نے اس ناول کے ذریعے کمپیوٹر پروگرامنگ کی معلومات جس طرح فراہم کی ہیں وہ نایاب ہیں۔ سائبر اسپیس کا منشی جو ناول کا بنیادی کردار ہے وہ کمپیوٹر پروگرامنگ اور نئی نئی ویب سائٹس سے قاری کو متعارف کرواتا ہے اور مختلف قسم کی گیمز سے آشنائی بھی کرواتا ہے۔

یہاں یہ بتانا ضروری ہے کہ سائبر اسپیس کی اصطلاح پہلے پہل سائنس فکشن کے مصنف ولیم گبسن نے کمپیوٹر کی دنیا کے لیے ۱۹۸۴ء میں استعمال کی۔ ولیم گبسن نے یہ اصطلاح ان معنوں کو بیان کرنے کے لیے وضع کی تھی کہ یہ معلومات اور اطلاعات کا ایک وسیع سمندر ہے۔ کچھ لوگوں کے نزدیک سائبر اسپیس دنیا بھر میں پھیلے ہوئے کمپیوٹر کے نظاموں کے رابطے کا نام ہے۔ اور کچھ کے خیال میں یہ برقی مقناطیسی قوت کا ایسا استعمال ہے جو دنیا بھر کے افراد کو باہمی رابطوں کے قابل بناتا ہے۔ لیکن مرزا اطہر بیگ نے اس ناول ''صفر سے ایک تک'' کے

ذریعے کمپیوٹر یعنی سائبر اسپیس کی جو تعریف کی ہے یا سائبر اسپیس کو جن معنوں میں استعمال کیا ہے وہ سب سے الگ اور سب تعریفوں سے دو قدم آگے ہے۔ ان کے نزدیک سائبر اسپیس مکانیت سے ماورا ہے اور دنیا بھر کے کمپیوٹروں کو یہ ایک لامکاں میں مربوط کرتا ہے اور اس لامکاں تک پہنچنے کے لیے انٹرنیٹ کے برقی دروازے پر دستک دینی پڑتی ہے۔

اس ناول کا ایک کمال یہ بھی ہے کہ اس میں اس بات کا بھی پتہ لگایا گیا ہے کہ انفارمیشن ٹیکنالوجی اور انٹرنیٹ نے جاگیردارانہ معاشروں میں افراد کی زندگیوں کو کس طرح اور کیسے متاثر کیا ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ کس طرح یہ ٹیکنالوجی جاگیردارانہ طاقت ور گرفت کا مقابلہ کر سکتی ہے۔ اس بات کا اعتراف مصنف نے بھی کیا ہے کہ انہیں اس ناول کے لکھنے کا خیال کمپیوٹر ٹیکنالوجی کے تیز ترین پھیلاؤ اور وسیع ترین اثرات کی بدولت ہی آیا، جو اس مابعد جدید دنیا کا لازمہ ہے۔

مابعد جدید دنیا میں اداروں نے اپنا اعتماد کس طرح گنوایا ہے اور معاشروں میں اُن کا کردار کیا ہو گیا ہے، اس حوالے سے الیاس احمد گدی کا ناول ''فائر ایریا'' قابلِ ذکر ہے۔ بظاہر یہ ناول کوئلہ مزدوروں کی زندگی کی داستان ہے، وہ زندگی جو ہر لمحہ موت اور حیات کے بیچ لٹکتی رہتی ہے۔ چھوٹا ناگپور کے پس منظر میں لکھا گیا یہ ناول مزدوروں کے ساتھ ساتھ لیڈروں کی بھی زندگی اور فکر کے بارے میں بہت کچھ اظہار کرتا ہے۔ مالکان، ایجنٹس، یونین اور اُس کے لیڈر، مزدوروں کا مسلسل استحصال، اُن کی زندگی اور قتل و غارت گری وغیرہ اس ناول کے موضوعات ہیں؛ لیکن بنیادی نکتہ یہ ہے کہ جو ادارے جس کام کے لیے وقف ہیں وہ اپنا کام نہیں کرتے، وہ ہمیشہ بکاؤ مال ہوتے ہیں۔ انہیں خریدا جا سکتا ہے یعنی اب ادارے نام نہاد ہو گئے ہیں اور اُن کا وزن اور وقار ختم ہو گیا ہے۔ ایسی صورت میں مزدور کا حال، ماضی اور مستقبل سبھی تاریک رہتا ہے اور وہ مقروض مر جاتے ہیں یا کانوں ہی میں کسی حادثے کا شکار ہو کر دفن ہو جاتے ہیں۔ اسے مابعد جدید صورت حال کا ناول اسی لیے کہہ سکتے ہیں کہ اس میں دکھایا گیا ہے کہ جن اداروں پر بھروسہ ہوتا ہے وہ ادارے مدد اور راحت پہنچانے کے بجائے استحصال شروع کر دیتے ہیں۔ ناول کا ایک اقتباس ہے جس میں راوی کہتا ہے کہ:

''عجیب دنیا ہے یہ۔ مالک دولت سے اندھا ہو رہا ہے۔ لیڈر اپنا حصہ لے کر عیش کر رہا ہے۔ ٹھیکہ دار من مانی قیمت وصول کر کے لاکھوں میں کھیل رہے ہیں۔ دیگر عملہ رشوت کے روپیوں سے آسودہ حال ہے۔ صرف مزدور۔۔۔ بس صرف مزدور ہے جس کو نہ اپنے پسینے کی قیمت ملتی ہے اور نہ اپنے تھوکے ہوئے خون کا معاوضہ۔''

یہ عجیب دنیا ہی مابعد جدید دنیا ہے۔

افسانوں کی طرف آئیں تو بہت سے افسانہ نگاروں کے بے شمار افسانے اسی عجیب دنیا کی مختلف تصویریں پیش کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ جنہیں دیکھ کر اس دنیا کے رنگ و آہنگ زیادہ بہتر انداز میں واضح ہوتے ہیں۔ ان میں اگر حسن منظر کے افسانوں کا ذکر نہ کیا جائے تو زیادتی ہے۔

حسن منظر کے افسانے اور ناول اُس عالم گیریت کا اظہار یہ ہیں جسے گلوبلائزیشن کی اصل بنیاد بننا چاہیے تھا، مگر نہ بن سکی۔ حسن منظر اپنے افسانوں میں مختلف ثقافتوں اور سماجوں کو پس منظر بنا کر اور وہاں کے افراد کو اپنے کردار بنا کر مجموعی انسانی مسائل، انسانی خواہشات اور انسانی استحصال کا فسانہ سناتے ہیں، جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ باوجود مختلف ثقافتوں اور سماجوں کے کچھ انسانی درد اور تکالیف مشترک ہیں۔ وہ

بنیادی طور پر سب انسانوں کو ایک جیسا خیال کرتے ہیں اور یہی وہ تصور ہے جس پر گلوبلائزیشن کی بنیاد ہونی چاہیے لیکن اصل واقعہ یہ ہے کہ گلوبلائزیشن ملٹی نیشنل کمپنیوں کی مصنوعات کے استعمال تک تو سب کو ایک رنگ میں دیکھنا چاہتی ہے مگر حاکم اور محکوم، آجر اور مزدور، غالب اور مغلوب اور ظالم اور مظلوم کے درمیان کی تفریق مٹانے کو تیار نہیں۔ اسی لیے گلوبلائزیشن انسانیت کو فائدہ پہنچانے سے قاصر ہے۔

حسن منظر کے افسانوں میں مقامی تہذیب اور مغربی تہذیب کی کش مکش بھی دکھائی گئی ہے اور سفید فام اور سیاہ فام لوگوں کے درمیان تعصّبات بھی اجاگر کیے گئے ہیں جو آج کی اس مابعد جدید دنیا میں حیرت کا باعث ہیں، مگر ہیں۔

اُن کا افسانہ ''سفید آدمی کی دنیا'' افریقا کے پس منظر میں لکھا گیا افسانہ ہے اور اس میں حسن منظر نے اس بات کو موضوع بنایا ہے کہ سفید فام انسان کیسے ساری دنیا میں انسانی اقدار کی پامالی کر رہا ہے اور انسانوں کے استحصال سے اپنے سرمائے کے لیے انسانی خون کی کشید میں مصروف ہے۔ افسانے میں ایک سفید فام عورت اس لیے ریل کے ڈبے میں بیٹھنے سے انکار کر دیتی ہے کہ ڈبے میں ایک سیاہ فام لڑکا بھی سفر کر رہا ہے۔

حسن منظر کے افسانے ''بوندا باندی'' میں بھی افریقا کا ماحول ملتا ہے لیکن یہاں حسن منظر ہمیں مقامی لوگوں اور سفید فام لوگوں کے رویوں اور طرزِ عمل کا تقابل دکھاتے ہیں اور یہ بتاتے ہیں کہ مقامی لوگ اپنی مادی محرومیوں کے باوجود انسانی سطح پر زیادہ بہتر ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہا گیا ہے کہ مابعد جدید دور کی بڑھتی ہوئی بے پناہ مادی ترقی لوگوں کو بہتر انسان بنانے میں ناکام ہے۔ اور بین السطور یہ سوال خود بہ خود پیدا ہوتا ہے کہ آج کی دنیا کو مادی ترقی چاہیے یا بہتر انسان؟

مابعد جدید دنیا کا سب سے بڑا مسئلہ دہشت گردی اور تشدد سے متعلق ہے۔ نائن الیون کے بعد اس موضوع پر اُردو کے متعدد افسانہ نگاروں نے افسانے لکھے ہیں اور یہ سلسلہ ابھی جاری ہے۔ منشا یاد، رشید امجد، خالدہ حسین، محمود احمد قاضی، زاہدہ حنا، محمد حمید شاہد؛ غرض یہ کہ اس عہد کے ہر لکھنے والے نے کم و بیش اس موضوع پر اظہار کیا ہے۔ یہاں خالدہ حسین کے افسانے ''ابنِ آدم'' کا ذکر ضروری ہے جس میں انسانی تشدد اور تذلیل اپنی آخری حدوں کو چھوتی دکھائی گئی ہے۔

''ابنِ آدم'' نائن الیون کے حوالے سے لکھے گئے افسانوں میں ایک شاہ کار کی حیثیت رکھتا ہے۔ اپنے موضوع پر مرتکز رہنے اور اس قدر شدت سے تاثر کو ابھارنے میں اس افسانے کو واقعی کمال حاصل ہو گیا ہے۔ ابنِ آدم کی ایسی پُرسوز تصویر بہت کم دیکھنے کو ملے گی جو معاصر صورتِ حال کی اصلیت کو اس تلخی سے بیان کر سکے۔

افسانے کا بنیادی تھیم یہ ہے کہ تشدد اور انسانیت سوز سلوک کس طرح دہشت گردی کو فروغ دیتا ہے۔ اور بین السطور ایک سوال ہمارے سامنے رکھتا ہے کہ کیا انسانیت کی اس قدر تذلیل اور ایسا بہیمانہ تشدد دہشت گردی ختم کر سکتا ہے؟ کیا مہذب دنیا کے پاس اس کے علاوہ اور کوئی حل نہیں؟ یہاں خود کش بمبار جس پس منظر میں دکھائے گئے ہیں، وہ پس منظر ان کے لیے ہماری ہم دردی حاصل کر لیتا ہے۔ اور دہشت گردی کے خلاف لڑنے اور اسے ختم کرنے کی تگ و دو میں مصروف دہشت گردی کرنے والے ''ماہر'' ہماری تنقید کا نشانہ بنتے ہیں۔

مابعد جدید دنیا نے تاریخ کا بھی نیا تصور دیا ہے۔ کلاسیکی تاریخ میں محض بادشاہوں کے قصے اور شب و روز کے واقعات قلم بند کیے جاتے رہے ہیں لیکن اب یہ تصور بدل گیا ہے۔ تاریخ میں عام افراد کی اہمیت کو تسلیم کیا گیا ہے اور ثقافتی اور سماجی تاریخ میں عام افراد کی شمولیت

کو لازم ٹھہرایا گیا ہے۔ اُردو فکشن نے بھی اس تبدیلی کو قبول کیا ہے۔ پہلے ہمارے تاریخی ناولوں اور افسانوں میں بادشاہوں اور حاکموں کو ہی کہانی کا موضوع بنایا جاتا تھا مگر اب عام افراد کو مرکز میں لا کر تاریخی فکشن کو تخلیق کیا جا رہا ہے۔ اس کی ایک سب سے بڑی مثال اسد محمد خان کے افسانے ہیں۔

اسد محمد خان کے بیش تر افسانے شیر شاہ سوری اور اُس کے عہد کو بیان کرتے ہیں لیکن تاریخ کو بیان کرتے ہوئے وہ بادشاہوں سے زیادہ عام لوگوں کو اپنے افسانوں کا موضوع بناتے ہیں۔ اُن کے ہاں مزدور اور ہاتھ سے کام کرنے والے محروم اور پٹے ہوئے یا دوسرے لفظوں میں معاشرے کے دھتکارے ہوئے کردار زیادہ ہیں۔

اس ضمن میں اسد محمد خان کے دو افسانوں ''رگھو با اور تاریخ فرشتہ'' اور ''نربدا'' کا ذکر ضروری ہے۔ ''رگھو با اور تاریخ فرشتہ'' تین بھائیوں کی تاریخی کہانی ہے جو نچلے طبقے سے تعلق رکھتے ہیں لیکن ان میں سے دو بھائی اپنی ذہانت کو استعمال کرتے اور اسے چالاکی میں ڈھالتے ہوئے دنیاوی ترقی کے زینے طے کرتے چلے جاتے ہیں اور آگے بڑھ کر تاریخ فرشتہ میں اپنا نام لکھواتے ہیں لیکن ایک بھائی دنیاوی ترقی کے بجائے عام زندگی گزارنے کو بہتر جانتا ہے۔ یوں بباطن ایک بہت بڑا سوال ہمارے سامنے آتا ہے کہ آیا تاریخ کی کتابوں میں سازشوں کے جال بچھا کر اپنا نام لکھوانے میں اہمیت ہوتی ہے یا پھر ایک عام آدمی کی طرح زندگی گزارنے میں۔ شاید آخری بات درست ہے۔

''نربدا'' میں عام سورماؤں کی کہانی بیان کی گئی ہے۔ عام راجپوت جو دادِ شجاعت دیتے ہیں لیکن تاریخ کے اوراق ان سورماؤں کے تذکروں سے خالی ہیں۔ اسد محمد خان نے ان راجپوتی سورماؤں کی اہمیت کو اپنے افسانے کی بدولت اجاگر کرنے کی اپنی سی ایک کامیاب کوشش کی ہے۔

وقت کی کمی کی وجہ سے بہت سے ایسے ناولوں اور افسانوں کے ذکر سے صرفِ نظر کرنا پڑ رہا ہے جنہوں نے مابعد جدید دنیا کے اظہار میں اپنا اہم کردار ادا کیا۔ مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ اس کے باوجود ہمارے ہاں ابھی بھی مابعد جدید دنیا کے بارے میں فکشن میں لکھنے کی کافی گنجائش موجود ہے۔ یہاں بھی صرف ایک مثال پیش کر کے اپنی بات ختم کروں گا۔

مابعد جدید دنیا نے ایک اہم ادراک یہ بخشا ہے کہ اس دنیا اور زندگی میں سچائیاں ایک نہیں ہیں۔ ان کا اظہار مختلف پہلوؤں یا وسیلوں سے ہو سکتا ہے یا کیا جا سکتا ہے۔ اس ضمن میں نوبیل انعام یافتہ مصری عربی ناول نگار نجیب محفوظ کا نام لیا جا سکتا ہے جنہوں نے اپنے ایک معروف ناول جس کا ترجمہ اُردو زبان میں ''شادیانے'' کے عنوان سے ہوا ہے، متنوع سچائیوں کو کمال خوبی سے دکھایا ہے۔ اس ناول میں چار کردار اپنے اپنے زاویۂ نظر سے ایک ہی کہانی سناتے ہیں۔ کہانی ایک ہونے کے باوجود ہر کہانی کی سچائی مختلف ہے۔ یوں دکھایا گیا ہے کہ سچائیاں ایک نہیں ہوتیں۔ ہمارے ہاں ایسے تجربے ابھی واضح انداز میں سامنے نہیں آ سکے مگر امید ہے آگے چل کر اُردو فکشن میں مابعد جدید دنیا کے دیگر موضوعات بھی اپنی تمام تر گہرائیوں کے ساتھ جلوہ گر ہوں گے کہ ہمارے فکشن میں اس کی صلاحیت بدرجۂ اتم موجود ہے۔

☆☆☆☆

سوانح اور سوانح نگاری

حافظ اختر محمود

اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ اُردو گورنمنٹ زمیندار کالج گجرات

سوانح کا لفظ ''سانحہ'' کی جمع ہے جس کے معنیٰ روداد، احوال یا کیفیت ہے چنانچہ مجموعی طور پر اس کے معنی یہ ہوئے کہ کسی شخص کی زندگی کے احوال یا اس کی سرگزشت۔ اردو زبان و ادب میں اس لفظ ''سوانح'' سے اور اس کی مختلف اشکال سے واسطہ پڑتا رہتا ہے جیسے ''سوانح حیات''۔ اس کے مختلف معانی مراد لیے جاتے ہیں مثلاً حالاتِ زندگی، واقعاتِ زندگی، احوالِ زیست، وارداتِ حیات، سرگزشت، سر بیتی، آپ بیتی۔ بعینہ لفظ ''سوانح نگار'' یا ''سوانح نویس'' اس سے مراد ہم مجموعی طور پر سیرت نگار، وقائع نگار، حالات نویس کہتے ہیں۔ علی ہذالقیاس لفظ سوانح نگاری یا سوانح نویسی، اس کے معانی میں ندرتِ خیال بھی دیکھنے کو ملتی ہے یعنی سیرت نگاری، وقائع نگاری، حالات نویسی لفظ ''سوانح'' کے حوالے سے جو لفظ ''وقائع'' استعمال ہوا ہے اس کی بھی مختلف علمی صورتیں اور اشکال ہیں: یعنی وقائع کا معنیٰ: واقعات، حالات، حوادث، سانحات، خبریں، روداد، احوال، سوانح۔ اسی طرح اسی نہج پر لفظ وقائع نگار یا وقائع نویس کے معنیٰ ہوئے: مؤرخ، تاریخ نویس، نامہ نگار، صحیفہ نگار، صحافی۔ علیٰ ھذا القیاس لفظ وقائع نگاری یا وقائع نویسی کا معنیٰ ہوا تاریخ نویسی، واقعات نویسی، نامہ نگاری، صحیفہ نگاری، اخبار نویسی، صحافت۔ انگریزی زبان و ادب میں اس کے مساوی لفظ (Biography) بولا جاتا ہے۔ سوال ذہن میں ابھرتا ہے کہ (Biography) اور (Autobiography) میں کیا فرق ہے؟ ڈاکٹر سہیل احمد خاں لکھتے ہیں:

> ''کسی فرد کی زندگی کا احوال جسے کوئی دوسرا قلم بند کرے۔ سوانح نویس کو جس مواد کی ضرورت ہوتی ہے وہ حسب ذیل ہے: اگر کسی ادیب یا شاعر کے سوانح لکھنا مقصود ہے تو اس کی جملہ تصانیف، اگر وہ روزنامچہ لکھتا رہا ہو تو اس سے بہت مدد مل سکتی ہے، خطوط جو اس نے لکھے ہوں یا اسے لکھے گئے ہوں۔ روزمرہ کی چھوٹی موٹی باتیں جن کا ذکر کاپیوں یا نوٹ بکوں میں مل جائے۔ اگر وہ سرکاری ملازم رہ چکا ہو تو اس کی ملازمت کا ریکارڈ اور اسی قسم کی دوسری دستاویزات، دوستوں اور واقف کاروں کی یادداشتیں، ان لوگوں کے انٹرویو جو اس کے جاننے والے ہوں، بیوی بچوں سے ملاقاتیں۔ اگر سوانح نویس اس شاعر یا ادیب سے ذاتی طور پر واقف ہو تو اس کے اپنے تاثرات اور معلومات۔ لیکن اگر کسی ایسے شخص کے سوانح لکھنے کا ارادہ ہو جسے فوت ہوئے کم و بیش سو یا سو سے زیادہ برس گزر چکے ہوں تو صرف مطبوعہ یا غیر مطبوعہ مواد کو سامنے رکھنا پڑے گا''۔(۱)

مغربی ادب میں سوانح نویسی کو بطور صنفِ ادب سترھویں صدی کے نصف آخر میں مقبولیت حاصل ہوئی۔ فی زمانہ یہ مقبول ترین ادبی اصناف میں سے ہے اور بڑے ضخیم سوانح تواتر سے شائع ہو رہے ہیں۔

اردو ادب میں چند سوانح موجود ہیں۔ بالعموم سوانح لکھنے کا رواج نہیں۔ درحقیقت اردو شعرا اور ادباء کے سوانح لکھنا ممکن بھی نہیں کیونکہ ہمارے یہاں خطوط، روزنامچے، دستاویزات وغیرہ کو محفوظ رکھنے کا تکلف نہیں کیا جاتا۔ ڈاکٹر سہیل احمد خان سوانح اور آپ بیتی کے بارے میں یہ خیال ظاہر کرتے ہیں:

"اپنی زندگی کا احوال آپ قلم بند کرنے کا عمل خودسوانح ہے۔ سیدھے لفظوں میں اسے آپ بیتی کہہ لیجیے۔ سمجھا یہ جاتا ہے کہ فرد اپنی زندگی کے واقعات کو سب سے بہتر اور مستند طور پر قلم بند کر سکتا ہے۔ اپنے بارے میں جتنا کچھ اسے معلوم ہوتا ہے وہ کسی دوسرے کے لیے ممکن نہیں۔ تاہم خودسوانح جات کو پڑھ کر اس بات پر یقین لانا مشکل ہوجاتا ہے بیشتر حضرات اپنی زندگی کے حالات بڑھاپے میں قلم بند کرتے ہیں اور اس وقت تک ان کا حافظہ، استثنائی صورتوں کو چھوڑ کر صحیح سلامت نہیں رہتا۔ اس سے بھی بڑی قباحت یہ ہے کہ کسی آدمی میں جرأت نہیں ہوتی یا وہ ضروری نہیں سمجھتا کہ سب کچھ رقم کر دے۔ لکھنے والے عموماً بہت کچھ چھپانا چاہتے ہیں۔ حقائق کو توڑ مروڑ کر بیان کرتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ ان کی ایسی امیج قارئین کے سامنے آئے جو باوقار یا متاثر کن ہو۔ یہ ضروری نہیں کہ وہ خود کو پارسا بنا کر پیش کریں۔ بعض حضرات خود کو مجسم شر نہ سہی، عاشق مزاج اور عیش و عشرت کا دلدادہ ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ بیشتر ناقدین کو اس بات پر اتفاق ہے کہ آپ بیتیاں بڑی حد تک فکشن ہوتی ہیں اور افسانوی تار و پو سے حقائق کو الگ کرنا مشکل کام ہے۔ اردو میں میر تقی میرؔ کو اولین خودسوانح نویس ہونے کا شرف حاصل ہے۔ یہ بجا کہ ان کی کتاب فارسی میں ہے لیکن ان کی شاعرانہ عظمت کا دار و مدار اردو کلام ہی پر ہے"۔(۲)

بادی النظر میں اگر اردو ادب کا مطالعہ کیا جائے تو ہمیں بنیادی طور پر ادرد ادب کی دو اقسام پڑھنے کو ملتی ہیں۔

افسانوی ادب (Fiction)	غیر افسانوی ادب (Non Fiction)
۱۔ داستان	۱۔ سوانح عمری
۲۔ ناول	۲۔ آپ بیتی
۳۔ افسانہ	۳۔ خاکہ
۴۔ ڈراما	۴۔ سفرنامہ
	۵۔ مکتوب نگاری
	۶۔ طنزومزاح
	۷۔ مضمون

سوانح نگار کسی شخص کی ولادت سے وفات تک کے حالات چوں کہ بالتفصیل اور بالصراحت بیان کرتا ہے اس لیے لازم آتا ہے کہ وہ اپنے موضوع سے کما حقہٗ آگاہی رکھے اور جس شخص کی وہ سوانح عمری مرتب کر رہا ہو اس کے ساتھ قریبی موانست رہی ہو یا اس شخص کا مطالعہ اس طرح کیا ہو کہ اس کی زندگی کا کوئی کونہ بھی مخفی (پوشیدہ) نہ رہ گیا ہو۔

سوانح نگاری ایک فن ہے۔ اس کو نازک فن سے بھی موسوم کیا جا سکتا ہے اور قدرے مشکل بھی تصور کیا جا سکتا ہے۔ نازک اس لحاظ سے کہ معمولی سی کوتاہی سے دنیا اندھیر ہوسکتی ہے۔ میانہ روی کا دامن ہاتھ سے چھوٹ جائے تو انسان دوسروں کی دل آزادی کا باعث بن جاتا ہے اور انسان ظالم اور جاہل متصور ہوتا ہے۔ اگر کوئی بات غلط درج ہوجائے تو انسان پر تہمت بھی لگ سکتی ہے اور انسان کو موردِ الزام بھی ٹھہرایا جا سکتا ہے اور اگر سوانح نگار مبالغہ یعنی غلوّ سے کام لے یا خوشامد کے ذریعے اپنے مقصد کو بیان کرے تو اس ضمن میں قلم اور صاحبِ قلم دونوں زمرہء کذب میں داخل ہوجاتے ہیں اور ان کا قابلِ اعتبار و وقار اور تمکنت ہمیشہ کے لیے داغِ مفارقت دے جاتے ہیں اور انسان جلد ہی

ناقابلِ اعتبار مقام پر پہنچ جاتا ہے اور انسان دنیا اور اہلِ دنیا کی نظر دونوں کے سامنے بے توقیر اور بے عزت سمجھا جاتا ہے۔ اگر مصنف یا صاحبِ قلم کسی غلط فہمی کا شکار ہو جائے تو ایک طوفان کھڑا ہو جاتا ہے اور اگر قاری شکوک وشبہات میں مبتلا ہو جائے تو یہ چیز وبالِ جان بن جاتی ہے اور اگر خوش فہمی کا رنگ غالب آ جائے یا خوش عقیدگی میں گرفتار ہو جائیں تو دنیا استہزاء اور ٹھٹھہ کرتی ہے۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ فنِ سوانح نگاری ایک معلومات افزا اور طرب آمیز کام بھی ہے۔ سوانح نگار اپنے تحقیقی کام کے ضمن میں لاتعداد کتابوں کی ورق گردانی کرتا ہے۔ اس تگ وتاز میں وہ مصادر ومراجع تلاش کرتا ہے۔ اس کام میں اس پر علوم کے کئی عقدے وا ہوتے ہیں اور وہ اپنے دامن میں علم کے بیش بہا موتی بھر لیتا ہے۔ اپنے ذہن رسا کو علم کے موتیوں سے مستفید کرتا ہے اور جسم کو علوم کی فراوانی سے سکون بخشتا ہے اور اپنے روح کو تازگی، دلکشی اور رعنائی عطا کرتا ہے۔ چونکہ سوانح نگاری ایک ایسا فن ہے اور ہر آدمی فن کے اوجِ کمال تک نہیں پہنچتا یعنی ہر آدمی فن کی باریکیوں سے واقف نہیں ہوتا البتہ کوشش، سعی وعمل کی دنیا ایک وسیع دنیا ہے۔

آزمائش کی دنیا بہت وسیع ہے اس لیے آزمائش کی دنیا میں شناوری کرنا ہر ذی روح اور ذوی العقول کا پیدائشی حق ہے۔ اولیا کرام اور مقبولانِ بارگاہ صمدیت کی سوانح عمری لکھنا تو ایک سعادت کی بات ہے۔ بلاشبہ سوانح نگاری ایک نازک، مشکل اور دلچسپ کام ہے۔ ذمہ داری کا کام ہے۔ ایک انسان عمیق نظروں سے کسی دوسرے باکمال انسان کی زندگی کا مطالعہ کرتا ہے اور پھر اس کے محاسن ومحامد کا تذکرہ دلنشیں الفاظ میں بیان کرتا ہے۔ ڈاکٹر ظہور احمد اظہر لکھتے ہیں:

> ''سوانح نگاری جیسے اعلیٰ وارفع کام کے لیے ایک انسان کو عہدہ برآ ہونے کے لیے بہت سی شرائط کو پورا کرنا لازمی متصور کیا جاتا ہے۔ ان شرائط میں پانچ نہایت ضروری ہیں''۔
>
> ۱۔ صداقت یعنی ہر قدم اور ہر موڑ پر کسی حال میں بھی سچائی کا دامن نہ چھوڑے۔
>
> ۲۔ امانت یعنی ہر بات، ہر بیان اور ہر مسئلہ میں دیانت داری اور امانت کو ہر حال میں ملحوظ رکھا جائے۔
>
> ۳۔ محنت، علم اور معرفت کی دنیا میں شمع کی طرح پگھلنا پڑتا ہے۔ جو لوگ علم ومعرفت کی دنیا میں محنت اور مشقت سے پہلو تہی کرتے ہیں انھیں اس دنیا سے نکل آنا چاہیے۔
>
> ۴۔ ہمدردی، جس شخصیت کی سوانح عمری لکھنا مقصود ہے اس کے ساتھ قلم اور صاحبِ قلم کو پوری پوری ہمدردی ہونا چاہیے۔
>
> ۵۔ عدل، عدل وانصاف ہر جگہ اور ہر لحظہ درکار ہے مگر سوانح نگاری میں تو اس صفت سے ہرگز عاری نہیں ہونا چاہیے''۔ (۳)

اگر سوانح نگار کا تعلق کسی دینی اور روحانی شخصیت سے ہو تو پھر اس کی جواب دہی میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ وہ اس بات کا ضامن ہو جاتا ہے کہ جو تحریر اس نے لکھی ہے اس کی تمام تر ذمہ داری قبول کرے۔ ایک سوانح نگار کو اپنے کارِ منصبی کا ادراک کامل ہونا چاہیے۔ اس کو اپنے کارِ معوضہ کا احساس ہونا چاہیے۔ ایک سوانح نگار کو فرض شناسی کے ساتھ تفویض کردہ فرائض ادا کرنے چاہییں۔ فی الجملہ یہ بات اظہر من الشّمس ہے کہ ایک سوانح نگار کو احساسِ فرض بجالانے میں حددرجہ معتبر، قابلِ اعتبار، جواب دہ، وعدہ کنندہ، پیمان گر اور باوفا ہونا چاہیے۔

حوالہ جات

۱۔ سہیل احمد خاں، ڈاکٹر، منتخب ادبی اصطلاحات، لاہور: شعبہ اردو، گورنمنٹ کالج لاہور، ص. ۴۴

۲۔ ایضاً، ص. ۴۶

۳۔ اظہر، ظہور احمد، ڈاکٹر، شیخ ابو الفضل ختلی، لاہور: پنجاب یونیورسٹی، ص ۲

انیس ناگی : شخصیت اورفن

ملیحہ چودھری

صدر شعبہ اردو، UOG مرغزار کالج گجرات

ڈاکٹر شاہین مفتی نے اکادمی ادبیات پاکستان کے اشاعتی منصوبے ''پاکستانی ادب کے معمار'' کے سلسلے کی کتاب ''انیس ناگی : شخصیت اورفن''، تحریر کی ہے۔ اس کتاب کی اہمیت تحقیق اور تنقید دو طرح سے ہے۔ میرا عنوان تنقید سے متعلقہ ہے اس لئے میں ڈاکٹر شاہین مفتی کی تنقید پر توجہ دوں گی۔

اس کتاب کا پہلا مضمون ''میری سرگزشت'' کے نام سے ہے۔ ڈاکٹر شاہین مفتی نے انیس ناگی کی خودنوشت سوانح عمری ''ایک ادھوری سرگزشت'' سے ناگی صاحب کے حالات زندگی نقل کیے ہیں اور ناگی صاحب کی زندگی کے بہت سے گوشوں سے آگاہ کیا ہے۔ دوسرا مضمون ''انیس ناگی کی تصانیف'' کے نام سے انیس ناگی کی تصانیف کی فہرست بنائی ہے۔''

''صورت حال کی نظم نگاری'' کے عنوان سے انیس ناگی کے کلیات ''بیگانگی کی نظمیں'' منتخب کی گئی ہیں۔ اس مضمون میں ڈاکٹر شاہین مفتی انیس ناگی کی نظموں کے بارے میں اس طرح سے خامہ فرسائی کرتی ہیں:

''ان کے نزدیک نئی شاعری کی دریافت اس کا تصوراتی اور جذباتی لہجہ ایک مخصوص تاریخی اور تمدنی سیاق وسباق سے ماخوذ ہے۔ ۱۹۴۷ء کے فوراً بعد کی منظومات میں جس جذباتی اضمحلال اور ذہنی افسردگی کا احساس ملتا ہے وہ پرانے ثقافتی اثاثے سے علیحدگی کا ناسٹیلجیا ہے۔ ۱۹۳۶ء کی ترقی پسند تحریک نئی تقسیم کے باعث بے وجود ہوگئی اور جذباتی اسلوب کا طریق کار بے معنی ہوگیا، تصورات بھی زندہ آدمی کی طرح موت سے پہلے تسلسل اور بقاء چاہتے ہیں لیکن نئے عہد میں یہ تصورات مر گئے۔ ن۔م۔ راشد فیض احمد فیض اور مختار صدیقی کے ہاں کشمکش کے باعث زندگی اور موت دست گریباں دکھائی دیتی ہے۔ یہیں راشد مرگِ اسرافیل پر آنسو بہانے کی ذہنی اذیت سے گزر رہے ہیں۔ لیکن ان کے ہاں فرد کا تصور کائناتی استعارہ نہیں بن پایا۔''[۱]

''بشارت کی رات''، ۱۹۶۶ء میں شائع ہوئی۔ یہ انیس ناگی کی شاعری کا پہلا مجموعہ ہے۔ نئی شاعری پر تنقید کرتے ہوئے ڈاکٹر شاہین مفتی موضوع کو ایک خاص اہمیت دیتی ہیں۔ اس ضمن میں شاہین مفتی کی تحریر ملاحظہ فرمائیے:

''اس عہد کے مارشل لاء کا تشدد، فرد کی آزادی اور اس کی زندگی کی توڑ پھوڑ شاعر کا خاص موضوع ہے۔ جسے بیان کرتے ہوئے شاعر کا غصہ اور ہیجان کئی رنگ بدلتا ہے۔''[۲]

یہ نظمیں ۱۹۶۵ء اور اس کے بعد کے زمانے کا احاطہ کرتی ہیں۔ انیس ناگی کی اولین کتاب میں ہذیان کی ایک خاص کیفیت ہے۔ فنی حوالے سے تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر شاہین مفتی اس طرح خامہ فرسائی کرتی ہیں:

''صنعتی دور اور اس کی مصیبتوں سے جڑی یہ شاعری اس مادی زندگی کے خلاف احتجاج ہے جس نے انسانوں کو تنہا اور بے مقصد بنا دیا ہے۔ انیس ناگی نے نئے منظر نامے سے نئی معنویت پیدا کرنے کے لئے نئے تلازمے بھی استعمال کیے ہیں۔ منطقی اور استدلالی انداز میں رنگی

ہوئی یہ نظمیں افسوس اور لا حاصلی کی ایک مستقل مثال ہیں۔''۳؎

''غیر ممنوعہ نظمیں'' کے نام سے انیس ناگی کے شعری مجموعے کے بارے میں لکھا ہے۔ اس مجموعے کے بارے میں شاہین مفتی اس طرح لکھتی ہیں:

''اس کتاب کا سنِ اشاعت ''مجموعہ بیگانگی کی نظمیں'' میں ۱۹۷۴ء لکھا گیا ہے جبکہ بقول سلیم شہزاد انیس ناگی کا دوسرا شعری مجموعہ غیر ممنوعہ نظمیں ۶۸۔۱۹۶۷ء میں شائع ہوا۔ یہ مجموعہ اس نے اپنے ہاتھ سے لکھ کر شائع کیا جو اس اعتبار سے ایک اہم کتاب ہے کیونکہ اس زمانے میں نئی شاعری کی اشاعت ایک مشکل مرحلہ تھا، کوئی ناشر نئے شاعر کی کتاب کی اشاعت کا رسک لینے کو تیار نہیں تھا۔''۴؎

اس مجموعہ کی نظموں کے موضوعات کے بارے میں شاہین مفتی کے الفاظ ملاحظہ فرمائیے:

''غیر ممنوعہ نظمیں'' شہر کے تناظر کو اس منافقانہ رویوں، طبقاتی تقسیم، عدم انصاف اور مذہبی سطحیت کے ساتھ قبول کرتے ہوئے اس ہزیمت اور محرومی کی آب و ہوا کا بھی احاطہ کرتی ہیں جو انسانی رشتوں کی ہمت کی تصویر ہے، یہیں انفرادیت پسندی کا شدید رویہ اپنے لیے نئے کارزار تلاش کرتا دکھائی دیتا ہے، اجتماعی زندگی کی ملغوبہ تنہائی اور خارجی ماحول کی اکتا دینے والی مانوسیت اس مجموعے کی نظموں کو اجنبیت کے نئے مواد میں داخل کرتی ہیں۔ ان نظموں میں تلخی کا ذائقہ ہلکی سی کرواہٹ میں تبدیل ہوا ہے۔ انیس ناگی چونکہ دوران ملازمت مختلف علاقوں کا سفر کرتے رہے اس لیے نظموں کے منظر نامے مختلف اوقات کی مختلف تصاویر پیش کرتے ہیں۔''۵؎

''نوحے'' یہ مجموعہ ۱۹۷۶ء میں شائع ہوا۔ اس مجموعہ میں نو آبادیاتی نظام حیات کی تصویریں نظر آتی ہیں۔ ڈاکٹر شاہین مفتی اس مجموعے پر اس طرح تنقید کرتی ہیں:

''نوحے'' نوآبادیاتی نظام حیات کی تصویروں سے معرض وجود میں آئے ہیں۔ ان نظموں کا پیرایۂ اظہار طویل گفتگو اور ارشادات سے مرتب ہو کر قاری تک پہنچتا ہے۔ اس کتاب کا شاعر ہمیشہ سے طبقاتی تقسیم اور طبقاتی شعور کا جبر سہتا رہتا ہے لیکن یہ جبر صرف ذاتی یا گروہی نہیں بلکہ وسیع پیمانے پر اسے تاریخ کے جبر سے جوڑا جا سکتا ہے۔''۶؎

''زرد آسمان'' کے نام سے انیس ناگی کی کتاب یعنی شعری مجموعہ ہے۔ اس کتاب کا سن اشاعت ۱۹۷۹ء ہے۔ اس مجموعے کے بارے میں شاہین مفتی اس طرح لکھتی ہیں:

''اس شاعری کا عصری منظر نامہ ایک جانب تو لاتعلیمی اور عدم وجودیت سے بندھا ہوا ہے اور دوسری طرف اس میں ہم پاکستانی سیاست کے کئی خدوخال دیکھ سکتے ہیں۔''۷؎

''روشنیاں'' کے نام سے شاعری کا مجموعہ ۱۹۴۸ء میں شائع ہوا۔ اس کے بارے میں ڈاکٹر شاہین مفتی یوں قلمبند کرتی ہیں:

''یہ کتاب ۱۹۴۸ء میں منصۂ شہود پر آئی۔ دراصل اس کتاب میں فرد کے اضطراب اور اضطراب کے محرکات کو شاعری کا موضوع بنایا گیا ہے۔ جسمانی، نفسیاتی اور انسانی معاملات ایک دوسرے میں اس طرح کھو گئے ہیں کہ فرد کی ذات مرکب العناصر ہو کر ایک لامتناہی وحدت میں ڈھل گئی ہے۔''۸؎

''بے خوابی کی نظمیں'' کے نام سے ۱۹۸۷ء میں ناگی صاحب کی شاعری کا مجموعہ شائع ہوا۔ اس کے بارے میں شاہین مفتی اس طرح رقم طراز

ہیں:

''یہ کتاب جمالیات نے ۱۹۸۷ء میں شائع کی۔ کتاب کی بیشتر نظمیں تین طرح کے احساسات کو اجاگر کرتی ہیں۔ ایک احساس تو صنعتی نظام کی تیز رفتاری سے ابھرا ہے جہاں ہر سمت دھول اڑاتی ہوا کائنات کی ہر شے پر قدم رکھتی ہوئی تیزی سے سفر کر رہی ہے اور انسانی قدم اور انسانی وقت کائناتی گردشوں کا مقابلہ کرنے کے قابل نہیں، دوسرا احساس پرانے لفظوں کی گمشدگی اور نئے الفاظ کی تلاش اور انتخاب ہے۔ تیسرا احساس صبر وسکون کی عدم موجودگی۔''۹؎

''آگ ہی آگ'' یہ کتاب ۱۹۸۹ء میں شائع ہوئی۔ اس کتاب کے بارے میں ڈاکٹر شاہین مفتی اس طرح لکھتی ہیں:

''اس کتاب میں اپنی سرگذشت کی طرح شاعر کو کتابی شعر بھی دکھ درد، ہزیمت اور شکستہ آرزوؤں کے خوف سے بوجھل دکھائی دیتی ہے۔''۱۰؎

''ابھی کچھ اور'' انیس ناگی کا شعری مجموعہ ہے۔ ۱۹۹۰ء یہ مجموعہ شائع ہوا۔ اس کے بارے میں ڈاکٹر شاہین مفتی کی یہ رائے دیکھیے:

''اس کتاب کو ۱۹۹۰ء میں جمالیات نے شائع کیا۔ اس کتاب میں شاعر کے تجربے ایک خاص رجحان کی سمت اشارہ دیتے ہیں۔ ہم اس رجحان کو جمود اور سکوت کے ساتھ ساتھ تجربے کی تکرار کا نام بھی دے سکتے ہیں۔ ان نظموں میں شاعری کے زیادہ تر امیجز آسمان، چھت اور دریچوں سے وابستہ ہیں۔''۱۱؎

''بے خیالی میں'' انیس ناگی کی نظموں کا مجموعہ ہے۔ اس کے بارے میں ڈاکٹر شاہین مفتی انیس ناگی کا نظریہ پیش کرتی ہیں۔ وہ نظریہ آپ بھی ملاحظہ فرمائیے:

''اکتیس نظموں کا یہ مجموعہ ۱۹۹۲ء میں جمالیات نے شائع کیا۔ شاعر نے اپنی اس کتاب کے دیباچے میں لکھا۔ بے خیالی میں میرا نواں شعری مجموعہ ہے، ایک مخالفانہ شعری روایت میں آزاد نظم یا نثری نظم لکھنا ایک طرح کا جہاد ہے، جہاد خواہ ذات کے اندر کا ہو یا باہر، یہ شاعری کے فروغ کے لئے ضروری ہے۔ میں اپنی نظموں کا خود ہی دیباچہ نہیں لکھنا چاہتا کہ مبہم اور مرصع قسم کی نظم لکھ کر اپنے قارئین کے لئے ان نظموں کے افہام کا در بند کر دو، ہر نظم بذات خود ایک وضاحت ہوتی ہے اس سیاق وسباق کی جس سے وہ جنم لیتی ہے۔ ہر موقف اپنی وضاحت چاہتا ہے۔ ہر شاعر نے اپنا عصری موقف خود متعین کرنا ہے بصورت دیگر اس کی شاعری نجی واردات بن کر رہ جاتی ہے۔ چنانچہ ضروری ہے کہ شاعر اپنے موقف کو اس عصریت سے اخذ کرے جس سے وہ شعری ابہام لیتا ہے۔''۱۲؎

''بیابانی کا دن'' یہ مجموعہ ۱۹۹۴ء میں شائع ہوا۔ اس مجموعے کے بارے میں ڈاکٹر شاہین مفتی اس طرح لکھتی ہیں:

''نئی بین الاقوامیت کی تلاش میں نکلنے والا یہ جدید شاعر جو مروجہ اقدار سے ذہنی بغاوت کا دعویدار ہے، اپنے جذبات اور نفسیات میں انسانی اقدار کی ہمہ وقت تجریدیت کے باوجود اپنی شاعری میں شخصی عدم توجہی اور اجتماعی طاقت کی جبریت کا شکار ہے۔ اس نے اپنی سرگذشت میں اور اپنی شاعری میں نیوراسس کے کافی اشارے دیئے ہیں۔ اس اعصابیت کے نئے مرحلے میں اسے ہر چیز اداس، ویران، بے ذائقہ، کڑوی، کسیلی اور بے معنی نظر آتی ہے۔''۱۳؎

''صداؤں کا جہاں'' بھی انیس ناگی کی شاعری کا مجموعہ ہے۔ یہ مجموعہ بھی جمالیات سے ۱۹۹۵ء میں شائع ہوا۔ اس مجموعہ پر ڈاکٹر

شاہین مفتی اس طرح خامہ فرسائی کرتی ہیں:

''انیس ناگی کی جزئیات نگاری اور باریک بینی کی داد دینی پڑے گی کہ وہ مذہب اور معیشت کے درمیانی فاصلے کو صرف جذبات کے خالی پن سے بھرتے ہوئے معاشرے کو کس طرح بیان کرتے ہیں کیونکہ وہ جانتے ہیں انسانوں کا سب سے بڑا مسئلہ روٹی ہے، اس کے لئے کاروبار زندگی چلایا جاتا ہے، دفتروں میں احمقوں حاکموں کی باتیں سنی جاتی ہیں۔ اس منافق اور متضاد نظریات سے سجی ہوئی زندگی میں لوگ چاہتے ہیں سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر کسی ایسی بستی میں نکل جائیں جو معمولات سے مختلف ہو کیونکہ یہ دُنیا اسی کی ہے جو اسے اُٹھا لے۔''۱۴؎

''درخت میرے وجود کا'' شاعری کا یہ مجموعہ ۱۹۹۷ء میں شائع ہوا۔ اس مجموعہ کے بارے میں ڈاکٹر شاہین مفتی اس طرح رقم طراز ہیں:

''درخت میرے وجود کا'' میں کچھ نظمیں شہر لاہور کی صنعتی تبدیلی کے ساتھ ساتھ بہت زیادہ آبادی کے بارے میں احتجاج ہیں۔ شہر کے بدل جانے اور آدمیت کے راستے سے بھٹک جانے کے باعث شاعر ایک طویل متلی میں مبتلا ہے اور غلاظت اور کثافت سے بھی نجات چاہتا ہے اور منافع خوروں سے بھی۔''۱۵؎

''بیگانگی کی نظمیں'' یہ مجموعہ ۲۰۰۰ء میں طبع ہوا۔ اس کے بارے میں ڈاکٹر شاہین مفتی کے الفاظ ملاحظہ ہوں:

''یہ مجموعہ ۲۰۰۰ء میں شائع ہوا۔ اسے بھی جمالیات نے شائع کیا۔ بیگانگی کی بنیادی اصطلاح انیس ناگی کی وجودیت پسندی کا اک اور منہ بولتا ثبوت ہے، کتاب کی پہلی نظم تنہائی اور اس کی مسرت اور لذت سے شروع ہوتی ہے۔''۱۶؎

''جنم ایک آندھی'' انیس ناگی کا شعری مجموعہ ہے۔ اس مجموعے کے بارے میں ڈاکٹر شاہین مفتی اس طرح لکھتی ہیں:

''یہ کتاب ۲۰۰۷ء میں جمالیات نے شائع کی۔ اس مختصر مجموعے کی نظمیں زیادہ طویل نہیں، ان کی کرافٹ بھی کم وبیش وہی ہے جو انیس ناگی کی پہلی شاعری کی کتابوں میں استعمال کی گئی ہے، ان نظموں کے بارے میں ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے لکھا ہے کہ انیس ناگی نظمیں ذات کے اندر اور ذات کے باہر کے بحران کا اظہار کرتی ہیں اندر اور باہر کی دُنیائیں اس کے لیے نامکمل ہیں اور ان دُنیاؤں کے درمیان معلق رات بالآخر بے معنویت کی تاج پوشی سے محفوظ ہو کر ایک مضحک معنویت کا اعلان کرتی ہے۔''۱۷؎

ڈاکٹر شاہین مفتی انیس ناگی کی ناول نگاری پر لکھتے ہوئے سب سے پہلے انیس ناگی بطور ناول کے نقاد کے طور پر ان کی چند آراء درج کرتی ہیں کہ انیس کس قسم کے ناول کو بہتر قرار دیتے ہیں۔ اس کے بعد شاہین مفتی نے انیس ناگی کی ناول نگاری پر تنقید فرداً فرداً ناول پر کی ہے۔ ''دیوار کے پیچھے'' ۱۹۸۰ء میں شائع ہوا۔ ڈاکٹر شاہین مفتی نے ناول کی مختصر کہانی بیان کی ہے اور ساتھ ساتھ کہیں کہیں اس پر تنقید بھی کی گئی ہے۔ ڈاکٹر شاہین مفتی کی رائے ملاحظہ فرمائیے:

''۱۹۸۰ء کی دہائی میں انیس ناگی کا یہ ناول بے حد مقبول اور انوکھا ناول قرار دیا گیا، ناول کی تفصیلات کو اگر انیس ناگی کی سرگذشت کے ساتھ ملا کر پڑھا جائے تو اس میں ایسی کئی باتیں اور واقعات موجود ہیں جنہیں انیس ناگی نے آپ بیتی کے طور پر بیان کیا ہے، اس طرح مصنف کی ذاتی موجودگی اس ناول نگاری کو حقیقت پسندی کی خاص خوبی عطا کرتی ہے جس سے تحلیل نفسی کا عمل مزید دلچسپ ہو جاتا ہے۔ ناول کی زبان آسان بیان مبہم ہے۔ بعض معاملات کی تکرار، مصنف کی ذہنی صورت حال کی خاص جہت کی جانب اشارہ دیتی ہے۔''۱۸؎

''میں اور وہ'' ۱۹۸۳ء میں شائع ہوا۔ اس کے بارے میں ڈاکٹر شاہین مفتی اس طرح خامہ فرسائی کرتی ہیں:

''انیس ناگی کے یکے بعد دیگرے دو ناول مصنف کے وجودی نظریات کی ارتقائی صورت بنے، اسی اثنا میں انتظار حسین کا بستی، عبداللہ حسین کا باگھ، فہیم اعظمی کا جنم کنڈلی اور بانو قدسیہ کا ناول راجہ گدھ بھی شائع ہوئے، عمومی رائے میں ''راجہ گدھ'' باقی ناولوں پر مقبولیت اور کرافٹ کے اعتبار سے بھاری رہا، تاہم انہیں ناگی کا دوسرا ناول پہلے جیسے ناول کی شہرت حاصل نہ کرسکا، اسے چھوٹے کینوس کے ناول کا درجہ ملا، اس کا ہیرو کم وبیش اسی نفسیاتی عارضے میں مبتلا تھا جس سے ''دیوار کے پیچھے'' کا پروفیسر دوچار رہا۔''۱۹؎

''زوال'' یہ ناگی صاحب کا تیسرا ناول ہے۔ یہ ۱۸۸۹ء میں شائع ہوا۔ یہ اس ناول کی ایک کہانی بیوروکریٹ احسن کے گرد گھومتی ہے۔

''ایک گرم موسم کی کہانی'' ۱۹۹۰ء میں شائع ہوا۔ اس ناول کے بارے میں ڈاکٹر شاہین مفتی انیس ناگی کی اس ناول کے بارے میں رائے درج کرتی ہیں:

''انیس ناگی کا کہنا ہے کہ یہ ناول ان دنوں کی تصنیف ہے جب وہ پنجاب آرکائیوز کے ڈائریکٹر تھے، ۱۸۵۷ء کے تناظر میں اس سے پہلے اس قسم کے تاریخی شواہد سے مزین ناول نہیں لکھا گیا۔''۲۰؎

''ایک لمحہ سوچ'' کا یہ ناول ۱۹۹۱ء میں شائع ہوا۔ یہ مختصر ناول ہے اور اسکی کہانی بھی ایک گرم موسم کی کہانی کے سلسلے سے منسلک ہے۔ اس کے بارے میں ڈاکٹر شاہین مفتی کی رائے ملاحظہ فرمائیے:

''اس ناولٹ کی اندرونی کہانی دلی کے زوال سے متعلق ہے۔ انیس ناگی یہاں بادشاہ کی نفسیاتی محرومیوں کی طرف اشارہ دیتے ہیں جو عمر رسیدہ ہونے کے باعث زینت محل کے ہاتھوں کھلونا بن گیا۔''۲۱؎

''محاصرہ'' ناول ۱۹۹۲ء میں شائع ہوا۔ اس کے بارے میں ڈاکٹر شاہین مفتی لکھتی ہیں کہ:

''محاصرہ'' کی کرداری ساخت ''خدا کی بستی'' کے کرداروں جیسی ہے لیکن بنیادی کردار سلیم کی موجودگی اس ناول کو مختلف بنا دیتی ہے۔''۲۲؎

''قلعہ'' ناول ۱۹۹۴ء میں شائع ہوا۔

۱۹۹۵ء میں ''چوہوں کی کہانی'' کے نام سے ناول شائع ہوا۔ اس کے بارے میں ڈاکٹر شاہین مفتی لکھتی ہیں کہ:

''یہ ناول تیسری دنیا کے معاشرتی نظام کا ایک المیہ ہے جہاں لوگ بے سمجھی کی طرف دوڑے چلے جا رہے ہیں۔ طاعون کا نفسیاتی چوہا آہستہ آہستہ انسانی زندگی اور اس کے تعلقات کی کتاب کُتر رہا ہے۔" ۲۳؎

1998ء میں شائع ہونے والے ناول "کیمپ" کے بارے میں شاہین مفتی کا کہنا ہے:

"افغان مہاجرین کے بارے میں کم از کم اردو ادب میں اس سے بہتر ناول نہیں لکھا گیا۔" ۲۴؎

2003ء میں" پتلیاں" شائع ہوا جس کو شاہین وجودی احساسات کے لئے خاص اہمیت کا ناول قرار دیتی ہیں۔

"ناراض عورتیں" ناول کو شاہین کئی لحاظ سے کمزور ناول کہتی ہیں اور 2007ء میں شائع ہونے والے ناول "بریگیڈ" کے بارے میں ان کا کہنا ہے کہ:

"شاید اس موضوع پر یہ پہلا ناول جس میں بغیر کسی تعصب کے دہشت گردی کی وجوہات پر غور کیا گیا ہے۔ ناول میں انسانی

موجودگی، دہشت گردی کے جواز، پاکستانی معاشرے کی بگڑتی صورت حال اور خوف کی نفسیات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔"۲۵؎

"انیس ناگی کی افسانہ نگاری" کے عنوان کے تحت وہ اُن کے افسانوی مجموعے" حکایات" کے بارے میں رقمطراز ہیں:

"خودکلامی کی تکنیک میں لکھے گئے یہ افسانے فلسفیانہ مزاج رکھتے ہیں۔ہم انہیں وارداتی افسانے کہہ سکتے ہیں۔"۲۶؎

انیس ناگی کے افسانوی مجموعے" بدگمانیاں" کے افسانوں پر فرداً فرداً تنقید کرتے ہوئے شاہین اپنی رائے کا اظہار اس طرح کرتی ہیں:

"انیس ناگی نے اپنے افسانوں کے موضوعات اور تکنیک کے تنوع سے انہیں منفرد بنایا ہے۔ اِن کا اسلوب آسان، رواں اور لچک دار ہے۔ یہ افسانے جدید شعور کی بدولت ایسا سماجی منظر نامہ پیش کرتے ہیں جس میں انسان بے حیثیتی کے آخری مقام پر ہے۔مصنف کا تصور سازی کا عمل بھی قابلِ توجہ ہے۔"۲۷؎

"خودنوشت" کے عنوان سے انیس ناگی کی" ایک ادھوری سرگزشت" پر مختصر تبصرہ کیا ہے اور اسے تاثراتی ادب کا بہترین نمونہ قرار دیا ہے۔اس کے بعد" نثری اور شعری تراجم" کے عنوان کے تحت اُن کے تراجم کا مختصر تعارف شامل ہے۔

اگلا باب" تنقید و تحقیق" ہے جن میں اُن کی مندرجہ ذیل تنقیدی کتب کا مختصر تعارف اور تجزیہ شامل ہے۔

1۔ تنقیدِ شعر
2۔ ڈپٹی نذیر احمد کی ناول نگاری
3۔ نیا شعری افق
4۔ شعری لسانیات
5۔ تصورات
6۔ مذاکرات
7۔ غالب :ایک شاعر، ایک اداکار
8۔ مشاہدات
9۔ مشاہدات
10۔ غالب پریشان
11۔ غالب کا مقدمہ پنشن
12۔ میری ادبی بیاض
13۔ معاصر ادب
14۔ سعادت حسن منٹو :معمار افسانہ نگار
15۔ سعادت حسن منٹو کی کہانی
16۔ تشکیلات
17۔ میراجی ایک بھٹکا ہوا شاعر
18۔ افتخار جالب
19۔ نئے افسانے کی کہانی

"انیس ناگی کی تنقیدی جہتیں" کے موضوع کے تحت شاہین قلم فرسائی کرتی ہیں:

"انیس ناگی ادبی حلقوں میں اپنی تنقید اور تنازع کے باعث ہمیشہ موضوع بحث رہے۔نئی بات کہنا اور چونکا دینا اِن کا مشغلہ ہے۔ اِن کی تنقید کا مجموعی مزاج کیا ہے یہ موضوع اپنی جگہ کئی مباحث کا پیش خیمہ ہے تاہم اردو میں اُن کی شائع شدہ کتاب شعری لسانیات ہے جو علوم ہیت و معنی پر ایک سند کی حیثیت رکھتی ہے۔"۲۸؎

"انیس ناگی : شخصیت اور فن" کے آخر میں شاہین نے اُن کی تاریخ ثقافت اور نفسیات اور اُن کی کالم نگاری، ادارت اور انتخاب کے حوالے سے تحریر کردہ خدمات کو بھی مختصراً پیش کیا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ شاہین مفتی، ڈاکٹر، انیس ناگی : شخصیت اور فن (اسلام آباد، اکادمی ادبیات پاکستان ۲۰۰۹ء)، ص ۳۳ :

۲۔ ایضاً، ص ۳۶ : ۳۔ ایضاً، ص ۳۸ : ۴۔ ایضاً، ص ۳۹ :

۵۔ ایضاً،ص۴۱ :
۶۔ ایضاً،ص۴۴ :
۷۔ ایضاً،ص۴۷ :
۸۔ ایضاً،ص۴۷ :
۹۔ ایضاً،ص۵۱ :
۱۰۔ ایضاً،ص۵۴ :
۱۱۔ ایضاً،ص۵۵ :
۱۲۔ ایضاً،ص۵۸ :،۵۹
۱۳۔ ایضاً،ص۶۳ :
۱۴۔ ایضاً،ص۶۸ :
۱۵۔ ایضاً،ص۷۲ :
۱۶۔ ایضاً،ص۷۳ :
۱۷۔ ایضاً،ص۷۴ :
۱۸۔ ایضاً،ص۸۴ :،۸۵
۱۹۔ ایضاً،ص۸۵ :
۲۰۔ ایضاً،ص۹۱ :
۲۱۔ ایضاً،ص۹۲ :
۲۲۔ ایضاً،ص۹۳ :
۲۳۔ ایضاً،ص۹۸ :
۲۴۔ ایضاً،ص۱۰۲ :
۲۵۔ ایضاً،ص۱۰۵ :
۲۶۔ ایضاً،ص۱۱۰ :
۲۷۔ ایضاً،ص۱۱۳ :
۲۸۔ ایضاً،ص۱۴۹ :

دھرتی اتنی میلی کیوں ہے
اور سورج چمکیلا کیوں ہے
آندھی اتنی پاگل کیوں ہے
اور بادل جوشیلا کیوں ہے
قوسِ قزح کا ریشمی آنچل
اتنا رنگ رنگیلا کیوں ہے
تارے اتنے مدھم کیوں ہیں
امبر اتنا نیلا کیوں ہے
راتیں اتنی کالی کیوں ہیں
چاند!
تو اتنا پیلا کیوں ہے

(شاہین مفتی)

خطہ گجرات کے چند قدیم اردو شعرا

حسن نوشاہی

اسسٹنٹ پروفیسر (شعبہ اردو، زمیندار کالج گجرات)

گجرات کرہ ارض پر ۲ ۳۲ء۱۰ طول بلد اور ۳ ۷۲ء۱۸ عرض بلد شمالی پر واقع ہے۔اس سرسبز و شاداب خطے کے ایک جانب دریائے چناب اور دوسری جانب دریائے جہلم گزرتا ہے۔ان دونوں دریاؤں کے درمیانی علاقہ کو دوآبہ چج کہتے ہیں۔مورخین کے مطابق گجرات قبل مسیح سے آباد ہے۔اسے جاٹوں کے قبیلے گوجروں نے آباد کیا۔ابتدا میں اسے گوجر جاٹ کہا کرتے، جو کثرت استعمال سے ''گجرات'' میں تبدیل ہو گیا۔ لغت کی قدیم کتابوں کے مطابق گجرات کے معنیٰ ''ہاتھیوں کا اصطبل'' بھی دیئے گئے ہیں۔ڈاکٹر احمد حسین قریشی اپنی کتاب ضلع گجرات ص ۱۲۹ میں لکھتے ہیں: ''موجودہ شہر گجرات بارے دسیا جاندا اے جے ایہ سکندر اعظم دے ویلے وی آباد تے ایہنوں گجرات ای آکھدے سن۔ گجرات دے معنی پرانی لغت دیاں کتاباں وچ ہاتھیاں دا اصطبل آکھدے نے۔قیاس کیتا جاندا اے جے پورس دے ہاتھی ایس جگہ ہوون گے۔ایس گل دی ایس سبھوں وی تصدیق ہوندی اے جے گجرات شہر وچ قلعے دے کول اک گلی داناں ''گلی فیلباناں'' اج وی موجود اے۔فیر گجگاہہ اک قوم داناں اے جیہڑے پرانے زمانے وچ اکثر فیل بان ہوندے سن۔گجگاہہ قوم دے کجھ لوک اج وی ایس شہر دے پرانے بوسنیک نیں۔''

منشی کنیش داس نے چار باغ پنجاب میں گجرات کے بارے میں لکھا ہے۔''گجرات اکبر کے عہد میں ایک ویران بیلے، مٹی کا ڈھیر تھا۔اکبر کشمیر کی جانب محوسفر تھا۔جب اس نے دریائے چناب کو پار کیا۔تو اسے اطلاع ملی کہ یہاں دو اقوام یعنی گوجروں اور جٹوں میں لڑائی ہو رہی ہے۔اکبر نے سبب پوچھا۔تو اسے بتایا گیا۔کہ دونوں اس اونچے ٹیلے کی ملکیت کے دعویدار ہیں۔اکبر نے ان میں تصفیہ کرواتے ہوئے وہاں ایک قلعہ کی تعمیر کا حکم دیا۔یہ قلعہ ایک ہندو ماہر تعمیرات مہتہ کا کامل کی نگرانی میں تیار ہوا۔اکبر نے اس شہر کا نام اکبر آباد رکھا اور کسی صاحب علم نے اس کے آباد ہونے کی یہ تاریخ نکالی ''گجرات بسعی اکبر آباد'' ۹۹۷ھ'' قلعے کی تعمیر کے بعد اس کی رونق اور آبادی میں اضافی ہو گیا اور جلد ہی اس نے ایک تجارتی مرکز کی حیثیت حاصل کر لی۔

چج دوآبہ کا سارا علاقہ خطہ گجرات کے نام سے جانا جاتا تھا۔جغرافیائی طور پر اب یہ دو اضلاع گجرات اور منڈی بہاوالدین میں منقسم ہے۔اس خطے کے لوگ علم و ادب کی آبیاری میں ہمیشہ پیش پیش رہے ہیں۔اردو، پنجابی اور فارسی زبانوں میں یہاں کے ادبا نے قابل فخر اور یادگار ادبی خدمات انجام دی ہیں۔ یہاں کے قدیم اردو شعرا میں بانی سلسلہ نوشاہیہ حضرت نوشہ گنج بخش (م ۱۰۶۴ھ)، قاضی خوشی محمد کنجاہی (م ۱۰۸۸ھ)، حافظ محمد برخوردار بحرالعشق ابن حضرت نوشہ گنج بخشؒ (م ۱۰۹۳ھ) غنیمت کنجاہی (م ۱۱۲۵ھ/ ۱۷۱۳ء)، صداقت کنجاہی (م ۱۱۴۸ھ)، دانا کنجاہی (بارھویں صدی ہجری)، ہدایت اللہ مفتون (م: بارھویں صدی ہجری)، احمد یار مرالوی (م ۱۲۷۰ھ)، وغیرہ کے نمونہ ہائے کلام قدیم اردو شعرا میں ادبی اعتبار سے خاص اہمیت کے حامل ہیں۔

حضرت نوشہ گنج بخش ۹۵۹ھ/ ۱۵۵۲ء میں پیدا ہوئے اور ۱۰۶۴ھ میں انتقال فرمایا۔وہ کئی زبانوں کے شاعر، کئی کتب کے مصنف اور پنجابی نثر کے بانی کہے جاتے ہیں۔ان کی اہم تصنیفات میں ایک اردو مثنوی گنج الاسرار، اردو کلیات ''انتخاب گنج شریف''، پنجابی زبان میں ''مواعظ نوشہ پیر''، پنجابی کلیات ''گنج شریف'' اور فارسی ملفوظات چہار بہار'' شامل ہیں۔یہ سب سید شرافت نوشاہیؒ کی ترتیب و تدوین سے زیور طبع

سے آراستہ ہو چکی ہیں۔ حضرت نوشہ گنج بخشؒ کے کلام پر ڈاکٹر سید عبداللہ، پروفیسر محمد اقبال مجددی، ڈاکٹر انصار اللہ علی گڑھ یونیورسٹی، ڈاکٹر کامل قریشی (دہلی یونیورسٹی) ڈاکٹر شہناز ملک، ڈاکٹر عارف نوشاہی ڈاکٹر عصمت اللہ زاہد نے اپنے مضامین و کتب میں عمدہ بحث کی ہے۔

نوشہ صاحب کی اردو مثنوی گنج الاسرار بنیادی طور پر اردو وظائف پر مشتمل ہے۔ اس میں شریعت و طریقت کے مسائل قرآن و حدیث کی روشنی میں سمجھائے گئے ہیں۔ اس میں یہ واضح کیا گیا ہے کہ طریقت کی منزل مراد پر پہنچنے کے لیے شریعت کی پابندی ضروری ہے۔ نظم کے مجموعی مزاج پر عربی و فارسی کے بجائے ہندی زبان غالب ہے۔ اس کے مصنف نے خود اس کا کوئی نام نہیں رکھا۔ بقول سید شرافت نوشاہی: 'اس رسالہ کے ناموں میں بہت اختلاف پایا جاتا ہے۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ حضور نے خود اس کا کوئی نام تجویز نہیں کیا۔ محض سالکوں کے لیے ایک دستور العمل بیان کر کے رسالہ کو ختم کر دیا۔ متاخرین صوفیوں میں سے جن بزرگوں نے اس کو پڑھا۔ اس کے مضامین کی مناسبت سے خود ہی کوئی نام رکھ دیا۔ (گنج الاسرار ص ۲۰) قدیم مآخذ میں اسے بیان اشغال، رمز العشق، رمز العباد، گیان لہر، مجموعہ وظائف قادری نوشاہی وغیرہ کے ناموں سے یاد کیا گیا ہے۔ زبان و بیان کے اعتبار سے اس مثنوی میں پنجاب کا مخصوص لہجہ اور ہندی (قدیم اردو) کے مخصوص الفاظ پر لطف صوتی تاثر کے حامل ہیں۔ مثنوی کی بحر بھی اپنے آہنگ کے اعتبار سے موسیقیت کا رس گھولتی نظر آتی ہے۔ یہ اس دور کی مقبول ترین بحر محسوس ہوتی ہے۔ دسویں اور گیارھویں صدی ہجری میں اردو زبان کو تبلیغ کی زبان بنانے والے صوفیہ میں اکثر نے اس بحر میں اپنے عارفانہ و حکیمانہ خیالات کا اظہار کیا ہے۔ یہی بحر میراں جی شمس العشاقؒ (م ۹۰۲ :ھ) کی 'شہادت التحقیق' شیخ بہاء الدین باجن (م ۹۱۲:ھ) کی کتاب 'خزائن رحمت اللہ' کے شعروں، قاضی محمود دریائی (م ۹۴۱:ھ / ۱۵۳۴ء) کے کلام، شیخ عبد القدوس گنگوہی کے دوہوں، اشرف بیابانی (م ۹۳۵:ھ) کی تین مثنویوں 'لازم المبتدی، واحد باری، نو سر ہار' شاہ علی محمد جیو گام دھنی (م ۹۷۳:ھ) کی 'جواہر اسرار اللہ'، برہان الدین جانم (م ۹۹۰:ھ) کی مثنویوں 'ارشاد نامہ، منفعت الایمان' خوب محمد چشتی (م ۱۰۲۳:ھ) کی مثنوی 'خوب ترنگ' اور شاہ امین الدین اعلیٰؒ (م ۱۰۸٦:ھ) کی مثنویوں 'گفتار اعلی' اور 'رموز السالکین' میں نظر آتی ہے۔' ڈاکٹر جمیل جالبی نے تاریخ ادب اردو میں انہی لسانی خصائص کی بنا پر 'گنج الاسرار' کا زمانہ گیارھویں صدی ہجری متعین کیا ہے'۔ گنج الاسرار کے چند شعری نمونے درج ذیل ہیں۔

جس ذات کا اللہ ناؤں   اس کا تجھے بتاؤں تھاؤں
کم ایک سے تین ہزار   اتنے نام دھرے کرتار
اتنے ہوں جس کے ناؤں   کینکر چھپتا اس کا تھاؤں
سنگت گور سیں میں بلہاری   بھرم دوئی کا مارن ہاری
آکھے پیر جو دل پر رکھ   خوب طرح یہ انبرت چکھ
لا الہ الا اللہ سادھے   من سوں اس دم سب کچھ چھاڈے
ایسی ضرب اللہ کی لاوے   جو خطرہ ہے سبھ جھڑ جاوے

اس مثنوی میں واردات قلبی، مشاہدہ کی کیفیات، عرفان ذات کے مسائل اور صوفیانہ تجربات اپنے تمام رنگوں کے ساتھ نظر آتے ہیں۔ تصوف اور راہ سلوک کے مسافر کے لیے یہ نکات راہنمائی کا کام دیتے ہیں۔ حضرت نوشہ گنج بخشؒ اپنی شاعری کو عوام کی تلقین اور خواص کی

ہدایت کے لیے استعمال کرتے ہیں۔فکر اور اظہار میں ربط و ترتیب اشعار کی تفہیم کو آسان بنا دیتی ہے۔حضرت نوشہ گنج بخشؒ کے اردو کلیات ''انتخاب گنج شریف'' میں آپ کے اردو کلام کے خوبصورت نمونے قابل توجہ ہیں۔مثلاً

گرب روگ مہا بیماری مرشد ملے ہوئی کاری　　گرب ارب کھرب گاری گرب سرب پاپ ہے　　(گرب رسالہ)
سرن پڑے کورا کھ لئیں گے کچھو نہ دکھ لگاویں گے　　جو ہم ساتھ گہے اڑ ھکے گا مار پچھاڑ گراویں گے　　(مہدی نامہ)
چشمہ آب حیات کا خضر پئی جس بوند　　نوشہ وہ تو تجھ موں ماٹی سوں مت ڈھونڈ
جو چاہے جگ جیونا تو جاگ اندھاری رات　　اندھرے موں پائیے نوشہ آب حیات　　(آب حیات)
شمع ہوئی خاموش موں نور شمع جیوں ہوئے　　تیوں نینوں کی جوت موں دیکھے جانے سوئے　　(دوہرہ)
ظاہر تس کا ایک ہے جو باطن مانہہ ایک　　نوشہ باطن ایک وہ ظاہر بھیا انیک
ایک جو ظاہر دیتا باطن وہ ہی ایک　　دیکھے ایک جو ،نیک ہو ،دیکھے انگ انیک　　(دوہرہ)
درویشی کیا چیز ہے ،کون کوئی درویش　　نوشہ وہ درویش ہے جو صاحب سنگ ہمیش　　(دوہرہ)

حضرت نوشہ گنج بخشؒ کی یہ شاعری قلی قطب شاہ دکنی سے اقدم اردو شاعری ہے۔دوسرے صوفی شعرا کے برعکس ان اشعار میں عربی اور فارسی کے بجائے ہندی زبان کے اثرات زیادہ غالب ہیں۔ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شاعر اپنی فکر کے ابلاغ کے لیے دانستہ عوامی اور ہندی زبان کے قدیم طرز احساس کو برت رہا ہے تا کہ اس کی بات، اس کے قرب و جوار میں رہنے والا ہر فرد سمجھ سکے۔ یہ پورا کلام حقائق و معارف کا سرچشمہ ہے جس میں فقر و تصوف کی نادرالوجود اور جاذبِ توجہ کیفیات کا مستحسن اظہار نظر آتا ہے۔ااس میں عقل و دانش اور عشق و وجدان کی ہم آہنگی بھی ہے اور انسان کے ظاہری و باطنی رموز کا شاعرانہ انکشاف بھی دیکھا جا سکتا ہے۔اس میں ہستی و نیستی کے صوفیانہ افکار کی جھلک کے ساتھ ساتھ شریعت و طریقت کا حسنِ امتزاج، ادبی ذوق رکھنے والوں کی سیرابی کا باعث بنتا ہے۔شاعر کے فکری تلازمات جہانِ معنی کو وسعت دیتے اور انسان کی فکری تربیت کا اہتمام کرتے محسوس ہوتے ہیں۔

قاضی خوشی محمد کنجاہیؒ (م ۱۰۸۸ھ/۱۶۷۷ء) حضرت نوشہ گنج بخشؒ کے خلیفہ تھے۔آپ نے فارسی، ہندی اور پنجابی زبانوں میں شاعری کی لیکن ان کا کلام محفوظ نہیں رہ سکا۔مخزن الغرائب میں ان کا ایک فارسی شعر دیا گیا ہے۔مرزا احمد بیگ لاہوری نے اپنے رسالے ''الاعجاز'' میں آپ کے بارے میں لکھا ہے: ''شعر فارسی و ہندی و پنجابی بسیار میفر مودند چنانچہ اکثر خیالات ایشاں مشہور اند وشوقے تمام دارند : ترجمہ : آپ فارسی، ہندی اور پنجابی میں بہت اشعار کہا کرتے تھے۔ چنانچہ آپ کے اکثر اشعار مشہور ہیں اور بہت عشق والے ہیں۔

حافظ محمد برخوردار بحر العشق (م ۱۰۹۳ھ/۱۶۸۲ء) حضرتؒ نوشہ گنج بخش کے فرزند اکبر ہیں۔آپ ''۹۸۵ھ/۱۵۷۷ء میں بمقام نوشہرہ تارڑاں پیدا ہوئے۔قرآن مجید حفظ کیا۔تحصیل علوم مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی اور مولانا عبداللہ لاہوری سے کی۔۔آپ کی تصنیف جوامع الاسرار ہے۔''لطائف گل شاہی' مصنفہ سید گل محمد نوشاہی (م ۱۱۷۰ھ) کی بیاض (ص ۱۵:) میں آپ کے فارسی، اردو اور پنجابی کلام کے نمونے درج ہیں۔اس بیاض میں درج ان کا درج ذیل نمونہ ' کلام اپنی زبان کے اعتبار سے قابل غور ہے۔مثلاً:

توں واہ مقبول الٰہی ہیں ،توں حاکم آمر ناہی ہیں　　تو صاحب سیف سپاہی ہیں ، یا عبدالقادر جیلانی
توں عابد زاہد ابدی ہیں ،تو حامد احمد صمدی ہیں　　توں سید سرور سندی ہیں ، یا عبدالقادر جیلانی

پیر محمد سچیار (م ۱۱۲۰ھ/۱۷۰۸ء) نوشہروی، حضرت نوشہ گنج بخش کے خلفائے اکبر میں شمار ہوتے ہیں۔ وہ ادب اور خدمتِ شیخ میں درجۂ کمال رکھتے تھے۔ امام بخش لاہوری کے فارسی تذکرے مرآۃ الغفوریہ میں آپ کی شعر گوئی کے بارے میں لکھا گیا ہے اور مثال میں سچیار صاحب کا یہ اردو شعر درج ہے جو عوام الناس کو دم کرنے کے بعد وہ پڑھا کرتے۔ تذکرہ شعرائے نوشاہیہ میں بھی آپ کے ترجمے میں یہ شعر دیا گیا ہے۔ فکری اور لفظی اعتبار سے حضرت نوشہ گنج بخش کے کلام سے مماثلت رکھنے کی بنا پر یہ شعر خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔

جو کچھ کریں سو توں کریں، دوجا کرے نہ کوئے
جو کوئی آکھے میں کیتا جگ وچ کوڑا سوئے

مولانا محمد اکرم غنیمت کنجاہیؒ (م ۱۱۲۵ھ/۱۷۱۳ء) فارسی زبان کے مایہ ناز اور استاد شاعر اور انشا پرداز کہے جاتے ہیں۔ طویل عمر پائی۔ آپ حضرت نوشہ گنج بخشؒ کے ایک خلیفہ حضرت سید صالح محمد گیلانی نوشاہیؒ سے نسبت رکھتے تھے۔ احافظ شیرانی نے ان کے بارے میں لکھا ہے: ''بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ مولانا (غنیمت) پنجابی اور اردو میں بھی شوق فرمایا کرتے تھے۔ لیکن افسوس ہے کہ ان کا یہ اردو و پنجابی کلام زمانہ کی دستبرد سے ضائع ہو چکا ہے (ص ۴۱۷)۔ ان کی ایک فارسی رباعی میں اردو کے الفاظ مشاہدہ کیے جاسکتے ہیں: مثلاً: جو گئے، تیرا یار لالہ ہے:

جو گئے داد دل بہ گلبدناں رنگ او ہمچو رنگ نافرماں
گفتمش تیرا یار لالہ ہے گفت باداغ دل کہ بابوناں

ادبی تواریخ میں غنیمت کی مثنوی نیرنگ عشق، دیوان غنیمت، اور انشائے غنیمت بہت مشہور ہیں۔ مولانا غنیمت کو کئی مورخین نے خراج عقیدت پیش کیا ہے مثلاً: محمد افضل سرخوش نے تذکرہ کلمات الشعرا (تکمیل ۱۱۱۵ھ/۱۷۰۳ء)، کشن چند اخلاص نے ''ہمیشہ بہار (سال تصنیف ۱۱۳۶ھ/۱۷۲۴ء)، سراج الدین علی خان آرزو نے مجمع النفائس (سال ل تصنیف ۱۱۶۱ھ/۱۷۴۸ء)، سید احمد علی ہاشمی نے ''مخزن الغرائب (سال تصنیف ۱۲۱۸ھ/۱۸۰۳ء) اور مولانا حسین علی خان عشق عظیم آبادی نے ''نشترِ عشق (سال تصنیف ۱۲۲۴ھ/۱۸۰۹ء) وغیرہ میں غنیمت کی زبان وادب میں استادانہ مہارت کے بارے میں تفصیلات پیش کی گئی ہیں۔ مثنوی نیرنگ عشق اتنی مشہور تھی کہ اردو اور پنجابی زبانوں میں اس کے منظوم تراجم بھی سامنے آئے میاں محمد بخشؒ نے اس کا منظوم پنجابی ترجمہ کیا۔ غالب کے معاصر منشی کامتا پرشاد نادان نے اس کا منظوم ترجمہ کر کے اس کا نام بہارستان نادان رکھا۔ جو ۱۲۹۶ھ/۱۸۷۹ء میں مطبع نولکشور سے شائع ہوا۔ شریف التواریخ کی ج ۳، ح ۲، ص ۲۶۵ میں غنیمت کے بارے میں اور تفصیلات دیکھی جاسکتی ہیں۔ نیرنگ عشق کا پہلا شعر اس طرح ہے:

بنام شاہدِ نازک خیالاں عزیز خاطر آشفتہ حالاں

(کامتا پرشاد نادان کے ترجمے کا پہلا شعر یہ ہے)

عزیز شاہد اہل نظر ہے جدھر دیکھا وہی وہ جلوہ گر ہے

دانا کنجاہی بارھویں صدی ہجری کے اہم شاعر ہیں جنہیں قاضی فضل حق نے حضرت نوشہ گنج بخش کے خلیفہ قاضی خوشی محمد نوشاہی کنجاہی (م ۱۰۸۸ھ) کا بیٹا قرار دیا۔ محمد ماہ صداقت کنجاہی نے ''ثواقب المناقب'' اور سید شرافت نوشاہی نے ''تذکرہ شعرائے نوشاہیہ'' میں واضح طور پر لکھا ہے کہ 'قاضی صاحب کے بیٹوں کے نام میاں سرخرو اور میاں ماہرو تھے'' (۲۰)۔ ممکن ہے، میاں سرخرو اور میاں ماہرو میں سے کسی ایک کا تخلص دانا ہو۔ قدیم مآخذ میں میاں دانا کا ایک ملمع مخلوط اردو، فارسی، پنجابی لکھا گیا ہے جس کے چند شعر درج ذیل ہیں۔

چہ بندی دل بریں ہستی کہ دم میں جان جاناں ہے | نخواہی ماند درعالم جگت پر کیا ریجھانا ہے
بدنیا ساختی منزل تو کر کچھ کوچ کا ساماں | ازیں دار فنا آخر ترا اک دن چلانا ہے
سریرت شد سرکیواں نہ جانوں پائیدار اس کوں | بپائے دیگراں روزے لحد میں تم نے جانا ہے
گدائے درگہِ حق شو نہ کیجے شان شاہی کا | گلیم فقر در بر کش یہی تیرا شہانا ہے
مشو دیوانہ اے دانا تجھے گر ہوش ہے باقی | نمے باقی اگر دانا تو دنیا کا دیوانہ ہے

ہدایت اللہ مفتون (م ۱۲: صدی ہجری) حضرت شاہ عصمت اللہ نوشاہی ساہنپالوی (م ۱۱۳۷ھ) کے مرید وخلیفہ تھے۔ وہ اپنی شاعری میں فکر انگیز تمثیلوں سے تلاشِ ذات کے داخلی سفر کا راستہ دکھاتے ہیں۔ ان کی شاعری میں فنافی الوجود، فنافی الشیخ اور فنافی اللہ کے عارفانہ درجات کے حصول کی لگن ہی دراصل سرمایۂ حیات ہے۔ وہ لوگ جو، غیبت، حسد اور کینہ جیسی اخلاقی برائیوں کے حامل ہوں، وہ دنیا و آخرت میں نامراد رہیں گے۔ دیگر صوفیہ کی طرح دنیا کی بے ثباتی اور حیات انسانی کا اختصار ان کا محبوب موضوع ہے۔ ان کا درج ذیل منتخب ریختہ دیکھیے، جس میں شاعر واضح کرتا ہے کہ وہ جمال یار کا متمنی ہے۔ جب بھی طالب محبوب کے جلووں کے سامنے ہو تو وہ ہمیشہ، دنیا اور متعلقاتِ دنیا کو فراموش کر دیتا ہے۔

تیرا جمال دیکھے گھر بار بھول جاوے | سب قیل قال لیکھے ، سنسار بھول جاوے
تجھ سوں لگن لگاوے ، سب کچھ اوہاں پاوے | تب مال بڈا پاوے، بیوپار بھول جاوے
مہراب ابرو اپنا جس کو کبھی دکھاوے | قبلہ نما کی آنکھوں کردار بھول جاوے
انگن ہمارے ساجن جب جب لٹکتا آوے | کبک و تدرو بیند ، رفتار بھول جاوے
سنبل بنفشہ سوسن زلفت اگر جو دیکھے | درپیچ و تاب آپس صد بار بھول جاوے
لقمان صد فلاطوں، بقراط اور عالم | حکمت تیری کے آگے لاچار بھول جاوے
مفتون ہدایت اللہ تجھ یار دل میں بستا | نیم نگاہ کی اس توں ہشیار بھول جاوے(۱۶)

ایک اور ریختہ بھی شاعر کے جذبات واحساسات کا خوبصورت ترین اظہار ہے۔

تجھ مکھ تئیں قرآن کہوں، یا صورت رحمان کہوں
یا یوسف کنعان کہوں یا چودھواں مہتاب ہے
تجھ زلف کوں سنبل کہوں، یا خود بنفشہ گل کہوں
نکہت چونشہ مل کہوں، یا خود مئے خوں ناب ہے

پنجابی زبان کے پرگو شاعر احمد یار مرالوی (م ۱۲۷۰ھ/ ۱۸۵۴ء) نے اردو زبان میں بھی شاعری کی ہے۔ احمد یار سوہدرہ متصل وزیر آباد میں ۱۷۶۸ء کو پیدا ہوئے۔ بچپن قلعہ اسلام گڑھ (گجرات) میں گزرا۔ مروجہ علوم سیکھنے کے بعد امامت اور طبابت کو اپنا پیشہ بنایا اور تلاش معاش میں گھنیاں، دوگل (پھالیہ) اور بالآخر مرالہ میں مقیم ہوئے۔ ۱۸۵۴ء میں وفات پائی اور مرالہ ہی میں دفن ہوئے۔ سلسلہ نوشاہیہ میں فقیر الہ دین نوشاہی برقندازی سے بیعت کی۔ احمد یار نے پنجابی زبان میں چالیس سے زائد کتابیں تصنیف کی ہیں۔ بھاکھا میں گورداس، فارسی میں بیخود، شیدا اور مولوی اور پنجابی میں احمد یار تخلص استعمال کرتے تھے۔ میاں محمد بخش نے ''سیف الملوک'' میں انہیں اس

طرح خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔ ''پھر ولایت شعر سخن دی احمد یار سنبھالی---دھونسا مارتخت پر بیٹھا مل پنجاب حوالی''۔ ان کے فکر وفن پر جامعہ پنجاب سے پنجابی زبان میں پی ایچ ڈی کی ڈگری جاری کی جا چکی ہے۔ قاضی فضل حق نے اپنے ایک مضمون مشمولہ ''پنجاب میں اردو'' میں احمد یار کا مختصر تذکرہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ ان کے ''اردو میں صرف دو شعر دستیاب ہو سکے ہیں۔'' سید شرافت نوشاہی نے شریف التواریخ میں احمد یار کی بارہ اشعار پر مشتمل درج ذیل غزل درج کی ہے جو انیسویں صدی کے وسط تک، پنجاب کے خطے کی پائیدار شعری روایت کا ایک بڑا حوالہ اور اس دور کی سماجی وتہذیبی تصویر کشی کا بہترین نمونہ ہے۔ اس میں دوسری زبانوں کے الفاظ اس ہنر مندی سے برتے گئے ہیں کہ اشعار کے آہنگ میں موسیقیت رس گھولتی نظر آرہی ہے اور کئی زبانوں کے امتزاج سے دیسی مزاج ابھر کر سامنے آرہا ہے۔ احمد یار ایک خیال سے روشنی کے کئی رنگوں کی طرح کئی خیال پیدا کرتے ہیں۔ پھر ان تمام نقوش اور رنگوں کو نکھارنے اور ابھارنے کی شعوری کوشش کرتے ہیں۔

ملا ہے دل جا کے اس ستمگر سے جس کو کہتے ہیں بے وفا ہے
سنا ہے ہر اک سے اس طرح سے وہ سخت ظالم ہے، پر جفا ہے
وہ جب سے لے کر گیا ہے دل کو دوبارہ مکھڑا نہیں دکھایا
وہ کس طرف ہے، کدھر گیا ہے، کسو نے دیکھا ہے یا سنا ہے
تو میری جانب سے جا کے قاصد سجن کو میرا سلام دیجو
سلام کے بعد رو کے کہیو، کہ تیرے عاشق نے یوں کہا ہے
اٹک میں رہنا، لٹک کے چلنا، ہٹک کے کھانا، مٹک بتانا
تیری نگاہ سے چٹک پھٹک کر، سٹک سٹک کر ہتک پڑا ہے
اگر وہ صاحب پٹھان ہووے تو راشہ کہہ کو اسے بلا کہہ
سلا نگوری ولے نرازی دغان مایا تو کیا بلا ہے
اگر وہ ابن عرب کا ہووے ادب سے کہیو تعال ہندی
فیا حبیبی کثیر شوقی فداک روحی فاین جا ہے
اگر وہ نچوا ہو کاشمیری سمہال کر بول لفظِ کاشر
اوارہ کرتس، بوارہ کرتس، یہ عارا رستو، یہی وفا ہے(۱۹)

ان اشعار میں ستمگر محبوب ہماری زندگی کا جیتا جاگتا اور چلتا پھرتا کردار ہے جس میں محبوب کے سارے ناز وانداز موجود ہیں جو ایک عالم کو اس کی زلف گرہ گیر کا اسیر بنا لیتے ہیں۔ شاعر نے انسانی احساس وجذبے کو لفظوں میں پروتے ہوئے سینے میں سلگنے والی عشق کی آگ اور اس کی کیفیات کو انتہائی خوبصورتی سے بیان کیا ہے۔ وہ سادگی کے ساتھ لطافت اور معنوی تہ داری بھی پیدا کر رہے ہیں۔ ان میں کلاسیکیت کی گہرائی، رومانویت کی وسعت اور آفاقیت بھی نظر آتی ہے۔ شاعر جمالیاتی پہلوؤں کو بیان کرتے ہوئے فرد کے عصری مسائل کی گرہیں کھولتے چلے جارہے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ تجربے کی سچائی اور معنوی جذب وکیف کی وہ خوب عکاسی کرتے ہیں۔ ہر شعر میں جذبات واحساسات کے نئے تناظرات نئے پہلوؤں سے رونما ہو رہے ہیں جو شاعر کے داخلی احساسات اور عارفانہ جذبات کی عکس گری کر رہے ہیں۔ اگر احمد یار اردو شاعری کو مستقل طور پر اپنا لیتے تو ان کا پلہ معاصر دہلوی شعرا سے کسی طرح کم نہ ہوتا۔

''محمد حسین آزاد اور خانوادہ آزاد'' کا ایک جائزہ

ڈاکٹر ایم۔اے فاروقی

لیکچرر شعبہ اردو، UOG سائنس کالج جی ٹی روڈ گجرات

''محمد حسین آزاد اور خانوادہ آزاد'' جس کا سرورق، خاکی رنگ پر مشتمل ہے، اس ورق کو محمد جاوید نے تیار کیا، جس پر فارسی کے اشعار کی کانٹ چھانٹ نمایاں نظر آتی ہے، اس کتاب کی ترتیب وتدوین محمد اکرام چغتائی نے کی ہے، اس کتاب کو ''پاکستان رائٹرز کوآپریٹو سوسائٹی'' نے چھپوایا، سرورق پر اس کا نام بھی درج ہے، اس کی اشاعت اول 2010 میں مکتبہ جدید پریس لاہور سے ہوئی ہے، جس کی تعداد 500 ہے، اس کی قیمت 400 روپے درج ہے، اس کا مقدمہ محمد اکرام چغتائی نے لکھا ہے، محمد حسین (آپ بیتی) محمد عبداللہ قریشی نے مرتب کی اس کے علاوہ کتاب میں کل 25 ابواب شامل ہیں جن میں سے 3 مضامین آغا محمد ابراہیم (فرزند آزاد)، پر مضامین آغا محمد باقر (نبیرۂ آزاد) 10 مضامین آغا محمد طاہر (نبیرۂ آزاد)، 4 مضامین آغا محمد اشرف (نبیرۂ آزاد) اور 2 مضامین آغا محمد سلمان باقر (فرزند آغا محمد باقر) کے تحریر کردہ ہیں۔ کتاب کا مقدمہ صفحہ پانچ سے لے کر صفحہ 12 تک ہے، جس میں محمد حسین آزاد، آغا محمد ابراہیم، آغا محمد باقر، آغا محمد طاہر، آغا محمد اشرف، اور آغا محمد سلمان باقر کی تاریخ پیدائش اور تاریخ وفات کا ذکر کیا گیا ہے، اس کے علاوہ ان کی زندگی کے احوال کا مختصر تعارف اور ان کے کارناموں کا ذکر بھی کیا گیا ہے۔ کتاب کے صفحہ 13 سے لے کر صفحہ 27 تک محمد حسین آزاد کی آپ بیتی کو محمد عبداللہ قریشی نے بڑے اچھے انداز میں مرتب کیا، اس آپ بیتی میں آزاد نے اپنے دادا اور والد کے متعلق بیان کیا، استاد ابراہیم ذوق کے ساتھ اپنے والد کی دوستی اور اپنی صحبت اور ذوق کی شاگردی کا ذکر کیا، 1857ء کے ہنگامے میں دلی کے اجڑنے کا نقشہ پیش کرنے کے بعد سیر ایران اور اپنے تجربات کا بھی ذکر کیا، ''دربار اکبری'' اور آب حیات لکھنے کے بیان کے بعد مذہب کے متعلق اپنی سوچ کی عکاسی بھی کی ہے، جس سے ان کے بارے میں جاننے والوں کو آسانی ہوگی، محمد عبداللہ قریشی نے آپ بیتی کو بڑے مختصر اور جامع انداز میں مرتب کیا ہے، اور محمد اکرام چغتائی نے اس کو کتاب کا حصہ بنا کر آزاد شناسوں کے لئے مزید آسانی پیدا کی ہے۔ کتاب کے صفحہ 28 سے 36 تک محمد حسین آزاد کے بیٹے آغا محمد ابراہیم کے تین مضامین درج ہیں، پہلا ''دربار اکبری'' کا مقدمہ ہے جس میں انہوں نے دربار اکبری کی اشاعت اور آزاد کے شاگرد میر ممتاز علی کے بارے میں انکشافات کیے ہیں، صفحہ 32 اور 33 پر آغا محمد ابراہیم کی ''کلیات نظام آزاد'' کے بارے تمہید کی طبع اول اور ثانی درج ہے، جس میں آزاد کی نظموں کو چھپوانے کے متعلق بتایا گیا ہے، صفحہ 34 سے 36 پر آغا ابراہیم کا تیسرا مضمون درج ہے جو کہ آزاد کے مجموعہ ''نصیحت کا کرن پھول'' کی تمہید ہے جس میں انہوں نے اس مسودہ کے ہاتھ لگنے سے چھپوانے تک کے احوال کا ذکر کیا ہے، کتاب کے صفحہ 37 سے 88 تک آزاد کے پوتے آغا محمد باقر کے مضمون ''شمس العلما مولانا محمد حسین آزاد'' کو کتاب میں جگہ دی گئی، جس میں انہوں نے مولانا محمد حسین آزاد کا شجرۂ نسب بتایا، آزاد کے لکڑ دادا مولانا محمد شکف، پردادا مولانا محمد اشرف، دادا مولانا محمد اکبر، باپ مولانا محمد باقر اور ان کے بیٹے محمد حسین کا ذکر کیا گیا اور پھر ان کی اولاد کا ذکر موجود ہے، اس کے بعد خاندان کے متعلق معلومات فراہم کی گئی ہیں، مولانا اکبر اور مولانا باقر کے بارے میں بھی ابتدائی معلومات بتائی گئی ہیں اس کے بعد محمد حسین آزاد کا دہلی کالج میں حصول تعلیم کے لئے داخلہ، آزاد کے مقاصد، استاد ابراہیم کے ساتھ تلمذ، استاد ذوق کے انتقال کے بعد حکیم آغا جان عیش سے مشورہ سخن، دہلی کے لٹنے کے واقعات مولانا باقر کی گرفتاری، گھر چھوڑنے کے

حالات، آزاد کی اپنے والد سے آخری ملاقات، واپسی پنجاب میں پھر لدھیانہ جا کر پریس میں ملازمت اختیار کرنا، ڈاکخانہ لاہور میں ملازمت، محکمہ تعلیم میں ملازمت سنٹرل ایشیاء کی سیاحت، اردو، فارسی کی تحریروں کی ریڈنگ اور پھر تصنیف کرنے کا عمل، تعلیم نسواں کی تحریک گورنمنٹ کالج اور اورینٹل کالج میں پروفیسر ہونا، تصنیف وتالیف کا دور، آزاد کی شاعری، پھر آزاد کی مخالفت، پنجاب یونیورسٹی میں خدمات، ایران کی سیاحت، آزاد کے کتب خانہ کا ذکر، شمس العلماء کا خطاب، روحانیت کا ذکر کرنا، دلی جانا اور پھر لاہور واپسی اور ان کی وفات کا بھی بڑے اچھے انداز میں ذکر کیا گیا ہے، صفحہ 79 سے 85 تک آزاد کے لباس، تصویر، پاکیزگی، طبیعت، شاگردوں سے مراغات، ان کا گھوڑا، سالگرہ، بیوی سے محبت، اور مذہب کے بارے میں بھی بتایا گیا ہے، اس مضمون میں آغا محمد باقر نے اپنے دادا کو بڑے اچھے انداز میں پیش کیا ہے، جہاں یہ مضمون اچھا ہے وہاں اس میں کچھ خرابیاں بھی ہیں، مثلاً صفحہ 50 پر لکھا ہوا دیکھئے گا۔

''چنانچہ انہوں نے جرنیل صاحب کے مکان میں رہ کر ''سورہ صنم قریش کا ورد شروع کیا یہ وظیفہ چودہ دن آدھی رات کے بعد پڑھا جاتا ہے اور چودہ دن کے بعد دلی مراد بَر آتی ہے۔'' سورہ صنم قریش تو کوئی سورہ ہے ہی نہیں، اب اس میں کسی کمپوزر کی غلطی ہے یا مبالغہ ہے، علم نہیں لیکن کتاب کو ترتیب دینے والے کو چاہئے تھا کہ اس غلطی کو چیک کرتا، بغیر دیکھے مضامین کو ترتیب دے دینا نامناسب ہے۔ اس کے علاوہ صفحہ 74 پر آزاد کا روحوں سے باتیں کرنا، تختی کے ذریعہ سے عمل ہونا، اس میں بھی مبالغہ پایا جاتا ہے، تختی کہاں سے ملی اور کہاں گئی، اس پر بھی مرتب کو غور کرنا چاہئے تھا، اس کے بعد صفحہ 89 سے 99 تک آغا محمد باقر کا مضمون ''مولانا محمد حسین آزاد'' کتاب کا حصہ ہے جس میں بھی آزاد کی زندگی کے متعلق باتیں کی گئی ہیں، صفحہ 101 سے 107 تک ''کتب خانہ'' کو کتاب میں جگہ دی گئی ہے، جس میں آزاد کی کتابوں سے جنون کی حد تک محبت کا ذکر کیا گیا ہے، مثلاً لکھتے ہیں کہ:

''اس زمانے میں جب نقل وحمل کے طریقے بہت دشوار تھے، اتنی دور سے کتابیں لانا بڑا مشکل کام تھا، انہوں نے اونٹوں اور گدھوں پر سفر کیا جب کہیں آندھی آتی تو کتابوں کے گٹھے ڈھیر کرتے، اس پر اپنا بستر بچھا کر بیٹھ جاتے اور اوپر لحاف اوڑھ لیتے، اسی جذبے کے تحت کھانے پینے پر بہت احتیاط سے خرچ کرتے تھے، لوگ پلاؤ، انڈے اور خشک وار میوے کھاتے اور وہ سوکھی روٹیاں پانی میں ڈبو کر پیٹ بھرتے کہ ایک آدھ کتاب کا کتب خانہ آزاد میں اضافہ ہو سکے گا''، اس کے علاوہ آزاد کے کتب خانہ کے بننے اور بند ہونے کے بارے میں بتایا گیا ہے، صفحہ 108 سے لے کر صفحہ 144 تک ان کے مضمون ''مقالات آزاد'' کو جگہ دی گئی ہے، جس میں بھی آزاد کے متعلق پہلے ہی معلومات کا تبادلہ خیال کیا گیا ہے، کتاب کے صفحہ 145 سے لے کر 150 تک ''سرسید کے تین نایاب خط'' موجود ہیں، جو کہ آزاد کے نام لکھے گئے ہیں، صفحہ 151 سے صفحہ 201 تک آغا محمد باقر کے مضمون ''مولوی محمد باقر'' کو جگہ دی گئی ہے، جس میں مولوی محمد باقر اور آزاد کے حالات زندگی کے متعلق تفصیلاً معلومات فراہم کی گئی ہیں، کتاب کے صفحہ 202 سے لے کر 248 تک آغا محمد طاہر کے دس مضامین کو کتاب کا حصہ بنایا گیا ہے مضامین مندرجہ ذیل کتب کے دیباچے ہیں جن کو اکرام چغتائی نے ایک جگہ اکٹھا کر کے خوبصورتی پیدا کر دی ہے، (1) فلسفہ الہیات (مقدمہ 1926ء) (2) نظم آزاد'' 1926ء (3) خکرۂ آزاد 1930ء (4) کائنات عرب 1927ء (5) سیر ایران 1922ء (6) جانورستان 1922ء (7) نگارستان فارس 1922ء (8) نیرنگ خیال 1923ء (9) نیرنگ خیال (بقائے دوام) 1923ء (10) ''لغت آزاد'' 1924ء۔ ان مضامین میں بھی آزاد شخصیت اور قصیدے ہی پڑھے گئے ہیں، صفحہ 251

سے 271 تک آغا محمد اشرف (نبیرۂ آزاد) کے 4 مضامین اکرام چغتائی نے ترتیب دے کر اپنی کتاب میں شامل کیے ہیں جو کہ مندرجہ ذیل ہیں، ''انیسویں صدی میں ایران کا سفر'' (ایک ادبی سیاحت کی دلچسپ داستان) 1950ء، اس مضمون میں آزاد کے ایران کے سفر کے متعلق معلومات بڑے احسن انداز میں فراہم کی گئی ہیں۔

2 ''آزاد کا سفر ترکستان'' (1960ء)۔ 3 ''ترکستان نذارد'' 1961ء۔ 4 ''پروفیسر آزاد ایک پروفیسر کی حیثیت سے (1872ء تا 1890ء) 1959ء۔

اس کے بعد آخر میں صفحہ 284 سے لے کر 332 تک آغا سلمان باقر (فرزند آغا محمد باقر) کے دو مضامین ''محمد حسین آزاد (حیات، شخصیت اور فن) مولانا محمد باقر مجتہد (شہید) سے شمس العلماء مولانا محمد حسین آزاد تک (1976ء) کو کتاب کی زینت بنایا گیا ہے، ان مضامین میں بھی پہلے بیان کی گئی معلومات کو نیا رنگ دے کر بیان کیا گیا ہے۔ ساری کتاب کا جائزہ لینے کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ اکرام چغتائی نے جو مصادر استعمال کیے ہیں وہ تحقیق کے اصولوں کے مطابق مستند نہیں کہے جا سکتے۔ ڈاکٹر گیان اپنی تصنیف ''تحقیق کا فن'' میں لکھتے ہیں:

''کسی ادیب کی اولاد اور شاگردوں کے بیانات کو جانچے بغیر ہرگز تسلیم نہ کیا جائے''۔ (ص 195)

اس کے علاوہ رشید حسن خان بھی کچھ یوں رقمطراز ہیں کہ:

''اچھے خاصے محتاط آدمی کسی جذباتی تعلق کی وجہ سے کسی خاص موضوع کے سلسلے میں جذباتی ہو جاتے ہیں''

اکرام چغتائی کی اس کتاب میں جذباتیت ہی جذباتیت نظر آتی ہے، آزاد کے خانوادے نے آزاد کو ضرورت سے زیادہ ہی بڑھا چڑھا کر پیش کیا ہے، اکرام چغتائی نے چونکہ آزاد کے خونی رشتہ داروں کے ہی تاثرات شامل کیے ہیں، وہ خود بھی کتاب کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:

''فی الحال آزاد کے فرزند آغا محمد ابراہیم، ان کے تین پوتوں آغا محمد طاہر، آغا محمد باقر اور آغا محمد اشرف اور پڑپوتے آغا سلمان باقر کی تحریروں کو ترتیب دے کر کتابی صورت میں زیر عنوان ''آزاد اور خانوادۂ آزاد'' پیش کرتا ہوں''

اس کتاب کا زیادہ تر متن محمد حسین آزاد کی کسی نہ کسی تصنیف کا دیباچہ یا تمہید یا پیش لفظ ہے، جس کو ان کے بیٹے یا پوتے لکھتے رہے ان سب میں تقریباً ایک جیسی ہی معلومات فراہم کی گئی ہیں، عام طور پر کتابوں کے جو دیباچے لکھے جاتے ہیں ان میں مصنف کی حوصلہ افزائی کے لئے اس کی بے جا تعریف کی جاتی ہے، جس میں بھرپور قسم کی مبالغہ آرائی پائی جاتی ہے، اس کتاب پر بھی اگر غور کیا جائے تو کئی جگہوں پر تو تخلیل کے گھوڑے دوڑائے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ کتاب کے ذریعے سے بہت سی مستند معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ اس کتاب کے بارے میں یہ کہوں گا کہ محمد اکرام چغتائی نے محمد حسین آزاد اور ان کی اولاد کی علم دوستی کی بڑی اچھی تصویر کھینچی ہے، اس کتاب میں چند کمیاں ضرور ہیں لیکن اس کے باوجود یہ ایک بہترین تحقیقی کاوش ہے، جس نے ''آزاد شناسی'' کی مضبوط روایت کو زندہ کر دیا ہے، اور محققین کو اس خانوادۂ کی علمی و ادبی خدمات کو پرکھنے کی دعوت دی ہے۔

مجلّہ شاہین (اشاریہ)

(1939-2019)

محمد سعید لیکچرر شعبہ فزکس

(سابق طالب علم مُدیر مجلہ شاہین)

مجلہ شاہین کی فہرست سازی کے ذریعے میں نے ایک اپنی سی کوشش کی ہے کہ ممکنہ تحقیق کے بعد شاہین کے آغاز سے لے کر اب تک جتنے شمارے کالج ہذا نے شائع کیے، اُن کی تاریخی اعتبار سے ترتیب کے مطابق بمعہ بنیادی تفصیلات ایک مختصر اور جامع فہرست تیار کروں۔ اس عمل سے گزرتے ہوئے کئی ایک مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ سب سے پہلے تو کالج لائبریری میں شاہین کے مکمل ریکارڈ کی عدم دستیابی رہی۔ اور کالج لائبریری کے علاوہ جن کے قبضۂ قدرت میں یہ ریکارڈ ہے وہ نہ جانے کیوں اس کی فراہمی سے گریزاں رہتے ہیں۔

اس فہرست کی ترتیب و تحقیق کا عمل مجلہ شاہین کے گزشتہ شماروں میں شائع ہونے والی دو فہرستوں ''شاہین کی 45 سالہ پرواز از احمد حسین احمد قریشی قلعداری۔۔۔شاہین جنوری 1984 ص 11''، ''توضیحی فہرست مجلہ شاہین۔۔۔از کلیم احسان بٹ۔۔۔شاہین 09-2008۔ص 185''، (لائبریری ریکارڈ میں موجود شماروں) اور چند دوسری کتابوں اور لوگوں پر محیط رہا۔

دونوں فہرستوں میں باہمی اختلاف اور کتابت یا کمپوزنگ کی غلطیاں مشکلات کے ساتھ ساتھ تحقیق کے لیے راہ ہموار کرتی گئیں۔ کچھ اختلافات کی نشاندہی فہرست کے آخر میں کر دی گئی ہے تا کہ قارئین اور محققین از خود نتائج اخذ کر سکیں۔

زمیندار کالج کا قیام 38-1937ء میں عمل میں آیا۔ اگر ہم ڈاکٹر احمد حسین احمد قلعداری کی فہرست ''شاہین کی 45 سالہ پرواز'' کا جائزہ لیں تو یہ پتہ چلتا ہے کہ شاہین کا پہلا شمارہ جون 1939ء کو پرنسپل سید شبیر حسین بخاری کی سر پرستی میں شائع ہوا۔ کلیم احسان بٹ ''توضیحی فہرست مجلہ شاہین'' میں بحوالہ آئینہ تاریخ و تذکرہ زمیندار ڈگری کالج از حامد حسن سید لکھتے ہیں کہ مجلہ شاہین کا نام ڈاکٹر جہانگیر خاں نے تجویز فرمایا۔

کلیم احسان بٹ کے مطابق ''زمانۂ حال میں پہلا شمارہ جنوری 1941ء کا ہے لیکن اداریہ سے ثابت ہوتا ہے کہ شاہین کا آغاز اس سے قبل ہو چکا تھا اور کم از کم تین شمارے اس سے پہلے شائع ہو چکے تھے۔'' یہ بات ریکارڈ میں موجود جنوری 1941ء کے شمارے کے اداریے سے واضح طور پر درست نظر آتی ہے کیونکہ اس میں لکھا گیا ہے ''یہ تاج محمد خیال کی نگرانی کا ہی نتیجہ ہے کہ شاہین اپنی چوتھی اشاعت میں ہی شہرت کی بلندیوں تک جا پہنچا۔''

اگر ڈاکٹر احمد حسین کی فہرست کے حوالہ سے اسی بات کا تجزیہ کیا جائے تو بھی یہ بات درست ثابت ہوتی ہے۔ ان کے مطابق شاہین کا پہلا شمارہ سید شبیر حسین بخاری پرنسپل کے عہد میں شائع ہوا مگر اس طرح شاہین کے نام کے حوالہ سے ایک ابہام جنم لیتا ہے کہ ڈاکٹر محمد جہانگیر خاں جو سید شبیر حسین بخاری کے بعد پرنسپل بنے، انھوں نے شاہین کا نام کیسے تجویز کیا۔ سو ہم مجلہ شاہین کے نام کے حوالہ سے کوئی حتمی رائے قائم کرنے سے قاصر ہیں کہ یہ نام کس دور میں رکھا گیا۔ یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ ڈاکٹر جہانگیر سے پہلے جو شمارہ شائع ہوا اُس کا نام شاید کچھ اور ہو۔ بہر حال اس انداز میں سوچنے سے محققین کے لیے تحقیق کا ایک نیا باب ضرور کھل سکتا ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ اصل حقائق سے بھٹک جائیں۔

شاہین کا پورا ریکارڈ کالج لائبریری میں موجود نہیں۔اس مضمون کی ترتیب و تشکیل کے لیے (شاہین کے پلاٹینم جوبلی نمبر کے انتخاب کے دوران) کل 38 شمارے دستیاب ہو سکے۔جن میں 1955ء، 1956اور 1957ء کے شماروں کے صرف چند صفحات شامل ہیں۔ بقول کلیم احسان بٹ "سنا ہے کہ شاہین کا مکمل ریکارڈ جناب ڈاکٹر احمد حسین قریشی کے پاس محفوظ ہے لیکن اس خزانے تک کسی کو شرفِ باریابی حاصل نہیں۔۔۔ایک شنید یہ بھی ہے کہ جناب حامد حسن سید (سابق پرنسپل زمیندار کالج) کے پاس بھی مکمل ریکارڈ موجود تھا مگر وہ اپنی حیات میں اس کی تردید کرتے رہے اور وفات کے بعد اگر وہ ریکارڈ تھا بھی تو نجانے کدھر گیا۔ (بحوالہ توضیحی فہرست مجلہ شاہین)۔ممکنہ تحقیق سے جو تفصیلات حاصل ہوئیں مندرجہ ذیل ہیں۔

(1) جون 1939ء یہ شمارہ سید شبیر حسین بخاری کے زیر سرپرستی شائع ہوا۔تاج محمد خان ایم اے اور فاضل محمد افضل بالترتیب حصہ اردو اور حصہ انگریزی کے نگران اساتذہ تھے۔محمد اسلم اور صفدر حسین بالترتیب حصہ اردو اور حصہ انگریزی کے طالبعلم مدیران تھے۔

(2) دسمبر 1939ء یہ شمارہ ڈاکٹر محمد جہانگیر خان کے زیر سرپرستی شائع ہوا۔تاج محمد خان ایم اے اور فاضل محمد افضل بالترتیب حصہ اردو اور حصہ انگریزی کے نگران اساتذہ تھے۔محمد اسلم اور صفدر حسین بالترتیب حصہ اردو اور حصہ انگریزی کے طالب علم مدیران تھے۔

(3) مارچ 1940ء یہ شمارہ ڈاکٹر محمد جہانگیر خان کے زیر سرپرستی شائع ہوا۔تاج محمد خان ایم اے، شیخ ظہیر الدین احمد اور پروفیسر اندر ناتھ انند بالترتیب حصہ اُردو، حصہ انگریزی اور حصہ ہندی کے نگران اساتذہ تھے۔جبکہ محمد اسلم، صفدر حسین اور گوہر ہرشاد بالترتیب حصہ اُردو، انگریزی اور ہندی کے طالب علم مدیران تھے۔

(4) جنوری 1941ء یہ شمارہ محمد جہانگیر خان پرنسپل کے زیر سرپرستی شائع ہوا۔ پروفیسر عبدالقیوم، پروفیسر بشیر الدین اور پروفیسر اندر ناتھ انند بالترتیب حصہ اُردو، انگریزی اور ہندی کے نگران اساتذہ تھے۔جبکہ مرزا غلام نبی سلیم و محمد اشرف، صفدر حسین اور راج کمار بالترتیب حصہ اُردو، انگریزی اور ہندی کے طالب علم مدیران تھے۔

(5) فروری 1941ء یہ شمارہ محمد جہانگیر خان پرنسپل کے زیر سرپرستی شائع ہوا۔ پروفیسر عبدالقیوم، پروفیسر بشیر الدین اور پروفیسر اندر ناتھ انند بالترتیب حصہ اُردو، انگریزی اور ہندی کے نگران اساتذہ تھے۔جبکہ مرزا غلام نبی سلیم و محمد اشرف، صفدر حسین اور راج کمار بالترتیب حصہ اُردو، انگریزی اور ہندی کے طالب علم مدیران تھے۔

(6) جون 1941ء یہ شمارہ محمد جہانگیر خان پرنسپل کے زیر سرپرستی شائع ہوا۔ پروفیسر عبدالقیوم، پروفیسر بشیر الدین اور پروفیسر اندر ناتھ انند بالترتیب حصہ اُردو، انگریزی اور ہندی کے نگران اساتذہ تھے۔جبکہ مرزا غلام نبی سلیم و محمد اشرف، صفدر حسین اور راج کمار بالترتیب حصہ اُردو، انگریزی اور ہندی کے طالب علم مدیران تھے۔

(7) نومبر 1941ء یہ شمارہ محمد جہانگیر خان پرنسپل کی زیر سرپرستی شائع ہوا۔ پروفیسر عبدالقیوم، پروفیسر بشیر الدین اور پروفیسر اندر ناتھ انند بالترتیب حصہ اُردو، انگریزی اور ہندی کے نگران اساتذہ تھے جبکہ عبدالقیوم طارق و سید علی جمال صفدر حسین اور راج کمار بالترتیب حصہ اُردو، انگریزی اور ہندی کے طالب علم مدیران تھے۔

(8) مارچ 1942ء یہ شمارہ محمد جہانگیر خان پرنسپل کی زیر سرپرستی شائع ہوا۔ پروفیسر عبدالقیوم، پروفیسر عبدالعزیز اور پروفیسر اندر ناتھ

انند بالترتیب حصہ اُردو، انگریزی اور ہندی کے نگران اساتذہ تھے جبکہ عبدالقیوم طارق سید علی جمال، صفدر حسین وسید زمان اور راج کمار بالترتیب حصہ اُردو، انگریزی اور ہندی کے طالب علم مدیران تھے۔

(9) جون 1942ء یہ شمارہ محمد جہانگیر خان پرنسپل کی زیر سرپرستی شائع ہوا۔ پروفیسر عبدالقیوم، عاشق محمد بھٹی اور پروفیسر اندر ناتھ انند بالترتیب حصہ اُردو، انگریزی اور ہندی کے نگران اساتذہ تھے جبکہ عبدالقیوم طارق و سید علی جمال، صفدر حسین وسید زمان اور راج کمار بالترتیب حصہ اُردو، انگریزی اور ہندی کے طالب علم مدیران تھے۔

(10) نومبر 1942ء یہ شمارہ تاج محمد خیال پرنسپل کی زیر سرپرستی شائع ہوا۔ پروفیسر عبدالقیوم، پروفیسر عاشق محمد بھٹی اور پروفیسر اندر ناتھ انند بالترتیب حصہ اُردو، انگریزی اور ہندی کے نگران اساتذہ تھے جبکہ عبدالمجید و سید علی جمال، محمد اشرف خان و شیخ رحمت اللہ اور راج کمار بالترتیب حصہ اردو، انگریزی اور ہندی کے طالب علم مدیران تھے۔

(12) جون 1943ء یہ شمارہ پروفیسر تاج محمد خیال پرنسپل کی سرپرستی میں شائع ہوا۔ پروفیسر عبدالقیوم، پروفیسر غلام جیالنی اصغر اور پروفیسر اندر ناتھ انند بالترتیب حصہ اُردو، انگریزی اور ہندی کے نگران اساتذہ تھے جبکہ عبدالمجید حصہ اُردو کے طالب علم مدیر تھے۔

(13) دسمبر 1943ء یہ شمارہ پروفیسر تاج محمد خیال پرنسپل کی سرپرستی میں شائع ہوا۔ پروفیسر عبدالقیوم، پروفیسر غلام جیلانی اصغر اور پروفیسر اندر ناتھ انند بالترتیب حصہ اُردو، انگریزی اور ہندی کے نگران اساتذہ تھے جبکہ نصیر احمد رسوا و ع۔ک۔ خالد، عبدالمجید اور سرندر بالترتیب حصہ اُردو، انگریزی اور ہندی کے طالب علم مدیران تھے۔

(14) مارچ 1944ء یہ شمارہ تاج محمد خیال پرنسپل کی سرپرستی میں شائع ہوا۔ پروفیسر عبدالقیوم، غلام جیلانی اصغر اور پروفیسر اندر ناتھ انند بالترتیب حصہ اُردو، انگریزی اور ہندی کے نگران اساتذہ تھے جبکہ نصیر احمد رسوا و ع۔ک۔ خالد، عبدالمجید اور سرندر بالترتیب حصہ اردو، انگریزی اور ہندی کے طالب علم مدیران تھے۔

(15) جون 1944ء یہ شمارہ پروفیسر تاج محمد خیال پرنسپل کی سرپرستی میں شائع ہوا۔ پروفیسر عبدالقیوم، غلام جیلانی اصغر اور پروفیسر اندر ناتھ انند بالترتیب حصہ اُردو، انگریزی اور ہندی کے نگران اساتذہ تھے جبکہ محمد نصیر احمد زار حصہ اُردو کے طالب علم مدیر تھے۔ تاہم حصہ ہندی شائع نہ ہوا اور مستقل طور پر بند ہو گیا۔

(16) دسمبر 1944ء یہ شمارہ تاج محمد خیال پرنسپل کی سرپرستی میں شائع ہوا۔ پروفیسر محمد سعید اور پروفیسر غلام جیلانی اصغر بالترتیب حصہ اُردو اور انگریزی کے نگران اساتذہ تھے۔ جبکہ محمد نصیر احمد زار طالب علم مدیر برائے حصہ اُردو تھے۔

(17) مارچ 1945ء یہ شمارہ تاج محمد خیال پرنسپل کی سرپرستی میں شائع ہوا۔ پروفیسر محمد سعید اور پروفیسر غلام جیلانی اصغر بالترتیب حصہ اردو اور انگریزی کے نگران اساتذہ تھے جبکہ نصیر احمد زار و سید علی جمال اور سرندر و سلطان احمد بالترتیب حصہ اُردو اور انگریزی کے طالب علم مدیران تھے۔

(18) جون 1945ء یہ شمارہ تاج محمد خیال پرنسپل کی سرپرستی میں شائع ہوا۔ پروفیسر محمد سعید اور پروفیسر غلام جیلانی اصغر بالترتیب حصہ اردو اور انگریزی کے نگران اساتذہ تھے جبکہ نصیر احمد زار و سید علی جمال اور سرندر و سلطان احمد بالترتیب حصہ اُردو اور انگریزی کے طالب علم

مدیران تھے۔

(19) نومبر 1945ء یہ شمارہ پروفیسر تاج محمد خیال پرنسپل کی سرپرستی میں شائع ہوا۔ پروفیسر محمد سعید اور پروفیسر غلام جیلانی اصغر بالترتیب حصہ اُردو اور انگریزی کے نگران اساتذہ تھے جبکہ طالب علم مدیران برائے حصہ اُردو سید علی جمال اور ملک الہٰ یار تھے۔

(20) دسمبر 1945ء اس شمارہ کے سرپرست پروفیسر تاج محمد خیال (پرنسپل) تھے۔ پروفیسر محمد سعید اور پروفیسر غلام اصغر جیلانی بالترتیب حصہ اُردو اور انگریزی کے نگران اساتذہ تھے جبکہ سید علی جمال و ملک الہٰ یار طالب علم مدیران برائے حصہ اُردو تھے۔

(21) مارچ 1946ء سرپرست پرنسپل تاج محمد خیال تھے۔ پروفیسر انور علی انور اور پروفیسر غلام اصغر جیلانی بالترتیب حصہ اُردو اور انگریزی کے نگران اساتذہ تھے جبکہ سید علی جمال و ملک الہٰ یار طالب علم مدیران برائے حصہ اُردو تھے۔

(22) جون 1946ء اس شمارہ کے سرپرست پرنسپل تاج محمد خیال تھے۔ پروفیسر انور علی انور حصہ اُردو کے نگران استاد تھے۔ سید علی جمال و ملک الہٰ یار طالب علم مدیران برائے حصہ اُردو تھے۔ انگریزی حصہ شائع نہ ہوا۔

(23) دسمبر 1946ء اس شمارہ کے سرپرست پرنسپل تاج محمد خیال تھے۔ پروفیسر انور علی انور اور پروفیسر غلام جیلانی اصغر بالترتیب حصہ اُردو اور انگریزی کے نگران اساتذہ تھے جبکہ ملک الہٰ یار اور وشفو بھگوان بالترتیب حصہ اردو اور انگریزی کے طالب علم مدیران تھے۔

(24) مئی 1947ء پروفیسر تاج محمد خیال (پرنسپل) شمارہ کے سرپرست تھے۔ پروفیسر انور علی انور اور پروفیسر غلام جیلانی اصغر بالترتیب حصہ اردو اور انگریزی کے نگران اساتذہ تھے جبکہ فضل حسین حصہ اُردو کے طالبعلم مدیر تھے۔

(25) مارچ 1948ء شمارہ کے سرپرست پرنسپل تاج محمد خیال تھے۔ پروفیسر انور علی انور اور اے اے سلیر یا بالترتیب حصہ اُردو اور انگریزی کے نگران اساتذہ تھے۔ فضل حسین و بہادر علی اور فضل حسین و مفور الدین بالترتیب حصہ اُردو اور انگریزی کے طالب علم مدیران تھے۔

(26) نومبر 1948ء اس شمارہ کے سرپرست پرنسپل تاج محمد خیال تھے۔ پروفیسر انور علی انور اور اے۔ اے۔ سلیر یا بالترتیب حصہ اردو اور انگریزی کے نگران اساتذہ تھے۔ غالب احمد و محمد عظیم اور محمد عظیم و شیخ انور لطیف بالترتیب حصہ اُردو اور انگریزی کے طالب علم مدیران تھے۔

(27) فروری 1949ء اس شمارہ کے سرپرست پرنسپل تاج محمد خیال تھے۔ پروفیسر انور علی انور اور پروفیسر ایس ایس عظیم (سیدہ شاہدہ عظیم) بالترتیب حصہ اردو اور انگریزی کے نگران اساتذہ تھے۔ محمد عظیم حصہ اردو اور انگریزی کے طالب علم مدیر تھے۔

(28) دسمبر 1949ء اس شمارہ کے سرپرست پرنسپل تاج محمد خیال تھے۔ پروفیسر منظور حسین شور اور پروفیسر ایس ایس عظیم (سیدہ شاہدہ عظیم) بالترتیب حصہ اردو اور انگریزی کے نگران اساتذہ تھے جبکہ محمد حیدر زیدی و عاشور کاظمی اور محمد سعید قریشی و محمد سلیم بالترتیب حصہ اُردو اور انگریزی کے طالب علم مدیران تھے۔

(29) جون 1950ء اس شمارہ کے سرپرست پرنسپل تاج محمد خیال تھے۔ پروفیسر منظور حسین شور اور پروفیسر ایس ایس عظیم (سیدہ شاہدہ عظیم) بالترتیب حصہ اُردو اور انگریزی کے نگران اساتذہ تھے جبکہ محمد حیدر زیدی و عاشور کاظمی اور محمد سعید قریشی و محمد سلیم بالترتیب حصہ اُردو اور انگریزی کے طالب علم مدیران تھے۔

(30) فروری 1951ء پرنسپل تاج محمد خیال کی سرپرستی میں شائع ہوا۔ پروفیسر منظور حسین شور اور پروفیسر ایس ایس عظیم (سیدہ شاہدہ

عظیم) بالترتیب حصہ اردو اور انگریزی کے نگران اساتذہ تھے جبکہ صادق حسین بانوی و سید حسن اور محمد سلیم و غفور الرحمان بالترتیب حصہ اردو اور انگریزی کے طالب علم مدیران تھے۔

(31) جون 1951ء پرنسپل تاج محمد خیال کی سرپرستی میں شائع ہوا۔ شہزادہ درانی اور سیدہ شاہدہ عظیم بالترتیب حصہ اردو اور انگریزی کے نگران اساتذہ تھے۔ ایم اشرف خورشند و سلطان علی اور غفور الرحمان جیلانی و ظفر اقبال بالترتیب حصہ اردو اور انگریزی کے طالب علم مدیران تھے۔

(32) دسمبر 1951ء یہ شمارہ پرنسپل علاؤ الدین احمد کی سرپرستی میں شائع ہوا۔ پروفیسر محمد فرمان و پروفیسر ایس ایس عظیم (سیدہ شاہدہ عظیم) بالترتیب حصہ اردو اور انگریزی کے نگران اساتذہ تھے۔ عبدالستار خاں و اشرف خورسند و احسان اللہ نیک اور غفوالرحمان و ظفر اقبال بالترتیب حصہ اردو اور انگریزی کے طالب علم مدیران تھے۔

(33) مارچ 1952ء پروفیسر محمد فرمان اور پروفیسر ایس ایس عظیم (سیدہ شاہدہ عظیم) بالترتیب حصہ اردو اور انگریزی کے نگران اساتذہ تھے۔ عبدالستار خاں و اشرف خورسند و احسان اللہ نیک اور غفوالرحمان و ظفر اقبال بالترتیب حصہ اردو اور انگریزی کے طالب علم مدیران تھے۔

(34) دسمبر 1952ء پرنسپل غلام سرور اس شمارہ کے سرپرست تھے جبکہ پروفیسر محمد فرمان اور پروفیسر ایس ایس عظیم (سیدہ شاہدہ عظیم) بالترتیب حصہ اردو اور انگریزی کے نگران اساتذہ تھے جبکہ راحت ملک اور مظفر محمود قریشی بالترتیب حصہ اردو اور انگریزی کے طالب علم مدیران تھے۔

(35) جون 1953ء اس شمارہ کے سرپرست پرنسپل غلام سرور تھے۔ پروفیسر محمد فرمان اور پروفیسر ایس ایس عظیم (سیدہ شاہدہ عظیم) بالترتیب حصہ اردو اور انگریزی کے نگران اساتذہ تھے۔ صلاح الدین ناسک اور مظفر محمود قریشی بالترتیب حصہ اردو اور انگریزی کے طالب علم مدیران تھے۔

(36) اپریل 1954ء پرنسپل غلام سرور کی سرپرستی میں شائع ہوا۔ پروفیسر محمد فرمان اور انور ایس دل بالترتیب حصہ اُردو اور انگریزی کے نگران اساتذہ تھے جبکہ نور حسین عزیز اور مظفر محمود قریشی طالب علم مدیران برائے حصہ اُردو اور انگریزی بالترتیب تھے۔

(37) مارچ 1955ء پرنسپل غلام سرور کی سرپرستی میں شائع ہوا۔ پروفیسر محمد فرمان اور مسز میری سکز بالترتیب حصہ اُردو اور انگریزی کے نگران اساتذہ تھے جبکہ سید بنیاد حسین شاہ اور مظفر محمود قریشی بالترتیب حصہ اردو اور انگریزی کے طالب علم مدیران تھے۔

(38) جولائی 1955ء پرنسپل غلام سرور کی سرپرستی میں شائع ہوا۔ پروفیسر محمد فرمان اور مسز میری سکز بالترتیب حصہ اُردو اور انگریزی کے نگران اساتذہ تھے جبکہ سید بنیاد حسین شاہ اور مظفر محمود قریشی بالترتیب حصہ اردو اور انگریزی کے طالب علم مدیران تھے۔

(39) دسمبر 1955ء سرپرست پرنسپل غلام سرور تھے۔ پروفیسر محمد فرمان اور پروفیسر حامد حسن سید بالترتیب حصہ اُردو اور انگریزی کے نگران اساتذہ تھے جبکہ عنایت اللہ قیصر اور مظفر محمود قریشی بالترتیب حصہ اردو اور انگریزی کے طالب علم مدیران تھے۔

(40) دسمبر 1956ء سرپرست پرنسپل غلام سرور تھے۔ پروفیسر محمد فرمان اور پروفیسر حامد حسن سید بالترتیب حصہ اُردو اور انگریزی کے نگران اساتذہ تھے جبکہ حسین اختر مدنی اور الطاف اے کے لودھی بالترتیب حصہ اردو اور انگریزی کے طالب علم مدیران تھے۔

(41) اکتوبر 1957ء سر پرست پرنسپل غلام سرور تھے۔ پروفیسر محمد فرمان اور پروفیسر حامد حسن سید بالترتیب حصہ اُردو اور انگریزی کے نگران اساتذہ تھے جبکہ حسین اختر مدنی اور الطاف اے کے لودھی بالترتیب حصہ اردو اور انگریزی کے طالب علم مدیران تھے۔

(42) مارچ 1958ء سر پرست پرنسپل غلام سرور تھے۔ پروفیسر محمد فرمان اور پروفیسر حامد حسن سید بالترتیب حصہ اُردو اور انگریزی کے نگران اساتذہ تھے جبکہ محمد انور مسعود اور سید مسعود رضوی بالترتیب حصہ اُردو اور انگریزی کے طالب علم مدیران تھے۔

(43) نومبر 1958ء سر پرست پرنسپل غلام سرور تھے۔ پروفیسر محمد فرمان اور پروفیسر حامد حسن سید بالترتیب حصہ اُردو اور انگریزی کے نگران اساتذہ تھے جبکہ محمد سلیم اور شیر فرمان بالترتیب حصہ اُردو اور انگریزی کے طالب علم مدیران تھے۔

(44) مارچ 1960ء پرنسپل غلام سرور کی سر پرستی میں شائع ہوا۔ پروفیسر محمد فرمان اور پروفیسر حامد حسن سید بالترتیب حصہ اُردو اور انگریزی کے نگران اساتذہ تھے جبکہ محمد سلیم حصہ اُردو کے طالب علم مدیر تھے۔

(45) مارچ 1961ء یہ شمارہ پرنسپل غلام سرور کی سر پرستی میں شائع ہوا۔ پروفیسر محمد فرمان اور پروفیسر حامد حسن سید بالترتیب حصہ اُردو اور انگریزی کے نگران اساتذہ تھے۔ جبکہ ایوب ساحر طالب علم مدیر برائے حصہ اُردو تھے۔

(46) مئی 1962ء پرنسپل غلام سرور کی سر پرستی میں شائع ہوا۔ پروفیسر محمد فرمان اور پروفیسر حامد حسن سید بالترتیب حصہ اُردو اور انگریزی کے نگران اساتذہ تھے جبکہ محمد افضل کھوکھر حزین اور سید سجاد علی اکبر بالترتیب حصہ اُردو اور انگریزی کے طالب علم مدیران تھے۔

(47) مئی 1963ء پرنسپل غلام سرور کی سر پرستی میں شائع ہوا۔ پروفیسر محمد فرمان اور پروفیسر حامد حسن سید بالترتیب حصہ اُردو اور انگریزی کے نگران اساتذہ تھے جبکہ محمد افضل کھوکھر حزین اور سید سجاد علی اکبر بالترتیب حصہ اُردو اور انگریزی کے طالب علم مدیران تھے۔

(48) مارچ 1964ء پرنسپل غلام سرور کی سر پرستی میں شائع ہوا۔ پروفیسر محمد فرمان اور پروفیسر حامد حسن سید بالترتیب حصہ اُردو اور انگریزی کے نگران اساتذہ تھے۔ نصر اللہ خاں اور نیاز محمد چوہان بالترتیب حصہ اُردو اور انگریزی کے طالب علم مدیران تھے۔

(49) دسمبر 1964ء پرنسپل غلام سرور کی سر پرستی میں شائع ہوا۔ پروفیسر محمد فرمان اور پروفیسر حامد حسن سید بالترتیب حصہ اُردو اور انگریزی کے نگران اساتذہ تھے جبکہ ذوالفقار انجم جعفری اور سعید اسلم کھوکھر بالترتیب حصہ اُردو اور انگریزی کے طالب علم مدیران تھے۔

(50) جون 1965ء پرنسپل غلام سرور کی سر پرستی میں شائع ہوا۔ پروفیسر محمد فرمان اور پروفیسر حامد حسن سید بالترتیب حصہ اُردو اور انگریزی کے نگران اساتذہ تھے جبکہ ذوالفقار انجم جعفری اور سعید اسلم کھوکھر بالترتیب حصہ اُردو اور انگریزی کے طالب علم مدیران تھے۔

(51) دسمبر 1965ء اس شمارہ کے سر پرست پرنسپل غلام سرور تھے۔ پروفیسر محمد فرمان اور پروفیسر حامد حسن سید بالترتیب حصہ اُردو اور انگریزی کے نگران اساتذہ تھے جبکہ خضر مہدی بخاری حصہ انگریزی کے طالب علم مدیر تھے۔

(52) جون 1966ء سر پرست پرنسپل غلام سرور تھے۔ پروفیسر حامد حسن سید اُردو اور انگریزی حصوں کے نگران اُستاد تھے جبکہ اعجاز احمد شیخ اور خضر مہدی بخاری بالترتیب طالب مدیران برائے حصہ اُردو اور انگریزی تھے۔

(53) دسمبر 1966ء یہ شمارہ پرنسپل غلام سرور کی سر پرستی میں شائع ہوا۔ پروفیسر حامد حسن سید اُردو اور انگریزی حصوں کے نگران اُستاد تھے جبکہ اقبال آفاقی اور سید اظہر علی بخاری بالترتیب حصہ اُردو اور انگریزی کے طالب علم مدیران تھے۔

(54) جون 1967ء یہ شمارہ پرنسپل غلام سرور کی سرپرستی میں شائع ہوا۔ پروفیسر حامد حسن سید اُردو اور انگریزی حصوں کے نگران اُستاد تھے جبکہ اقبال آفاقی اور سید اظہر علی بخاری بالترتیب حصہ اُردو اور انگریزی کے طالب علم مدیران تھے۔

(55) دسمبر 1967ء اس شمارہ کے سرپرست پرنسپل غلام سرور تھے۔ پروفیسر حامد حسن سید اُردو اور انگریزی حصوں کے نگران استاد تھے جبکہ ریاض مفتی اور شاہد سرور بالترتیب حصہ اُردو اور انگریزی کے طالب علم مدیران تھے۔ یہ شمارہ جوبلی نمبر کے طور پر شائع ہوا۔

(56) جون 1968ء پرنسپل غلام سرور کی سرپرستی میں شائع ہوا۔ پروفیسر حامد حسن سید اور پروفیسر محمد بشیر بالترتیب حصہ اُردو اور انگریزی کے نگران اساتذہ تھے۔ ریاض مفتی اور شاہد سرور بالترتیب حصہ اُردو اور انگریزی کے طالب علم مدیران تھے۔ مجلہ شاہین کے اس شمارہ میں پنجابی حصہ کی اشاعت کا آغاز ازسرِ نو ''دیس بہار'' کے نام سے کیا گیا۔ حصہ پنجابی کے نگران استاد پروفیسر احمد حسین قریشی قلعداری تھے جبکہ طالب علم مُدیر چوہدری ذکاء اللہ تھے۔

(57) دسمبر 1968ء پرنسپل غلام سرور کی سرپرستی میں شائع ہوا۔ پروفیسر حامد حسن سید، پروفیسر محمد بشیر اور پروفیسر احمد حسین قریشی قلعداری بالترتیب حصہ اُردو، انگریزی اور پنجابی کے نگران اساتذہ تھے جبکہ ارشد ملک، محمد حنیف اور چوہدری محمد ریاض بالترتیب اُردو، انگریزی اور پنجابی حصہ کے طالب علم مدیران تھے۔

(58) جون 1969ء یہ شمارہ غالب کی سوسالہ برسی کی وجہ سے 'غالب نمبر' کے طور پر پرنسپل غلام سرور کی سرپرستی میں شائع ہوا۔ پروفیسر حامد حسن سید، پروفیسر محمد بشیر اور پروفیسر احمد حسین قریشی بالترتیب حصہ اُردو، انگریزی اور پنجابی کے نگران اساتذہ تھے جبکہ ارشد ملک، محمد حنیف اور چوہدری محمد ریاض بالترتیب حصہ اُردو، انگریزی اور پنجابی کے طالب علم مدیران تھے۔

(59) دسمبر 1969ء یہ شمارہ پرنسپل محمد فرمان کی سرپرستی میں شائع ہوا۔ پروفیسر حامد حسن سید، پروفیسر محمد بشیر اور پروفیسر احمد حسین قریشی بالترتیب حصہ اُردو، انگریزی اور پنجابی کے نگران اساتذہ تھے جبکہ سجاد الرحمان اور افتخار احمد بالترتیب حصہ اُردو اور انگریزی کے طالب علم مدیران تھے۔

(60) جون 1970ء سرپرست پرنسپل محمد فرمان تھے۔ پروفیسر عبدالواحد، پروفیسر محمد بشیر اور پروفیسر احمد حسین قریشی بالترتیب حصہ اُردو، انگریزی اور پنجابی کے نگران اساتذہ تھے۔ سجاد الرحمان، افتخار احمد اور نذیر گوندل بالترتیب حصہ اُردو، انگریزی اور پنجابی کے طالب علم مدیران تھے۔

(61) دسمبر 1970ء پرنسپل محمد فرمان کی سرپرستی میں شائع ہوا۔ پروفیسر عبدالواحد، پروفیسر حاجی مسعود احمد خان اور پروفیسر احمد حسین قریشی بالترتیب حصہ اُردو، انگریزی اور پنجابی کے نگران اساتذہ تھے۔ عزیز احمد، خالد بشیر اور محمد اکرم عابد بالترتیب حصہ اُردو، انگریزی اور پنجابی کے طالب علم مدیران تھے۔

(62) جون 1971ء پرنسپل محمد فرمان کی سرپرستی میں شائع ہوا۔ پروفیسر عبدالواحد، پروفیسر حاجی مسعود احمد خان اور پروفیسر احمد حسین قریشی بالترتیب حصہ اُردو، انگریزی اور پنجابی کے نگران اساتذہ تھے۔ عزیز احمد، خالد بشیر اور محمد اکرم عابد بالترتیب حصہ اُردو، انگریزی اور پنجابی کے طالب علم مدیران تھے۔

(63)   دسمبر 1973ء پرنسپل محمد فرمان کی سرپرستی میں شائع ہوا۔ پروفیسر محمد بشیر (شعبہ انگریزی) مجلسِ ادارت کے صدر تھے۔ پروفیسر عبدالواحد، پروفیسر حاجی مسعود احمد خان اور پروفیسر احمد حسین قریشی بالترتیب حصہ اُردو، انگریزی اور پنجابی کے نگران اساتذہ تھے۔ سیرت اصغر جوڑا، خالد محمود اور فدا الرحمان قادری بالترتیب حصہ اُردو، انگریزی اور پنجابی کے طالب علم مدیران تھے۔

(64)   جون 1973ء تا دسمبر 1973ء سرپرست پرنسپل محمد فرمان تھے۔ نگران اعلیٰ پروفیسر محمد بشیر (شعبہ انگریزی) تھے۔ پروفیسر عبدالواحد، پروفیسر حاجی مسعود احمد خاں اور پروفیسر احمد حسین قریشی بالترتیب حصہ اُردو، انگریزی اور پنجابی کے نگران اساتذہ تھے۔ سیرت اصغر جوڑا، خالد محمود بالترتیب حصہ اُردو، انگریزی اور پنجابی کے طالب علم مدیران تھے۔

(65)   دسمبر 1974ء پرنسپل محمد فرمان کی سرپرستی میں شائع ہوا۔ پروفیسر عبدالواحد، پروفیسر حاجی مسعود احمد خاں اور پروفیسر احمد حسین قریشی قلعداری بالترتیب حصہ اُردو، انگریزی اور پنجابی کے نگران اساتذہ تھے جبکہ شہزاد پرویز اور کشو عنایت بالترتیب حصہ اُردو اور پنجابی کے طالب علم مدیران تھے۔

(66)   دسمبر 1975ء اس شمارہ کے سرپرست پرنسپل محمد فرمان تھے۔ پروفیسر عبدالواحد اور پروفیسر احمد حسین قریشی بالترتیب حصہ اُردو اور پنجابی کے نگران اساتذہ تھے جبکہ عامر مفتی آزاد اور افتخار حسین بالترتیب حصہ اُردو اور پنجابی کے طالب علم مدیران تھے۔ یہ شمارہ قائداعظم نمبر کے طور پر شائع ہوا۔ حصہ انگریزی شائع نہ ہوا۔

(67)   دسمبر 1978ء پرنسپل محمد یعقوب کی سرپرستی میں شائع ہوا۔ پروفیسر حامد حسن سید مجلس ادارت کے صدر تھے۔ پروفیسر احمد حسین قریشی قلعداری نے اُردو حصہ کی نگرانی کی جبکہ عرفان اللہ خاں طالب علم مدیر برائے حصہ اُردو تھے۔ اس شمارہ میں حصہ انگریزی اور پنجابی شائع نہ ہوا۔ یہ شمارہ سیرت نمبر کے طور پر شائع ہوا۔

(68)   دسمبر 1982ء پرنسپل فضل حسین کی سرپرستی میں شائع ہوا۔ پروفیسر عبدالواحد حصہ اُردو کے نگران استاد تھے جبکہ مسعود ربانی طالب علم مدیر برائے حصہ اُردو تھے۔ اس شمارہ میں حصہ انگریزی اور پنجابی شامل نہیں ہے۔

(69)   جون 1983ء پرنسپل چوہدری فضل حسین کی سرپرستی میں شائع ہوا۔ پروفیسر عبدالواحد نگران اُستاد برائے حصہ اُردو اور پروفیسر بہاؤالحق نگران اُستاد برائے حصہ پنجابی تھے۔ پنجابی حصہ 15 صفحات پر مشتمل ہے۔ مسعود احمد ربانی طالب علم مدیر برائے حصہ اُردو تھے۔

(70)   جنوری 1984ء پرنسپل چوہدری فضل حسین کی سرپرستی میں شائع ہوا۔ اس شمارہ کے نگران اعلیٰ پروفیسر حامد حسن سید تھے۔ نگران اساتذہ برائے حصہ اُردو پروفیسر ڈاکٹر احمد حسین قریشی قلعداری اور پروفیسر عبدالواحد نگران اُستاد برائے حصہ پنجابی اور انگلش بالترتیب بہاؤالحق اور پروفیسر حامد حسن سید و لطیف بھٹی تھے۔ فرخ الحسن اور احمد سہیل و سجاد احمد قریشی بالترتیب حصہ پنجابی اور انگریزی کے طالب علم مدیران تھے۔

(71)   جون 1986ء اس شمارہ کے سرپرست چوہدری فضل حسین پرنسپل تھے۔ نگران پروفیسر سیف الرحمٰن سیفی تھے۔ پنجابی حصہ کے نگران پروفیسر بہاؤالحق تھے۔ ظہور احمد انجم طالب علم مدیر برائے حصہ اُردو تھے۔ ساجد اللہ بٹ مدیر برائے حصہ پنجابی تھے۔

(72)   دسمبر 1987ء سرپرست پرنسپل چوہدری فضل حسین تھے۔ نگران پروفیسر ڈاکٹر احمد حسین قریشی قلعداری تھے۔ پروفیسر منیر الحق حصہ اُردو کے نگران تھے۔ پروفیسر بہاؤالحق حصہ پنجابی کے نگران تھے۔ نبیلہ جمیل ایم اے فائنل اور ایس ایم عارف سال سوم طالب علم مدیران

برائے حصہ اُردو تھے۔ پنجابی حصہ صرف ایک مضمون پر مشتمل ہے۔

(73) دسمبر 1988ء پرنسپل فضل حسین کی سرپرستی میں شائع ہوا۔ مدیرِ منتظم پروفیسر منیر الحق کعبی تھے۔ پنجابی اور انگریزی حصہ کے نگران اساتذہ بالترتیب پروفیسر بہاؤالحق اور پروفیسر غلام عباس تھے۔ طالب علم مدیران برائے حصہ اُردو نبیلہ جمیل اور برائے حصہ انگریزی اقبال بانو کرامت تھیں۔علی اصغر اور فاخرہ حصہ انگریزی کے سب ایڈیٹر تھے۔ پنجابی حصہ اُردو میں شامل تھا۔ یہ سال کالج کی گولڈن جوبلی کا سال تھا اس لیے شاہین گولڈن جوبلی نمبر کے طور پر شائع ہوا۔

(74) دسمبر 1989ء یہ شمارہ پروفیسر ڈاکٹر محمد یعقوب کی سرپرستی میں شائع ہوا۔ پروفیسر عبدالواحد و منیر الحق کعبی مدیر اعلیٰ (نگران برائے حصہ اُردو) جبکہ پنجابی حصہ کے نگران پروفیسر بہاؤالحق تھے۔انگریزی حصہ کے نگران پروفیسر ارشاد علی اور پروفیسر چوہدری منیر احمد تھے۔ کلیم احسان بٹ و عظمیٰ بشارت طالب علم مدیران برائے حصہ اُردو تھے۔رسول بخش طالب علم مدیر برائے حصہ پنجابی تھے جبکہ مس فرح صفدر، مجاہد کریم اور سعدیہ بنی (جائنٹ ایڈیٹر) طالب علم مدیران برائے حصہ انگریزی تھے۔

(75) 1993-1992ء پرنسپل چوہدری محمد احسن کی سرپرستی میں شائع ہوا۔نگران اساتذہ میں پروفیسر عبدالواحد پروفیسر مظہر اکبر اور پروفیسر طارق محمود طارق کے نام شامل تھے۔ جبکہ طالبات غزالہ طاہرہ اور تبسم قریشی مُدیران تھیں۔حصہ انگریزی کے نگران پروفیسر غلام عباس تھے جبکہ عفت بتول، مرزا سہیل بیگ اور ایس تنویر حصہ انگریزی کے طالب علم مدیران تھے۔اس شمارہ میں 14 صفحات پر مشتمل حصہ فارسی بھی شائع ہوا۔

(76) جون 1994ء تا جون 1995ء پرنسپل پروفیسر چوہدری محمد احسن کی سرپرستی میں شائع ہوا۔نگرانِ اعلیٰ پروفیسر چوہدری اللہ دتہ تھے۔ پروفیسر منیر الحق کعبی اور پروفیسر کلیم احسان بٹ نگران اساتذہ برائے حصہ اُردو تھے۔ پروفیسر بہاؤالحق عارف نگران استاد برائے حصہ پنجابی جبکہ پروفیسر غلام عباس اور پروفیسر اقبال بٹ نگران اساتذہ برائے حصہ انگریزی تھے۔نیلم رشید، توقیر اشرف اور سید انصر محمود حصہ اُردو کے طالب علم مُدیران تھے۔عارف مسعود فاروقی، عفت سید اور فرخ امتیاز حصہ انگریزی کے طالب علم مُدیران تھے۔فارسی حصہ بھی شائع ہوا۔نگران استاد پروفیسر سیف الرحمٰن سیفی تھے۔ پروفیسر سید صابر علی، پروفیسر شیخ عبدالرشید، پروفیسر محمد اسلم اعوان اور پروفیسر انعام الحق راشد مجلسِ مشاورت کے اراکین تھے۔

(77) 1997-1996ء پروفیسر خادم حسین پرنسپل کی سرپرستی میں شائع ہوا۔ مدیر پروفیسر کلیم احسان بٹ تھے۔مجلسِ مشاورت میں پروفیسر مظہر اکبر، پروفیسر محمد لطیف بھٹی، پروفیسر سیف الرحمٰن سیفی اور پروفیسر بہاؤالحق شامل تھے۔ طالب علم مُدیران میں نرگس آراء اور حافظ نصر اللہ وڑائچ کے نام شامل تھے۔حصہ انگریزی کے مدیرِ اعلیٰ پروفیسر محمد لطیف بھٹی تھے۔سید سعادت مہدی اور چوہدری محمد شہناز مجلسِ مشاورت کے اراکین تھے۔طالب علم مدیران میں کاشف ندیم، سعدیہ مظفر، مظہر الحق، محمد احتشام، ندیم رانا، منیرہ ظفر، راحت اقبال، عالیہ عارف اور مبشر کے نام شامل تھے۔حصہ پنجابی ''پنجاب رنگ'' کے نام سے شائع ہوا۔شاہین کا یہ شمارہ پاکستان کی گولڈن جوبلی کے حوالہ سے ترتیب دیا گیا۔

(78) 1998۔1997ء پرنسپل خادم حسین کی سرپرستی میں شائع ہوا۔کلیم احسان بٹ (شعبہ اُردو) نے ادارت کی۔ پروفیسر بہاؤالحق عارف، پروفیسر حکیم صابر علی، پروفیسر انعام راشد، پروفیسر شیخ عبدالرشید اور پروفیسر راشد اللہ بٹ مجلسِ ادارت کے اراکین تھے۔مبشر علی، نرگس

آراء، سعید حسین اور افشیں مقصود طالب علم مدیران تھے۔ یہ شمارہ پنجابی، اُردو اور انگریزی حصوں پر مشتمل تھا۔

(79) 1998-1999ء اس شمارہ کے سرپرست پروفیسر خادم حسین پرنسپل تھے جبکہ مدیر کلیم احسان بٹ لیکچرر شعبہ اُردو تھے۔ پروفیسر بہاؤالحق، پروفیسر انعام راشد، پروفیسر شیخ عبدالرشید اور پروفیسر راشد اللہ بٹ مجلسِ مشاورت کے اراکین تھے۔ جبکہ طلبہ میں ضمیر الحسن ندیم، نوید یعقوب تطہیر طاہرہ اور بشریٰ آرزو کے نام شامل تھے۔ شمارہ اُردو، پنجابی اور انگریزی حصوں پر مشتمل تھا۔

(80) جون 2001ء یہ شمارہ پرنسپل مقصود اختر کی سرپرستی میں شائع ہوا۔ سیف الرحمٰن سیفی، انعام الحق راشد اور شمسہ ضیاء مجلس ادارت کے اراکین تھے جبکہ منیر الحق کعبی، کلیم احسان بٹ اور سید وقار افضل مجلسِ اشاعت کے اراکین تھے۔ پنجابی حصہ کے مدیرِ اعلیٰ بہاؤالحق عارف اور مدیر وسیم رضا گردیزی تھے جبکہ معاون مدیر خرم شہزاد تھے۔ حصہ انگریزی کے مدیر اعلیٰ جاوید اقبال باجوہ تھے اور مدیر راجہ راشد اللہ بٹ تھے جبکہ طالب علم مدیران میں سنبل جاوید، ابتسام فاطمہ اور چوہدری وحید الدین احمد کے نام شامل ہیں۔

(81) 2005-2006ء یہ شمارہ پرنسپل چوہدری محمد ریاض کی سرپرستی میں شائع ہوا۔ پروفیسر منیر الحق کعبی اور پروفیسر کلیم احسان بٹ مدیرِ منتظم تھے جبکہ پروفیسر ریاض احمد اور پروفیسر سید وقار افضل معاون مدیر تھے۔ طالب علم مدیران میں فوزیہ جبیں اور عائشہ میر کے نام شامل تھے۔ حصہ پنجابی کے مدیر پروفیسر سید وسیم رضا گردیزی تھے اور حصہ انگریزی کے مدیر پروفیسر محمد انور وڑائچ تھے۔

(82) 2008-2009ء پرنسپل چوہدری محمد ممتاز وڑائچ کی سرپرستی میں شائع ہوا۔ نگران مدیر طارق محمود طارق (اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ اردو) تھے۔ مدیر اعلیٰ کلیم احسان بٹ (لیکچرر شعبہ اُردو) تھے۔ محمد اقبال بٹ (A.P.Eng)، سید وقار افضل (لیکچرر شعبہ اُردو) اور سید وسیم گردیزی (لیکچرر شعبہ پنجابی) بالترتیب حصہ انگریزی، اُردو اور پنجابی کے مدیر تھے۔ حمیرا ریاض (ایم اے اُردو سالِ مؤخر) اور عاقب یونس (ایف ایس سی II) طالب علم مدیران تھے۔

(83) 2009-2010ء پروفیسر چوہدری محمد ممتاز وڑائچ (پرنسپل) کی سرپرستی میں شائع ہوا۔ مدیرِ اعلیٰ پروفیسر طارق محمود طارق (صدر شعبہ اُردو)، انچارج اشاعت پروفیسر ریاض احمد (شعبہ سیاسیات) تھے۔ کلیم احسان بٹ (لیکچرر شعبہ اُردو) اور سید وقار افضل (لیکچرر شعبہ اُردو) مدیرانِ شاہین تھے۔ مدیر حصہ پنجابی ڈاکٹر وسیم رضا گردیزی تھے جبکہ برائے حصہ انگریزی راشد بٹ (لیکچرر انگریزی) مدیر اور محمد جاوید ساغر (لیکچرر شعبہ انگریزی) معاون مدیر تھے۔ صبا ارشد (ایم اے اُردو سالِ مؤخر) اور فواد احمد (ایم اے اردو سال اول) طالب علم مدیران برائے حصہ اُردو تھے جبکہ وقاص (ایم اے انگلش پارٹ ٹو) اور ثنا (ایم اے انگلش پارٹ ٹو) طالب علم مدیران برائے حصہ انگریزی تھے۔

(84) 2010-2011ء پرنسپل چوہدری ممتاز وڑائچ کی سرپرستی میں شائع ہوا۔ پروفیسر غلام عباس (شعبہ انگریزی) چیف ایڈیٹر تھے جبکہ پروفیسر ریاض احمد (شعبہ سیاسیات) ایڈیٹر تھے۔ ڈاکٹر وسیم رضا گردیزی (لیکچرر شعبہ پنجابی) حصہ پنجابی کے مدیر تھے۔ پروفیسر محمد اقبال بٹ، پروفیسر ظفر ہاشمی، راشد بٹ (لیکچرر شعبہ انگریزی) اور محمد جاوید ساغر (لیکچرر شعبہ انگریزی) حصہ انگریزی کے مدیران تھے۔ سید وقار افضل (لیکچرر شعبہ اُردو) اور خاور مہدی (لیکچرر شعبہ اُردو) مدیرانِ شاہین تھے۔ سائرہ بشیر (ایم اے اُردو سال دوم) اور فاطمہ اعجاز (ایم اے انگلش سال اول) بالترتیب حصہ اُردو اور انگریزی کی مدیران تھیں۔ معاونین میں فواد احمد (ایم اے اُردو سال دوم)، زینب (ایم اے اُردو سال

دوم)، عنبرین امجد (ایم اے اُردو سال اول) اور مبشر صفدر (تھرڈ ایئر) شامل تھے۔

(85) 2012-2011ء پرنسپل چوہدری محمد ممتاز وڑائچ کی سرپرستی میں شائع ہوا۔ پروفیسر سید وقار افضل (شعبہ اُردو) مدیر مجلہ شاہین جبکہ پروفیسر ریاض احمد (صدر شعبہ سیاسیات) مدیرِ منصرم تھے۔ پروفیسر محمد مہدی خاور (شعبہ اُردو)، ڈاکٹر وسیم رضا گردیزی (صدر شعبہ پنجابی) اور پروفیسر راشد بٹ (شعبہ انگریزی) بالترتیب اُردو، پنجابی اور انگریزی حصوں کے مُدیر تھے۔ معاون مدیران میں پروفیسر سید سعادت مہدی (شعبہ انگریزی) اور پروفیسر محمد جاوید ساغر (شعبہ انگریزی) کے نام شامل تھے۔ عنبرین امجد وابوبکر فاروقی (ایم اے اُردو سال دوم) اور فاطمہ اعجاز (ایم اے انگلش سال دوم) بالترتیب حصہ اُردو اور انگریزی کے طالب علم مُدیران تھے۔ معاونین میں سیدہ دُرِّشہوار (ایم اے اُردو سال اول) اور عبداللہ بن عارف (ایف ایس سی سال دوم) شامل تھے۔

(86) 2013-2012ء پرنسپل چوہدری محمد ممتاز وڑائچ اس شمارہ کے سرپرست ہیں۔ نگران استاد برائے حصہ اُردو پروفیسر وقار افضل اور طالب علم مُدیر محمد سعید (سال چہارم)، نگران استاد برائے حصہ پنجابی ڈاکٹر وسیم رضا گردیزی ہیں جبکہ برائے حصہ انگریزی پروفیسر راشد بٹ نگران اُستاد ہیں۔ یہ شمارہ کالج کی پلاٹینم جوبلی کے حوالہ سے پلاٹینم جوبلی نمبر ہے۔ اس مجلہ کے ٹائٹل پر سن 14-2013ء ہے جبکہ پون صدی کے عنوان سے جو میرے لکھے ہوئے مضمون میں اس کا سن 13-2012ء ہے۔ جو ترتیب اوپر آرہی ہے اس کے مطابق تو 13-2012ء ہی ہونا چاہیے ممکن ہے سرورق پر ہی کمپوزنگ کی غلطی ہو۔

(87) 2016-2015ء سرپرست پروفیسر چوہدری محمد ممتاز وڑائچ پرنسپل، نگران پروفیسر چوہدری اشفاق حسین وائس پرنسپل، مدیر اعلیٰ سید وقار افضل (اسسٹنٹ پروفیسر شعبہء اردو)، مدیر حصہ پنجابی ڈاکٹر سید وسیم رضا گردیزی (اسسٹنٹ پروفیسر شعبہء پنجابی)، مدیر حصہ انگریزی راشد اللہ بٹ (اسسٹنٹ پروفیسر شعبہء انگریزی)، مدیر حصہ اردو محمد مہدی خاور (شعبہء اردو)، معاون مدیران ملک غلام ربانی (لیکچرر شعبہء اردو)، احمد عطا (لیکچرر شعبہء اردو)، چوہدری شہزاد منور (شعبہء سیاسیات)، طالب علم مدیران:۔ شیبا اختر، محسن شہزاد (شعبہء اردو)، عروج، اقراء، بی اے (سال سوم)، اسامہ وڑائچ (ایف۔ ایس سی)۔

(88) 2018-2017ء سرپرست پروفیسر عبیداللہ پرنسپل، نگران پروفیسر غلام عباس وائس پرنسپل، مدیر اعلیٰ سید وقار افضل (اسسٹنٹ پروفیسر شعبہء اردو)، مدیر حصہ انگریزی راشد اللہ بٹ (اسسٹنٹ پروفیسر شعبہء انگریزی)، مدیر حصہ پنجابی ڈاکٹر سید وسیم رضا گردیزی (اسسٹنٹ پروفیسر شعبہء پنجابی)، معاون مدیران:۔ محمد جاوید ساغر، محمد مہدی خاور، سید عامر علی، طالب علم مدیران:۔ محسن شہزاد، ردا ناز، صفورا مریم (شعبہء اردو)۔ سید محمد احسن، فائزہ صابر چوہدری (شعبہء انگریزی)

مندرجہ بالا معلومات کے مطابق آغاز سے اب تک شاہین کے تقریباً 88 شمارے شائع ہو چکے ہیں۔ اس لحاظ سے موجودہ شمارہ (مجلہ شاہین کا) 89واں شمارہ قرار دیا جائے گا۔

نتائج :

احمد حسین قلعداری کی فہرست میں ایک شمارہ دسمبر 1945 کا ہے جبکہ ریکارڈ اور ''توضیحی فہرست مجلہ شاہین۔۔'' کے مطابق یہ شمارہ نومبر 1945ء کا ہے۔ اس شمارہ کی تفصیلات ہر جگہ ایک جیسی ہیں لہٰذا اسے احمد حسین احمد کی فہرست میں کتابت کی غلطی گردانہ جاسکتا ہے۔

مئی 1962ء کا شمارہ احمد حسین قلعداری کی فہرست میں شامل نہیں ہے۔ ''مئی 1963ء'' کی جو تفصیلات احمد حسین قلعداری نے لکھی ہیں وہ ''توضیحی فہرست مجلہ شاہین'' کے مطابق ''مئی 1963ء'' کے شمارے کی ہیں۔ لہٰذا قیاس کیا جاسکتا ہے کہ یہ ایک ہی شمارہ ہو۔

اپریل 1944ء کے شمارے کا ذکر احمد حسین قلعداری کی فہرست میں نہیں ہے جبکہ ''توضیحی فہرست مجلہ شاہین'' میں یہ شمارہ شامل ہے اور لائبریری ریکارڈ میں بھی یہ شمارہ موجود ہے۔

جون 1951ء کے شمارے کا ذکر احمد حسین قلعداری کی فہرست اور لائبریری ریکارڈ میں نہیں ہے جبکہ ''توضیحی فہرست مجلہ شاہین'' میں یہ شمارہ شامل ہے۔

''مارچ 1946''، ''جون 1946'' اور ''دسمبر 1946'' کو احمد حسین قلعداری کی فہرست میں بالترتیب ''مارچ 1945''، ''جون 1944'' اور ''دسمبر 1944'' لکھا گیا ہے۔ یہ کتابت کی غلطی ہے۔

مجلہ شاہین کے سب سے زیادہ شمارے پرنسپل غلام سرور کی سرپرستی میں شائع ہوئے۔ اُنہوں نے کل 25 شمارے دسمبر 1952ء سے جون 1969ء تک شائع کروائے۔

دوسرے نمبر پر تاج محمد خیال پرنسپل کی سرپرستی میں نومبر 1942ء سے فروری 1951ء تک کل 22 شمارے شائع ہوئے۔

ڈاکٹر محمد جہانگیر خان نے دسمبر 1939ء سے جون 1942ء تک 8 شمارے شائع کروائے۔

پرنسپل محمد فرمان نے دسمبر 1969ء سے دسمبر 1975ء تک 8 شمارے شائع کروائے۔ پرنسپل چوہدری فضل حسین نے دسمبر 1982ء سے دسمبر 1988ء تک 6 شمارے شائع کروائے۔

پرنسپل خادم حسین نے 1996ء سے 1999ء تک 3 شمارے شائع کروائے۔ پرنسپل چوہدری محمد احسن نے 93-1992ء اور 95-1994ء کے دو شمارے شائع کروائے۔ سید شبیر حسین بخاری نے شاہین کا سب سے پہلا شمارہ اور اپنی سرپرستی میں پہلا اور آخری شمارہ شائع کروایا۔ پرنسپل علاؤالدین احمد نے دسمبر 1951ء کا ایک شمارہ شائع کروایا۔ پرنسپل محمد یعقوب نے دسمبر 1978ء اور دسمبر 1989ء کے دو شمارے شائع کروائے۔ پرنسپل مقصود اختر نے 2001ء اور پرنسپل چوہدری محمد ریاض نے 06-2005ء کا ایک ایک شمارہ شائع کروایا۔

موجودہ پرنسپل چوہدری محمد ممتاز بشمول پلاٹینم جوبلی نمبر پانچ شمارے شائع کروانے کا شرف حاصل کر چکے ہیں۔

بمطابق ''توجیحی فہرست مجلہ شاہین'' پرنسپل علاؤالدین احمد نے شاہین کا کوئی شمارہ شائع نہ کیا جبکہ احمد حسین قلعداری کی فہرست کے مطابق دسمبر 1951ء کا شمارہ پرنسپل علاؤالدین احمد کی سرپرستی میں شائع ہوا۔

شاہین کے معیار کو بہتر بنانے میں نگران اساتذہ کی رہنمائی ہمیشہ پیش پیش رہی۔ پروفیسر محمد فرمان، پروفیسر حامد حسن سید، احمد حسین احمد قریشی قلعداری اور پروفیسر اندر ناتھ نے بالترتیب اُردو، انگریزی، پنجابی اور ہندی حصوں کی سب سے زیادہ مرتبہ نگرانی کی۔ انھوں نے بالترتیب 18، 16، 10 اور 13 شاہین کے شماروں میں بطور نگران اساتذہ کام کیا۔ (رہنمائی کی)۔

مارچ 1940ء سے مارچ 1944ء تک کے 12 شماروں میں ہندی حصہ شائع ہوتا رہا۔ تاہم اس کے بعد یہ حصہ شائع نہ ہوا اور

اس کی اشاعت مکمل طور پر بند ہوگئی۔ اس حصہ کے نگران پروفیسر اندر ناتھ رہے۔

جون 1968ء سے پنجابی حصہ کی اشاعت کا آغاز کیا گیا اور یہ حصہ دیس بہار کے عنوان سے شائع ہوا۔ جس کی نگرانی احمد حسین احمد قریشی نے کی۔

1992-93ء اور 1994-95ء کے شماروں میں فارسی حصہ بھی شائع ہوا جس کے نگران پروفیسر سیف الرحمٰن سیفی تھے۔

شاہین کے 75 سالہ سفر میں تاریخی، ادبی اور اسلامی تہوار اور شخصیات کے حوالے سے مخصوص شمارے بھی شائع کیے گئے۔ دسمبر 1967ء کا شاہین جوبلی نمبر، شاہین جون 1969ء غالب نمبر، شاہین دسمبر 1975ء قائداعظم نمبر، شاہین دسمبر 1978ء اقبال نمبر اور شاہین دسمبر 1981ء سیرت نمبر کے طور پر شائع ہوا۔ اسی طرح 1988ء چونکہ کالج کا گولڈن جوبلی سال تھا اس لیے 'شاہین' دسمبر 1988ء گولڈن جوبلی نمبر کے طور پر شائع ہوا۔ شاہین 1996-97ء پاکستان کی گولڈن جوبلی کے حوالہ سے اشاعت پزیر ہوا۔ اسی طرح زمیندار کالج کے قیام کے پچھتر سال پورے ہونے پر شاہین 2012-13ء کو پلاٹینم جوبلی نمبر کے عنوان سے شائع کیا گیا۔

شاہین نے بہت سے نامور شعراء اور ادبا کی نشوونما کا کام کیا۔ ان میں پروفیسر انور مسعود، فضل حق، فخر زمان، ڈاکٹر احمد حسین احمد قریشی قلعداری اور دنیا کے کم عمر ترین، جسٹس محمد الیاس شامل ہیں۔

آخر میں سربراہِ ادارہ سے درخواست ہے کہ شاہین کے ریکارڈ کو بہتر انداز میں محفوظ کرنے کی طرف توجہ دی جائے اور جتنے شمارے ریکارڈ میں موجود ہیں ان کو ہر نئے شائع ہونے والے شمارے کے ساتھ نہ صرف لائبریری کے کمپیوٹرائزڈ نظام کے مطابق محفوظ کیا جائے بلکہ لائبریری کی آرکائیوز کا حصہ بنایا جائے۔ تاکہ آنے والی نسلیں اس علمی و ادبی ورثے تک آسانی سے رسائی حاصل کرسکیں۔

پریم چند کی افسانہ نگاری

اسماء

ایم،اے۔اردوسال دوم

پریم چند 1880ء کوضلع بنارس کے ایک گاؤں لمہی میں پیدا ہوئے۔ان کے والد عجائب لال ڈاک خانے میں ملازم تھے اوران کا تعلق ایک کائستھ خاندان سے تھا۔ان کے والد نے ان کا نام دھنپت رائے رکھا۔سوتیلی ماں کا برتاؤ پریم چند کے ساتھ اچھا نہیں تھا۔والد نے ان کی ابتدائی تعلیم کا انتظام گھر پر ہی ایک مولوی کی نگرانی میں کر دیا،جن سے پریم چند نے کچھ عربی اور فارسی پڑھی۔پھر ان کے والد کا تبادلہ گورکھپور ہوا تو وہ ایک سکول میں داخل کرا دیے گئے۔

پریم چند نے خاصی مشکلوں بھری زندگی کے باوجود اپنی تعلیم جاری رکھی۔انیس برس کی عمر میں وہ نائب مدرس بنا دیے گئے۔بی۔اے پاس کرنے کے بعد پہلے تو وہ یو۔پی کے مختلف سکولوں میں پڑھانے کا کام کرتے رہے،پھر 1909ء میں سب ڈپٹی انسپکٹر آف سکولز کے منصب پر فائز کر دیے گئے۔پڑھنے لکھنے کا شوق برقرار تھا۔لہٰذا ملازمت کے ساتھ ساتھ انھوں نے ادب کی دنیا سے بھی تعلق رکھا۔"زمانہ" کان پور اور اس کے ایڈیٹر منشی دیانرائن نگم سے پریم چند کے خصوصی مراسم تھے۔16 سال کی عمر میں 1896ء میں ان کی پہلی شادی ہوئی۔دوسری شادی 1906ء میں ہوئی۔

انجمن ترقی پسند مصنفین کی پہلی کانفرنس "منعقدہ 15 اپریل 1936ء کے افتتاحی اجلاس کی صدارت پریم چند نے کی۔اپنے عہد کے روشن خیال لکھنے والوں کے لیے پریم چند کی حیثیت ایک رول ماڈل کی تھی۔ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس میں پریم چند کے خطبۂ صدارت کی حیثیت ایک تاریخی دستاویز کی ہے،اور پریم چند اپنی اس روایت میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔

ان کا پہلا افسانوی مجموعہ "سوزوطن" 1909ء میں شائع ہوا۔"1907ء" میں ان کا پہلا افسانہ شائع ہوا۔

پہلا افسانہ:۔"دنیا کا سب سے انمول رتن"

ان کا مشہور ومعروف افسانہ "کفن" 1936ء میں شائع ہوا۔ان کا انتقال 1936ء میں ہوا۔

پریم چند کے چچا ان کو "نواب رائے" کہتے تھے،پریم چند بیک وقت اردو اور ہندی دونوں میں افسانے لکھتے تھے،کیوں کہ ان کو اردو اور ہندی دونوں زبانیں آتی تھیں۔

اردو ادب کی تاریخ میں درج ذیل تین ناموں نے بیک وقت اردو اور ہندی میں مسلسل کام کیا۔

:1۔پریم چند

:2۔بلونت سنگھ

:3۔اوپندر ناتھ اشک

پریم چند کے افسانوں کا بنیادی موضوع "غربت اور استحصال"

پریم چند کے افسانوں کا بنیادی موضوع غربت اور استحصال ہے۔ذات پات کے نظام کی وجہ سے استحصال کیا جاتا ہے۔ہندوؤں

کی دیکھا دیکھی مسلمانوں میں بھی ذات پات کا نظام فروغ پا چکا ہے۔ جب کسی معاملے میں کسی انسان کا استحصال نہ ہو تو وہ اپنی اصلیت قائم رکھتی ہے، رکھتا ہے۔

جب کسی معاملے میں کسی انسان کا استحصال ہو تو وہ اپنی اصلیت کھو بیٹھتا ہے۔ ازل سے انسان کو جب بھی اور جہاں بھی موقع ملا اس نے دوسروں کا استحصال کیا۔

ایک اگر انسان دوسرے انسان سے محفوظ نہیں تو پھر اس ملک یا اس معاشرے میں موجود مذہب، حکومت اور قانون کا کوئی فائدہ نہیں، معاشرے کے اندر جو تبدیلیاں ہوتی ہیں ان تبدیلیوں کے پیچھے جو وجوہات ہوتی ہیں، انھی کو بیان کرنا لکھنے والوں کا مقصد ہوتا ہے۔ پریم چند بھی معاشرے میں موجود تمام روایات سے واقف تھے، جہاں سچائی کی بجائے جھوٹ کو اہمیت حاصل ہو، وہاں پر بھی استحصال ہوتا ہے، پریم چند اپنے قلم کے ذریعے سے معاشرے کو سمجھانے کی کوشش کی۔

پریم چند کی افسانہ نگاری ''مسعود حسین خاں'' کے مطابق

مسعود حسین خاں کے مطابق پریم چند کی افسانہ نگاری کو چار ادوار میں تقسیم کیا گیا ہے۔

:1۔ پہلا دور۔ ابتدائی کوششیں، ''1909ء'' تک

:2۔ دوسرا دور۔ تاریخی اور اصلاحی افسانوں کا دور۔ 1909ء سے لے کر 1920ء تک۔

:3۔ تیسرا دور۔ اصلاحی اور سیاسی افسانوں کا دور۔ 1920ء سے لے کر 1932ء تک۔

:4۔ چوتھا دور۔ سیاسی اور فکری افسانوں کا دور۔ 1932 سے لے کر 1936 تک۔

اگر ان ادوار کا بغور جائزہ لیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ پریم چند ایک دور سے نکل کر جلد ہی دوسرے دور میں شامل نہیں ہو جاتے، بلکہ جب وہ نئے دور میں داخل ہوتے ہیں تو اس میں پچھلے دور کے کچھ اثرات بھی نظر آتے ہیں۔ ''مسعود حسین خاں کی'' یہ تقسیم اس لیے ترجیح کے قابل ہے کہ یہاں پر اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ ان ادوار میں (پریم چند) کا موضوعاتی ارتقاء دکھائی دیتا ہے۔

''مسعود حسین خاں'' کی اس تقسیم کا پہلا دور ابتدائی کوششوں پر مشتمل ہے، اس دور کو ابتدائی کوشش کا نام اس لیے دیا گیا ہے کیوں کہ پریم چند اپنی عمر کے ابتدائی حصے میں ایک ادیب کے طور پر اردو ادب کی تاریخ میں نمودار ہوئے۔ جیسے جیسے ادیب شعور کی منازل طے کرتا ویسے ہی اس کے موضوعات میں گہرائی بھی آجاتی ہے۔ ادیب شعور کی ابتدائی دور میں جن موضوعات کو ترجیح دیتا ہے وہ تاریخ اور اصلاح کے افسانے ہیں۔ ہمارے ہاں تاریخ اور اصلاح کا بڑا گہرا تعلق ہے، تاریخ کا اہم کردار اصلاح کے لیے ادا کیا جاتا ہے۔

تاریخ کو ہمارے ہاں اصلاحی نقطہ نظر سے لکھا جاتا رہا ہے، اس لیے ادیب جب تاریخ کی بات کرتے ہیں تو اصلاح خود بخود آجاتی ہے۔ پریم چند پر بھی اسی کے اثرات مرتب ہوئے۔ پھر جب اگلے دور میں داخل ہوتے ہیں تو اس دور میں ''اصلاح'' تو رہی، لیکن ''تاریخ'' کا موضوع پیچھے چلا گیا۔ پھر پریم چند نے ''اصلاح'' کو ''سیاست'' کے ذریعے بیان کیا۔

1918ء میں پہلی عالمی جنگ ختم ہوئی۔ پریم چند کا رجحان سیاست کی طرف ہوا، لیکن مقصد اصلاح کرنا ہی تھا۔

پریم چند 52 سال کی عمر میں چوتھے دور میں داخل ہوتے ہیں۔ ان کے آخری دور کے افسانے بڑے اعلیٰ نظر آتے ہیں۔ وجہ، کیوں

کہ ان کا تجربہ اور مطالعہ واضح ہوتا جارہا تھا۔ پریم چند اپنے آخری دور میں سب سے زیادہ اپنے فنی عروج پر دکھائی دیتے ہیں۔ کیوں کہ فکری پہلو حاوی ہو چکا ہے۔ آخری دور میں سیاست کے ساتھ فکری پہلو ہے، سیاست فکری سطح پر چلی گئی ہے۔

ہر چیز کو دیکھنے کے دو رخ ہوتے ہیں۔

:1۔ سطحی اثر، سطحی اظہار

:2۔ گہرا فکری اظہار

جب کوئی ادیب کسی چیز کے بارے میں لکھتا ہے، تو اس کے پیچھے چھپے ہوئے تمام محرکات کو دیکھتا ہے، ان پر گہرا مشاہدہ کرنے کے بعد ان کو تحریری صورت دیتا ہے، پھر مذہب، سیاست، تاریخ کو اس نقطہ نظر سے دیکھتا ہے، اسی وجہ سے وہ اعلیٰ تخلیق کار بنتا ہے، اسی کو فکری سطح کہتے ہیں۔

اچھا فنکار وہ ہوتا ہے جو فن اور فکر دونوں لحاظ سے اچھا ہو، لیکن عظیم فنکار وہ ہوتا ہے جو فن اور فکر کے اعلیٰ درجے پر فائز ہوتا ہے اور اعلیٰ سطح پر پہنچ چکا ہوتا ہے۔

پریم چند اپنے آخری دور میں عظمت کی اعلیٰ سطح پر نظر آتے ہیں اپنے آخری چار سالہ دور میں ان کا فن اور فکر دونوں اعلیٰ سطح پر پہنچ چکے تھے۔ بنیادی موضوع جو ان کی فکر کو آگاہی دیتا ہے وہ سیاست اور معاشرت ہے۔

سیاست تمام اداروں پر اثر انداز ہو رہی ہے، معاشرت پر جو اثرات اثر انداز ہوتے ہیں وہ سیاست کی بنیاد پر ہی ہوتے ہیں۔

پریم چند نے پہلے شعور واضح کیا، پھر انھوں نے اپنے شعور کو اپنے افسانوں کے ذریعے قاری کو سمجھانے کی کوشش کی۔ اب پریم چند کے افسانوں کو ''مسعود حسین خاں'' کے تقسیم کردہ ادوار کے مطابق دیکھتے ہیں۔

پریم چند کے پندرہ افسانے جو انتخاب میں شامل ہیں، فکشن کی قومی اور بین الاقوامی روایات کے بعض بنیادی اور بہترین اوصاف کی ترجمانی کا حق ادا کرتے ہیں۔ ''بڑے گھر کی بیٹی'' سے ''کفن'' تک کا تخلیقی سفر، پریم چند کی ذہنی مسافت کے ساتھ ساتھ، ان کی بوجھل اور بے قرار روح کے سفر کی روداد سے بھی پردہ اٹھاتا ہے۔

''بڑے گھر کی بیٹی'' یہ افسانہ ان کے پہلے دور میں شامل ہے۔ پریم چند نے اپنی زندگی جس تخلیقی تعبیر کے لیے وقف کی، ''بڑے گھر کی بیٹی'' ان قدروں کا پہلا موثر، پرکشش اور پائیدار نقش ہے۔

پریم چند کے نزدیک گھر سماجی زندگی کی سب سے مضبوط اکائی ہے اور اس اکائی کا مرکزی حوالہ عورت ہے، عورت ہی گھر کو منظم رکھتی ہے اور اسے بکھرنے سے بچاتی ہے۔ پریم چند نے بھی اپنے اس افسانے میں اجتماعی زندگی سے وابستہ ایک اہم موضوع پر طبع آزمائی کی، یہ کہانی بھی اپنے مخصوص انداز میں انسانی رشتوں کی گرہ کھولتی ہے اور انسانی وجود کے مقصد کی وضاحت کا ایک فنکارانہ ذریعہ بنتی ہے۔

دوسرا دور:۔ 1909ء سے لے کر 1920ء تک

دوسرے دور میں دو افسانے شامل ہیں۔

:1۔ نمک کا داروغہ 1913ء

:2۔ پنچائیت 1916ء

نمک کا داروغہ:۔

اس افسانے میں پریم چند نے سماجی زندگی کی ایک تباہ کن لعنت رشوت خوری اور لالچ سے پردہ اٹھایا ہے۔ پریم چند کے زمانے میں، ہمارا معاشرہ آج کے معاشرے جیسا صارفی نہیں ہوا تھا۔ تاہم کچھ خصائص اور سچائیاں ایسی ہوتی ہیں جو انسان کی ہستی سے اس طرح چمٹی ہوئی ہوتی ہیں جن کا اثر ہر عہد کے انسان میں دیکھا جاسکتا ہے۔ دوسروں کی مجبوری سے فائدہ اٹھانا، اپنی حیثیت اور وسائل پر قانع نہ ہونا، چھوٹی چھوٹی راحتوں کے لیے بڑی قدر کی قربانی کردینا وغیرہ۔ پریم چند نے معلم اخلاقی اور واعظ کا مصنوعی لبادہ اوڑھے بغیر اس سماجی مرض کی بلا کتوں سے ہمیں آگاہ کیا ہے اور وہ اپنے تخلیقی مقاصد میں پوری طرح کامیاب ہوئے ہیں۔ یہاں نمک کو مادی زندگی کے ایک دائمی استعارے کے طور پر بھی دیکھا جاسکتا ہے۔ اس افسانے میں طبیعی پس منظر شہری زندگی کے حوالے سے ملا ہے۔۔

پنچائیت:۔

اس افسانے میں پس منظر دیہاتی زندگی کا ہے۔ ان کا دھیان اس سچائی پر مرکوز رہتا تھا کہ انسانی زندگی کے نقشے یا سماجی صورت حال بدل جانے سے انسان کے وجود میں پیوست خصلتیں نہیں بدلتیں۔ پنچائیت کی کہانی بھی اسی چیز سے ہمیں آگاہ کرتی ہے کہ انسانی قدریں اور انسانی رشتوں کا احساس، سب کچھ مادی اور طبیعی تقاضوں کا پابند ہے۔

پریم چند کی بصیرت انتہائی سنجیدہ ماحول سے بھی مزاح کا پہلو نکال لیتی ہے۔ وہ نہ تو خود قہقہہ لگاتے ہیں نہ اپنے قاری کو کھل کر ہنسنے پر آمادہ کرتے ہیں۔ لیکن ان کی شائستہ ظرافت، خوش طبعی کے اظہار کی صورتیں بہت بے ساختہ طریقے سے پیدا کرلیتی ہے۔ اس لحاظ سے ''نمک کا داروغہ'' اور ''پنچائیت'' دونوں بہت دلچسپ افسانے ہیں۔

تیسرا دور 1920ء سے لے کر 1932ء

تیسرے دور میں درج ذیل افسانے شامل ہیں۔

:1۔ شطرنج کی بازی 1924ء۔:2۔ سواسیر گہیوں 1924ء۔:3۔ مندر اور مسجد 1925ء۔:4۔ جلوس 1930ء

:5۔ پوس کی رات 1931ء۔:6۔ نجات 1931ء۔:7۔ ٹھا کر کا کنواں 1932ء

:1۔ شطرنج کی بازی:۔

پریم چند نے اس کہانی میں ملال آمیز طنز کا پیرایہ اختیار کیا ہے اور مزاح کو سنجیدگی کی شکل دے کر ایک انوکھی فضاء خلق کی ہے۔ زوال کے جس تماشے کی عکاسی شطرنج کی بازی میں کی گئی ہے، اس سے پریم چند کی طبیعت میں شامل انسانی سوز اور دردمندی کے پہلو بھی نمایاں ہوتے ہیں۔ اس افسانے کا سب سے اہم وصف اس سے جھلکنے والی تخلیقی معروضیت ہے۔ پریم چند مشکل مقامات سے بھی اس کہانی میں آسانی سے گزر گئے ہیں، خاص کر اس موقع پر جہاں بازی مرزا صاحب کے گھر سے میر صاحب کی طرف منتقل ہوتی ہے۔

:2۔ سواسیر گہیوں:۔

''سواسیر گہیوں'' پریم چند کے ان معروف افسانوں میں ہے جو ان کی حیثیت کے حقیقت پسندانہ عناصر کے ایک نقطۂ عروج سے

تعبیر کیے جاتے ہیں۔ ''سواسیر گیہوں'' کا طبقاتی حوالہ ''شطرنج کی بازی'' سے نہ صرف یکسر مختلف ہے بلکہ ایک متضاد مظہر کے طور پر بھی دیکھا جاسکتا ہے، شہر کے برعکس گاؤں کی فضاء تربیت یافتہ اور تعیش کی زندگی گزارنے والے کرداروں کے برعکس نہایت مشکل اور صبر آزما حالات میں سانس لینے والے اور تصنع اور تکلف سے معمور منظر پیش کیا گیا ہے۔ پریم چند کے طبقاتی شعور اور ان کی عام معاشرتی اور سماجی بصیرت کے مطالعے میں بھی اس قبیل کے افسانوں کی ایک خاص حیثیت ہے۔

:3۔مندر اور مسجد:۔

''مندر اور مسجد'' اپنے موضوع، مصنف کے موقف اور پلاٹ کی تشکیل میں مصنف کے مجموعی برتاؤ کے لحاظ سے بہت حساس کہانی ہے۔ مسجد اور مندر کے لفظوں کو ایک نئے مفہوم سے ہمکنار کیا ہے اور ان لفظوں کی مناسبت/ کے مناسبات اس طرح تبدیل کیے ہیں کہ اب ان سے ایک سیاسی جہت بھی وابستہ ہوگئی ہے۔ افسانے کے انجام پر مثالیت کا گمان فطری ہے، لیکن ہمیں بہر حال اس واقعے کو بھی پیش نظر رکھنا چاہیے کہ پریم چند کی حقیقت پسندی کا خاکہ ان کی مثالیت کے بغیر مکمل نہیں ہوتا۔

:4۔جلوس:۔

رومانی انقلاب پسندی کا رنگ ''جلوس'' میں اور زیادہ کھل کر سامنے آیا ہے۔ یہ کہانی پریم چند نے اس دور میں لکھی جب گاندھی کے اثر سے ہماری اجتماعی زندگی میں قومی آزادی کی تحریک کے ایک نئی ہیئت اختیار کر لی تھی۔

:5۔پوس کی رات:۔

''پوس کی رات'' واقعے سے زیادہ صورت حال اور فضا بندی کے عمل پر مبنی افسانہ ہے ''پوس کی رات'' کا دکھی اور درد گزیدہ کردار، زمانے کے جبر کی عکاسی کرتا ہے ''کفن'' میں پریم چند اپنے فن کی جس بلندی تک پہنچے ہیں اس کی پہلی آہٹ ہمیں ''پوس کی رات'' میں معلوم اور محسوس ہوتی ہے۔

:6۔نجات:۔

''نجات'' بھی ایک قوی الاثر افسانہ ہے اور پریم چند کے سخت سے سخت انتخاب میں بھی اس کی جگہ ہمیشہ محفوظ رہے گی۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ پریم چند کے اسلوب میں یہاں بھی وہی نرم روی، دھیما پن اور ضبط دکھائی دیتا ہے۔ اس طرح کی پر فریب سنگینی اس سے اردو فکشن میں کہیں اور نظر نہیں آتی۔

:7۔ٹھاکر کا کنواں:۔

''ٹھاکر کا کنواں'' بہت چھوٹی سی کہانی ہے، اس میں کس طرح کا پیچ نہیں ہے۔ ہماری آبادی کے ایک خاصے بڑھتے ہوئے حصے کو آج بھی پینے کا صاف پانی میسر نہیں ہے۔ اسی واقعہ نے اس کہانی کی بنیاد فراہم کی ہے، اعلیٰ طبقوں کے کردار کی پستی اور نچلی سطح کی زندگی گزارنے والوں کے کردار کی بلندی کا تاثر بھی اس کہانی کے ذریعہ سے اپنے آپ قائم ہوجاتا ہے۔

چوتھا دور 1932ء سے لے کر 1936ء تک۔ اس دور میں درج ذیل افسانے شامل ہیں۔

:1۔عیدگاہ 1934ء۔ :2۔نشہ 1934ء۔ :3۔دودھ کی قیمت 1934ء

:4۔بڑے بھائی صاحب 1934ء۔:5۔کفن 1936ء

:1۔عیدگاہ۔

اس افسانے میں ایک بچے کی کہانی بیان کی گئی ہے کہ وہ عید کے دن اپنی مختصر سی عیدی سے اپنے لیے کھلونا خریدنے کی بجائے بوڑھی دادی کے لیے ایک دست پناہ خرید لیتا ہے تا کہ روٹیاں بناتے وقت اس کے ہاتھ نہ جلیں۔کسی نے کہا تھا کہ دنیا کی سب سے بڑی کہانیاں وہ ہیں جو سب سے زیادہ سادہ اور بے ساختہ پیرائے میں بیان کی گئی ہوں۔''عیدگاہ'' کا سب سے بڑا وصف بھی یہی ہے۔اپنی ملال آمیز خوبصورتی کے باعث یہ کہانی پریم چند کے اچھے افسانوں میں بھی ایک علیحدہ شان رکھتی ہے۔

:2۔نشہ۔

پریم چند کے افسانوں میں ''نشہ'' پر نگاہ اس لیے ٹھہرتی ہے کہ اس سے ایک تو ان کی نفسیاتی باریک بینی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے دوسرے ان کے شعور کی وسعت اور اخلاقی مساوات سے ان کے مزاج کی مناسبت کا بھی اظہار ہوا ہے۔ہنس کی چال چلنے کے پھیر میں کوا اپنی چال کس طرح بھلا بیٹھتا ہے، اس حقیقت کی بہت دلچسپ تفسیر ''نشہ'' میں ملتی ہے۔

:3۔دودھ کی قیمت۔

پریم چند نے زیادہ لمبی عمر نہیں پائی ،لیکن ان کا تخلیقی شعور ہمیشہ سرگرم رہا۔''دودھ کی قیمت'' نامی افسانے کی وساطت سے پریم چند نے اس اندوہ ناک واقعے کی نقاب کشائی کی ہے کہ حاجت مندی اور غربت ،زندگی کی ہر قدر کو مادی نفع ونقصان کے حساب سے دیکھتی ہے، ہر مجبوری خریدی جا سکتی ہے۔

4۔بڑے بھائی صاحب:۔

افسانہ بڑے بھائی صاحب پریم چند کی انسان فہمی اور کردار نگاری کا بہت عمدہ نمونہ ہے۔اس کہانی میں مزاح اور سنجیدگی کا ملا جلا عنصر ملتا ہے۔پریم چند نے جس فطری بہاؤ کے ساتھ ظرافت اور متانت کے رنگ باہم ملائے ہیں۔اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انسانی وجود کی حقیقت کو سمجھنے اور کہانی میں اسے پیش کرنے کا جتنا سلیقہ پریم چند کو حاصل تھا، اس میں ان کا کوئی ہم عصر نہ ہو سکا۔

5۔کفن:۔

زیر نظر انتخاب کا آخری افسانہ کفن ہے، اور پریم چند کی زندگی کے اس دور کی یادگار ہے جب وہ اپنا سفر تقریباً ختم کر چکے تھے اور ان کا سانس اکھڑ رہا تھا۔اس افسانے سے ایسا لگتا ہے کہ تخلیق کی جو آگ پریم چند کے سینے میں تاعمر روشن رہی ،کفن اس کا نقطہ عروج ہے۔پریم چند چند یہاں اپنے آپ کو بھی عبور کر گئے ہیں اور ایک ایسی سطح کمال تک اس افسانے کو انھوں نے پہنچایا ہے جہاں وہ بھی اپنی گنتی کی دو چار کہانیوں میں ہی پہنچ سکے تھے۔

گھیسو اور مادھو کے کردار اپنی تمام تر کمزوریوں کے باوجود ہمارے اعصاب کو جھنجھوڑنے کی طاقت رکھتے ہیں۔دولت کی غیر منصفانہ اور طبقاتی تقسیم وتضادات اور جھوٹ کا کھوکھلا پن ،سب کچھ بالواسطہ طریقے سے وہ سب کہہ جاتے ہیں۔پریم چند کے اجتماعی شعور کے ساتھ ساتھ یہ کہانی ان کی انفرادی بصیرت اور افسانے کے فن پر ماہرانہ گرفت اور زبان وبیان پر ان کی قدرت کا آئینہ بھی ہے۔یہ کہانی

زمان ومکان کے جبر اور اس جبر سے آزادی، دونوں کی ترجمانی کہی جا سکتی ہے۔ یہ افسانہ مختصر ہوتے ہوئے بھی اپنی معنویت کے اعتبار سے بہت وسیع ہے۔ افسانے کے مزاج اور ہیت میں وقت کے ساتھ چاہے جتنے تغیرات رونما ہوتے جائیں۔ اس کہانی کی عظمت کبھی کم نہ ہوگی۔

پریم چند کے افسانوں کی اہم خصوصیات

سید وقار عظیم ان کے افسانوں کے متعلق بتاتے ہیں۔ ''پریم چند کے افسانوں کی ایک اہم خصوصیت ان کا مقامی رنگ ہے۔ انھوں نے اپنے زیادہ افسانوں میں ہندوستان کی مخصوص باتوں کا ذکر کیا ہے۔ کہیں راجپوتوں کی زندگی کہیں دیہات کی زندگی اور کہیں ہندو گھرانوں کی زندگی سے اپنے پلاٹ کے لیے واقعات کا انتخاب کیا ہے، لیکن ان میں سے جو ان کے افسانوں میں سب سے زیادہ نمایاں ہے وہ دیہاتی زندگی ہے۔ دیہاتی زندگی کے واقعات پریم چند نے اس قدر تفصیل سے بیان کیے ہیں کہ اگر کوئی شخص یہاں کی دیہاتی زندگی سے واقف نہ ہو تو اسے بہت اچھی طرح اس کا علم ہو جائے''۔

پریم چند کے اسلوب کے حوالے سے سید وقار عظیم کہتے ہیں۔

وہ ہر چیز کو نہایت آسان، مزیدار اور پرلطف زبان میں بیان کرتے ہیں کہ پڑھنے والا جہاں ایک طرف افسانے کا لطف لیتا جائے، وہاں دوسری طرف بیان کا لطف بھی اس کی دلچسپیوں میں اضافہ کرتا رہے۔ ہندی اور فارسی لفظوں اور ترکیبوں کا شیریں امتزاج، تشبیہوں اور استعاروں کی عمومیت کا عام استعمال اور نفسیاتی عالمگیری الفاظ کا برمحل استعمال، یہ چیزیں پڑھنے والے کو اپنی طرف کھینچتی ہیں''۔

''پوس کی رات'' کا ''سوا سیر گیہوں'' سے موازنہ

سوا سیر گیہوں:۔ اس افسانے میں پریم چند نے سود جیسی اہم معاشرتی برائی کو بیان کیا ہے کہ کس طرح سود ہمارے معاشرے کو تباہ کر رہا ہے۔ سود کی بات ہے، معاشرتی رسم ورواج کی وجہ سے سود پھیل چکا ہے۔ بعض اوقات پریم چند رسم ورواج پر طنز کرتے ہیں۔ پریم چند ان رسم ورواج سے نکلنا چاہتے ہیں لیکن معاشرتی دباؤ نکلنے نہیں دیتا۔ اور بتایا ہے کہ ایسا شیطانی چکر ہے جب ایک دفعہ چل پڑے تو اس کے ختم ہونے کی کوئی صورت نہیں آتی۔

پوس کی رات:۔ اس کا بیانیہ انداز بڑا خوبصورت ہے۔ کتے اور انسان کا علامتی دباؤ، سردی میں آدمی کا ٹھٹھرنا، سردی کیسے لگتی ہے، اس کو دکھایا۔ لیکن عام آدمی ان سب باتوں کو نہیں دیکھتا، لیکن افسانہ نگار اپنی فنکارانہ ہنرمندی کا ثبوت دیتے ہوئے اپنی ہر کیفیت کا اظہار بڑے اچھے طریقے سے کرتے ہیں۔ سردی، بھوک، ان سب کو قاری کیسے محسوس کر رہا ہے اسے بتانا بڑا مشکل ہوتا ہے، اسے پریم چند نے پیش کیا۔ یہ بہت بڑا فن ہوتا ہے کہ کسی کیفیت کا احساس کروانا قاری کو۔

افسانے کا کردار جن کیفیات میں مبتلا ہے وہی کیفیات قاری میں پیدا کرنا بہت بڑا فن ہے اور پریم چند نے اس افسانے میں اپنے فن کا اظہار بڑے خوبصورت انداز میں کیا ہے۔

☆☆☆☆

پیارے لوگ
(خاکے)
Afandi

پروفیسر منشا صاحب (وائس پرنسپل)
کی ریٹائرمنٹ پر تصویری جھلکیاں

پروفیسر طارق مسعود کھوکھر (شعبہ انگریزی)
کی ریٹائرمنٹ پر تصویری جھلکیاں

پروفیسر ظفر محمود ہاشمی (شعبہ انگلش) کی ریٹائرمنٹ پر تصویری جھلکیاں

پروفیسر عارف تنویر (شعبہ فزکس)
کی ریٹائرمنٹ پر تصویری جھلکیاں

پروفیسر امداد حسین (صدر شعبہ ریاضی)
کی ریٹائرمنٹ پر تصویری جھلکیاں

ناراض سماج کا خوش مزاج استاد

(پروفیسر ظفر اقبال ہاشمی)

شیخ عبدالرشید میڈیا ڈائریکٹر (UOG)

"As the saying goes" Good teacher are the reason why ordinary students dream to do extraordinary things" the noble gentleman in picture is an epitome and justification of the above quote.

کس قدر مشکل کسی کو الوداع کہنا وقار
وقتِ رخصت یوں لگے جیسے زباں کوئی نہ ہو

میرے ہر دلعزیز استاد، کولیگ اور دوست ،شعبہ انگریزی گورنمنٹ زمیندار کالج گجرات کے پروفیسر ظفر اقبال ہاشمی آج ریٹائر ہو گئے۔۔کمال کی باغ و بہار شخصیت ،خوش گفتار ، بزلہ سنج ،فکری و ادبی مکالموں کی جان، اور محفلوں کی رونق۔۔کلاس رومز کے رول ماڈل استاد ،تدریس کا وقار اور تعلیم کا معیار رکھنے والے ہاشمی صاحب ابھی کل کی بات ہے بیسویں صدی کی اسی کی دہاء کے ابتداء سالوں میں زمیندار کالج آئے۔۔ہم جب اس کالج پہنچے تو ان کی خوش بیانی کے اسیر ہو گئے۔۔ٹائم ٹیبل میں کلاس کسی کی بھی ہو ہم ہاشمی صاحب کی کلاس کے درمیانے بنچوں بیٹھ کر ایک سچے استاد کے ابلاغ کی چسکے سے داد دیتے رہتے۔۔پھر اسی کالج میں ان کا رفیق ہونے کا موقع ملا تو ہاشمی صاحب ان اساتذہ میں سے تھے جو کلاس روم کی مزدوری کے غلام بن کر نہیں رہ گئے تھے۔۔کالج کینٹین کی رونق میں ان کا بھرپور کردار ہوتا تھا۔ہلکی پھلکی گپ شپ کو لطائف کی توپوں سے اسلحہ کے طور پر استعمال کرتے اور سامعین کو جواب دینے کی طاقت سے محروم کر کے انہیں قہقہوں میں ہی دھنسائے رکھتے۔۔۔چند دن قبل ان سے ایک تقریب میں ملاقات ہوء تو ریٹائرمنٹ کے حوالے گفتگو میں استاد کے حالیہ کردار پر فکر مند دکھاء دیے۔۔فکر مند کیوں نہ ہوتے۔۔انہوں نے زمیندار کالج کے نشیب و فراز محض دیکھے ہی نہیں ہیں۔ یہ اتار چڑھاو ان پر بیتے بھی ہیں۔۔اب وہ ریٹائر ہو گئے ہیں تو انہیں مبارک ہو کہ اس عہد میں عزت کے ساتھ نوکری مکمل کرنا غنیمت ہے۔۔مجھے امید ہے کہ وہ اپنی پہلی فرصت میں زمیندار کالج سے وابستہ اپنی جیونی لکھنا شروع کریں گے وہ اس کالج کے ہی نہیں اس نظام تعلیم کے ارتقاء※ اور اتار چڑھاو کے بصیرت افروز مشاہدے کے حامل استاد ہیں۔۔ان کی یادداشتوں سے اس کالج کی تاریخ کا اہم باب رقم ہوگا۔۔۔امید ہے دیگر دوست بھی ان سے ایسی ہی توقع رکھتے ہیں۔۔اللہ کریم آپ کو سدا ہسد اوسدا رکھے۔

جناب پروفیسر طارق مسعود کھوکھر

صدیقہ تسنیم

ایم اے، انگلش، پارٹ ون

پروفیسر طارق مسعود کھوکھر، نام ایسا کہ سنتے ہی عزت واحترام سے محبت، شفقت، نرمی اور اپنائیت کے جذبات دل کے دروازے پر دستک سے دینے لگتے ہیں۔ فکروخیال کی پاکیزگی، انداز کی سادگی، چہرے کی ہلکی ہلکی مسکراہٹ میں مقید متانت وسنجیدگی، بیان کی شفافیت اور لہجے کی سہل پسندی کچھ ایسے اوصاف ہیں کہ (پورے شعبہ انگریزی میں کوئی آپ کا ثانی نہیں)۔ پروفیسر صاحب بلاشبہ شعبہ انگریزی کا ایک ایسا درخشاں ستارہ ہیں جسے کبھی زوال نہیں اور کیوں ہو استاد جیسے عظیم مرتبے پر فائز آپ ان تمام خوبیوں کے حامل ہیں جو واقعی قابل تقلید ہیں۔ گورنمنٹ زمیندار کالج گجرات میں بطور لیکچرر اپنے فرائض کا آغاز کیا۔ اپنی محنت، ایمانداری اور فروغ تعلیم جیسے مقاصد سے معمور آپ نے بہت جلد ساتھی اساتذہ اور طالب علموں کے دل میں گھر کرلیا۔ آپ کی کلاس میں بیٹھا ہوا طالب علم کبھی بھی اپنے آپ کو جناب کی اپنائیت اور شفقت بھرے لہجے سے انحراف کرتا دکھائی نہیں دیتا۔ ملائم لہجے کی شفقت بھری پدرانہ باتیں نہ صرف طلباء بلکہ طالبات کے دلوں میں خصوصی طور پر محبت واحترام کے اٹوٹ اور انمٹ نقش بُنتی ہیں۔

الفاظ کے چناؤ میں اگر ایک طرف شائستگی اور خوبصورتی کو ملحوظ خاطر رکھا جاتا ہے تو دوسری طرف ان کی ادائیگی میں بھی اتنا ہی ٹھہراؤ اور پیار شامل کرلیا جاتا ہے کہ سننے والا واقعی دیدہ ودل فرش راہ کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ بحیثیت استاد ہمیشہ ہی آپ نے اپنے طالب علموں کو عزت، پیار اور شفقت سے نوازا ہے۔ آپ کی ہمیشہ ہی یہ کوشش رہی کہ طالب علموں کو کم وقت میں زیادہ سے زیادہ علم فراہم کیا جائے۔ آپ کی ہمیشہ کوشش رہی کہ اپنی پیشانی کی ایک ایک شکن میں بُنے ہوئے بے شمار تجربات اور مشاہدات کو بغیر کسی کمی بیشی کے طالب علموں کے گوش گزار کیا جائے تا کہ وہ ہمہ وقت بدلتی ہوئی اس دنیا میں ان کے ذاتی تجربے سے بھی فیضاب ہوسکیں۔ طالب علموں کی اخلاقی تربیت اور ذہنی نشوونما پر بھرپور توجہ دیتے ہوئے آپ نے ہمیشہ اچھا انسان اور اچھا مسلمان بننے پر زور دیا جو بجائے بوجھ کے معاشرے کے لیے ایک مفید اور کارآمد شہری ثابت ہوسکے۔ خصوصی توجہ، محبت اور شفقت آپ کی کلاس میں موجود طالبات کے لیے رہی جنھیں آپ نے قرینے، سلیقے، عزت اور وقار جیسے الفاظ اور ان کے مفاہیم سے آشنا کرایا۔ آپ نے ہمیشہ طالب علموں کی حوصلہ افزائی کی، تحمل اور بردباری آپ کے لہجے کا خاصہ رہی ہے۔ مذہب سے دلی لگاؤ اور خصوصی وابستگی آپ کی شخصیت میں نکھار اور آنکھوں میں چمک پیدا کرنے کا باعث بنتی ہے۔ مزید براں بزرگی اور بالوں کی سفیدی آپ کی شخصیت کی خوبصورتی، رعب اور وقار کو مزید بڑھاتی ہے۔ زمیندار کالج سے آپ الوداع ہورہے ہیں لیکن آپ کی باتیں، نصیحتیں، ہلکی ہلکی ڈانٹ ڈپٹ، چہرے کی مسکراہٹ، دعائیں اور ہم سے وابستہ تمام تر توقعات سے آپ ہمیشہ ہمارے دلوں میں زندہ وجاوید رہیں گے۔ ہم کالج کے لیے آپ کی خدمات پر آپ کے ممنون ہیں اور تمام تر شفقت ومحبت کے مقروض بھی اور دعا گو ہیں کہ اللہ پاک آپ کو بے شمار خوش نصیب ساعتیں عطا فرمائے، درازی عمر بالخیر عطا فرمائے اور ہمیں ان کی توقعات پر پورا اترنے کی توفیق عطا فرمائے (آمین)

☆☆☆☆

اک پیڑ متصل ہے
(پروفیسر امداد حسین)

تحریر : محمد سعید (لیکچرر شعبہ فزکس)

ابو نے سرسید کالج، سائنس کالج اور گورنمنٹ زمیندار کالج گجرات میں، ریاضی کے استاد کی حیثیت سے، اپنی سروس کا بیشتر حصہ گزرا۔ ریاضی کا پروفیسر ہونے کے باوجود، میں نے ہمیشہ انھیں زندگی کی مادی ضروریات کے حوالہ سے کبھی حساب کتاب کرتے نہیں دیکھا۔ جو مل گیا، کھا اور پہن لیا۔ تمام زندگی ٹیوشن اکیڈمیز سے دور رہے البتہ کچھ طلبہ گھر آجایا کرتے جنھیں وہ بغیر فیس لیے پڑھاتے۔ میں اکثر سوچتا کہ وہ ٹیوشن کیوں نہیں پڑھاتے؟ اپنی سوچ کے اس مقام پر مجھے ہمیشہ یہی محسوس ہوا :

سربسر یار کی مرضی پہ فدا ہو جانا
کیا غضب کام ہے راضی بہ رضا ہو جانا

سادگی کیا ہوتی ہے؟ اس کی مجسم تصویر میں بچپن ہی سے ابو کے روپ میں دیکھ رہا ہوں۔ مجھے یاد ہے کہ ایک مرتبہ کالج سے کوئی صاحب ابو کو ملنے ہمارے گاؤں والے گھر میں تشریف لائے، اس وقت وہ انتہائی سادہ لباس میں کھیتوں میں کام کر رہے تھے۔ کام کرتے ہوئے قدموں کی آواز سن کر ابو نے پوچھا، کون ہے؟ اُن صاحب نے جواب دیا، بُلھیا! کی جاناں میں کون۔۔۔ ابو نے ضلع گجرات کے ایک چھوٹے سے علاقے رسولپور مفتیاں میں، زندگی کے شب و روز بسر کیے۔ یہ ان کا آبائی گاؤں ہے۔ دو بہنوں کا اکلوتا بھائی ہونے کی وجہ سے وہ گھر والوں کے ہمیشہ لاڈلے رہے۔ لیکن اس کے باوجود انھیں ہمیشہ اپنے والدین اور بہنوں کا بہت خیال رہا۔ زندگی کا زیادہ حصہ انھوں نے اپنے گاؤں میں گزارا ہے۔ اس لیے کھیتی باڑی کا شوق انھیں بچپن سے ہے۔ جب ہم سب بہن بھائی بڑے ہوئے تو انھوں نے اپنے سارے شوق ہمارے لیے قربان کر دیے۔ ہماری تعلیم کے لیے، گاؤں، کھیتی باڑی، سب کچھ چھوڑ کر گجرات شہر میں آباد ہو گئے۔ وہ تو ہمارے لیے یہاں آ کر آباد ہو گئے لیکن مجھے لگتا ہے کہ فطرت سے دور:

کس خرابے میں آبسے ہیں ہم
نہ کوئی پیڑ ناں پرندہ ہے

پڑھنے لکھنے کا شوق انھیں وراثت میں ملا۔ میں نے جب سے ہوش سنبھالا، فارسی، طب اور اسلامی کتب کو ہمیشہ اپنے گھر میں دیکھا۔ ان میں سے کچھ کتب دادا کے زمانے کی ہیں اور کچھ ابو نے خود خریدیں۔ حال ہی میں خصوصی طور پر انھوں نے مثنوی معنوی لاہور سے منگوائی۔ یقینی بات ہے کہ کتب بینی کا شوق کبھی رایگاں نہیں جاتا۔ کتاب سے تعلق وہی لوگ برقرار رکھتے ہیں جو ماضی سے جُڑ کر مستقبل پر نگاہ رکھنا چاہتے ہوں۔ مجھے فزکس کا طالب علم ہونے کی حیثیت سے ایسا لگتا ہے کہ خصوصاً ادبی کتب کا مطالعہ سائنسی شعور کی وسعت کے لیے ضروری ہے۔

ابو نے ابتدائی تعلیم کنجاہ کی ایک تاریخی درسگاہ، اسلامیہ ہائی سکول سے حاصل کی۔ گریجوایشن گجرات سے اور ایم ایس سی ریاضی کی ڈگری انھوں نے گورنمنٹ کالج لاہور سے حاصل کی۔ بی ایڈ کے دوران وہ ایجوکیشن ٹریننگ کالج لوئر مال لاہور میں پڑھتے رہے۔ انھوں نے

بطور لیکچرر (ریاضی) راولپنڈی سے سروس کا آغاز کیا۔ اس کے بعد کچھ عرصہ پھالیہ کالج میں پڑھاتے رہے اور وہاں سے تبادلہ کے بعد سر سید کالج اور سائنس کالج یو اوجی میں اپنے تدریسی فرائض سرانجام دیتے رہے۔ بعد ازاں جب 2015 میں ایسوسی ایٹ پروفیسر بنے تو ان کی تعیناتی گورنمنٹ زمیندار کالج گجرات میں ہوئی۔ اور اسی کالج سے بطور صدر شعبہ ریاضی اکتوبر 2019 میں ریٹائر ہوئے۔ یہ میرے لیے اعزاز کی بات ہے کہ ان کی سروس کے آخری دو ماہ کے دوران میں، مجھے بھی زمیندار کالج بطور لیکچرر (فزکس) پڑھانے کا موقع ملا۔

ریٹائرمنٹ کے بعد اب ان کا دل کرتا ہے کہ اپنے گاؤں کی قدرتی فضاؤں میں واپس لوٹ جائیں۔ لیکن وہی بات جو اقبال نے کہی :

"کارِ جہاں دراز ہے اب میرا انتظار کر"

میں پہلی جماعت سے لے کر ایم فل فزکس کی ریسرچ تک ان سے رہنمائی حاصل کرتا رہا ہوں۔ مجھے یاد ہے ایم ایس سی فزکس اور ایم فل کی پڑھائی کے دوران میں، میں جب بھی ان سے کچھ پوچھتا تو وہ کہتے کہ اب تمھارے مضمون کی پڑھائی کے معاملات میرے مضمون یعنی ریاضی سے قدرے مختلف ہو چکے ہیں۔ لیکن میں جانتا ہوں کہ میں نے ایم فل کی ریسرچ کے دوران بھی باتوں باتوں میں اپنے مضمون سے متعلق بہت سے عقدے ان کی معاونت سے سلجھائے۔

دینیات اور صوفی ازم یہ دو ایسے پہلو ہیں جن کا ذکر کیے بغیر ابو کی شخصیت کو سمجھنا یا سمجھانا مشکل ہے۔ وہ اکثر جنوبی پنجاب اور خصوصاً ملتان ان صوفیا کے مزاروں پر حاضری دیتے ہیں جن کے متعلق انھوں نے سن یا پڑھ رکھا تھا کہ وہ راہِ سلوک کے سچے مسافر ہیں۔ ہماری ہوش سے پہلے سنا ہے کہ انھیں گیت سننے کا شوق تھا لیکن بعد ازاں ان کی یہ دلچسپی بڑے شاعروں کے کلام پڑھنے سے منسلک ہو گئی۔ غالب، اقبال اور مولانا روم سے ان کی وابستگی کا یہ عالم ہے کہ وہ اکثر ریٹائرمنٹ کے بعد ان شعراء کے حوالے سے میرے ساتھ گفتگو کرتے رہتے ہیں۔ مولانا روم کے وہ اسقدر مدّاح ہیں کہ جہاں کہیں بھی الیکٹرانک میڈیا پر مولانا سے متعلق کوئی لیکچر سننے کو ملے، وہ اسے ضرور سنتے ہیں۔ صوم وصلاۃ کی پابندی ان کی زندگی کا جزوِ لاینفک ہے۔ ان کے تمام تر دنیاوی معاملات کی بنیاد مذہب پر ہے۔ یہاں یہ واضح کرنا ضروری ہے کہ وہ مذہبی ضرور ہیں لیکن زاہدِ خشک نہیں۔ مذہب ان کے نزدیک زندگی گزارنے کا ایک ایسا لائحہ عمل ہے جس کا آغاز اور انتہا خدا، رسولؐ اور اس کی مخلوق سے محبت ہے۔

میری خوش قسمتی ہے کہ میں بچپن سے لے کر اب تک اس شجرِ سایہ دار کے زیرِ سایہ ہوں، سائے میں ہونے کے باوجود میری نشوونما بتدریج جاری ہے۔ کیونکہ میں ہر قدم پر ان کی انگلی پکڑ کر اپنی دنیا آپ پیدا کرنے کی تگ ودو میں مصروفِ عمل ہوں۔ میں نے ان سے یہی سیکھا ہے کہ بزرگوں کی پیروی کرتے ہوئے، اپنی ہمت سے منزل تلاش کرنا ہی زندگی کا اصل مقصد ہے۔ میں خوش بخت ہوں کہ

اک پیڑ متصل ہے مری خواب گاہ سے
نیندوں میں رنگ بھرنے کا ذمہ ہوا کا ہے

☆☆☆☆

غلام ربانی المعروف شاہ رخ خاں

سید وقار افضل

آخر کار ملک غلام ربانی (لیکچرار اردو گورنمنٹ زمیندار کالج، گجرات) نے اپنے آبائی شہر جوہر آباد (خوشاب) میں تبادلہ کروالیا۔ ربانی سے میری دوستی نہیں محبت ہے۔۔اصل میں وہ میرا محبوب ہے بالکل اردو شاعری والا۔ ناراض بھی اور پیار بھی۔ زود رنج بھی اور ہر وقت میرے ساتھ بھی۔ ہم راز بھی اور وفا شعار بھی۔ اردو شاعری کی پوری تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ محبوب نے ہمیشہ اپنے عاشق کو ہجر سے دو چار کیا ہے۔۔۔ اور ربانی تم نے بھی۔ یار! نئے لوگ تو روایت شکن ہوتے ہیں لیکن ربانی بالآخر تم بھی اردو شاعری کے روایتی محبوب ہی ثابت ہوئے۔۔۔ ربانی زمیندار کالج میں میری قوت رہا ہے اور سچی بات یہ کہ میں نے پیپر مارکینگ اور اوپن یونیورسٹی کی کلاسز کو پڑھانے جیسے بہت سے کام ربانی کے کہنے پر شروع کیے۔۔۔۔ ربانی زمیندار کالج کے شعبہ اردو کا ایک انتہائی ریگولر اور محنتی استاد تھا۔۔۔۔۔۔ طلبہ میں وہ اپنے خوشگوار مزاج کی وجہ سے بے حد مقبول تھا۔ زمیندار کالج کے تمام طلبہ اُسے سر شاہ رخ خان کہتے۔۔ اپنے طلبہ اور کولیگز کو ناراض اور راضی کرنے میں بھی اُسے ید طولیٰ حاصل تھا۔۔ لیکن اُس کی بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ کسی کو زیادہ دیر ناراض نہیں رکھ سکتا تھا۔ ربانی ایک کسان کا بیٹا ہے۔ اس لیے ربانی کی ایک بات مجھے ہمیشہ بہت پسند رہی جو یقیناً اس نے اپنے جفا کش باپ سے سیکھی ہوگی وہ یہ کہ وہ انتہا کا محنتی انسان ہے۔۔ اس نے گجرات میں رہ کر دن رات محنت کی۔۔ پیپر چیک کیے، مختلف اکیڈمیز میں پڑھایا، اوپن یونیورسٹی کی کلاسز پڑھائیں، کالج میں مارننگ اور ایوننگ کی کلاسز کو پڑھاتا رہا۔ سارا دن اتنی محنت کے باوجود میں نے اسے ہمیشہ تازہ دم اور خوش گوار موڈ میں اپنی اور احباب کی تصویریں بناتے ہوئے دیکھا۔

آپ یقین کیجیے جس پسماندہ علاقے سے اٹھ کر ربانی نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی، اگر اس کی جگہ کم از کم میں ہوتا تو ہمیشہ ان پڑھ رہتا۔ میں نے اسے کئی بار کہا یار تم بہت محنت کرتے ہو کہنے لگا شاہ جی میرے پاس اس محنت کے علاوہ کچھ اور نہیں۔ میں نے ابھی بہت کچھ کرنا ہے۔ میں اپنے گھر کا پہلا پڑھا لکھا فرد ہوں اور میں چاہتا ہوں کہ اپنے بچوں کے ساتھ ساتھ اپنے بھائی کے بچوں کو بھی پڑھاؤں۔ کیونکہ کھیتوں میں کام کرنے کی وجہ سے بھائی خود پڑھ نہیں سکا۔ اور اب یہ میری ذمہ داری ہے کہ میں اپنے بچوں کے ساتھ اس کے بچوں کو بھی تعلیم کے زیور سے آراستہ کروں۔ شاہ جی یہ میرا خواب ہے۔۔۔ اور میں جواب واپس اپنے علاقے کی طرف جا رہا ہوں، یقین کیجیے مجھے اماں کی محبت اور بھائی کے بچوں کو پڑھانے کی ذمہ داری ادھر کھینچ رہی ہے۔ وہ بڑے معصومانہ انداز میں کہنے لگا کہ میں اکثر سوچتا ہوں کہ بڑے ہو کر کہیں میرے بھائی کے بچے یہ نہ سوچیں کہ ہمارا چچا خود تو پڑھ گیا لیکن اس کے بھائی کے بچے۔۔۔ جس بھائی نے اس کی عدم موجودگی میں اس کے کھیتوں کو پانی دیا آباد رکھا۔۔۔ شاد و آباد رہو ربانی۔۔۔ تمھارے ارادے کتنے نیک اور پُر خلوص ہیں۔۔ کاش ہم بھی اس سوچ کے اہل ہو سکیں۔۔۔

سرائے دلبراں میں اس طرح ہوتا ہی رہتا ہے — مسافر آتے رہتے ہیں مسافر جاتے رہتے ہیں
مگر جانے سے پہلے تم ہمیشہ یاد یہ رکھنا — ہمارے درمیاں جو آگہی کا ایک رشتہ ہے
اسے مٹنے نہیں دینا اُسے آباد رکھنا ہے — مسافر آتے رہتے ہیں مسافر جاتے رہتے ہیں

☆☆☆☆

بابا گھر آ گیا ہے

سید وقار افضل

شیخوپورہ کی ادبی پہچان پرفیسر سید خورشید بخاری (مرحوم) کے بڑے صاحب زادے پروفیسر سید ظفر بخاری جو جنڈیالہ شیر خاں ڈگری کالج میں فارسی کے استاد تھے 18 دسمبر 2019 کو کالج سے رکشے پر اپنی بیٹی کو گھر لاتے ہوئے خاموشی کے ساتھ اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ان کا چھوٹا بھائی سید فخر بخاری میرا ایسا دوست ہے جس پر مجھے ہمیشہ فخر رہا ہے۔وہ اس لیے کہ جو یہ کہا جاتا ہے کہ دوست وہ جو مشکل میں کام آئے،فخر صرف میرے کام نہیں آیا بلکہ ہر قدم پر میرے ساتھ چلا۔اگرچہ ہم کبھی کلاس فیلو نہیں رہے لیکن ایم۔اے کے زمانے سے لے اسلام آباد میں ملازمت کے ابتدائی ایام تک ہم ساتھ رہے۔

شیخوپورہ میرا ننھالی شہر تھا۔میری ابتدائی تعلیم شیخوپورہ میں ہوئی۔یہ سچ ہے کہ اگر میرے گھر والے،بچپن میں مجھے پڑھنے کے لیے نانا کے پاس شیخوپورہ نہ بھیجتے،تو میرے تیور ایسے تھے کہ میں کبھی نہ پڑھ سکتا۔والد کے انتقال کے وقت میں اصغر مال کالج میں ایم۔اے اردو سالِ اول کا طالب علم تھا۔یہ وہ زمانہ ہے جب ہم سب گھر والے اٹک سے ماموں جان پروفیسر انور حسین سید کے پاس شیخوپورہ شیفٹ ہو گئے۔
ایم۔اے کے فائنل امتحانات سر پر تھے اور میں کالج سے دور تھا ان دنوں میرے ایک بچپن کے دوست نوید افضل نے میری ملاقات فخر بخاری سے کرائی وہ ان دنوں ایف۔سی کالج میں ایم۔اے اردو سال دوم کا طالب علم تھا۔فخر سے اس پہلی ملاقات کے بعد ہماری روزانہ ملاقات ہونے لگی۔اس کے والد گرامی سید خورشید بخاری صاحب کی لائبریری میں اردو ادب سے متعلق سینکڑوں نایاب کتب تھیں جن کا میں نے صرف نام سنا ہوا تھا۔فخر کی وساطت سے ان کتب کا دیدار بھی ہوا اور ان میں سے چند کتابوں سے میں نے،اپنی امتحانی ضرورت کے مطابق استفادہ بھی کیا۔شیخوپورہ میں تقریباً سبھی جانتے ہیں کہ سادات کا یہ گھرانہ بہت پڑھا لکھا،مہمان نواز اور مہذب ہے۔

جب بھی میں فخر سے ملنے جاتا عموماً ظفر بھائی مسکراتے ہوئے دروازہ کھولتے بیٹھک میں بٹھاتے حال احوال پوچھتے اور جب فخر آتا تو کچھ دیر بعد ظفر بھائی ہمارے کھانے کو کچھ لے آتے۔میں فخر سے بے تکلف تھا میں اسے کہتا کہ خود جا کر لے آیا کرو بھائی کو کیوں تکلیف دیتے ہو۔وہ کہتا،میں نے تو انھیں نہیں کہا کہ ہمیں کھانے کو کچھ چاہیے وہ خود لے آتے ہیں،اب تم چپ کر کے کھاؤ،انھیں ان کے ایسے کاموں سے نہیں روکا جا سکتا۔میں نے کئی دفعہ دیکھا کہ وہ کھانے کے بعد برتن بھی خود اٹھا کر لے جایا کرتے تھے۔شاید ہماری عمروں میں سال یا مہینوں کا فرق ہو لیکن ان کا برتاو ایسا تھا کہ ہم ان کے سامنے سگرٹ تک پینے سے گریز کرتے۔فالتو باتیں تو در کنار ہیں۔بس اتنا کہ شاہ صاحب کیا حال ہے؟ فخر کدھر ہے؟ وہ مسکراتے اور بیٹھک کا دروازہ کھولتے چلے جاتے،بس۔

سادات کی اس ساری فیملی کے اس امیج کی تشکیل میں خورشید بخاری صاحب کی تربیت کا رنگ جھلکتا تھا۔وہ خود بھی وضع دار تھے اور بچے بھی اس رنگ میں رنگے ہوئے۔فخر،ظفر بھائی کا ایسے احترام کرتا تھا جیسے وہ اس سے دس پندرہ سال بڑے ہوں اور ظفر بھائی فخر کے بارے میں اتنا فکر مند رہتے جتنا باپ۔روشن رویے،شخصیت اور خاندانوں کی پہچان ہوتے ہیں۔یہ ہمیشہ تاریکی کو اجالوں میں بدلنے کی سعی کرتے رہتے ہیں۔لیکن بیٹی کو کون سمجھائے،جو بار بار یہ کہہ رہی ہے "بابا رکشے سے باہر نکلو گھر آ گیا ہے"-----انا للہ وانا الیہ راجعون

وہ چراغ آخرِ شب بجھتے بجھتے کہہ گیا　　　　اس سے زیادہ اور کیا کرتا اجالا کر دیا

افسانہ نامہ

سالانہ
مشاعرہ

سالانہ
مشاعرہ

سالانہ
مشاعرہ

سالانہ
مشاعرہ
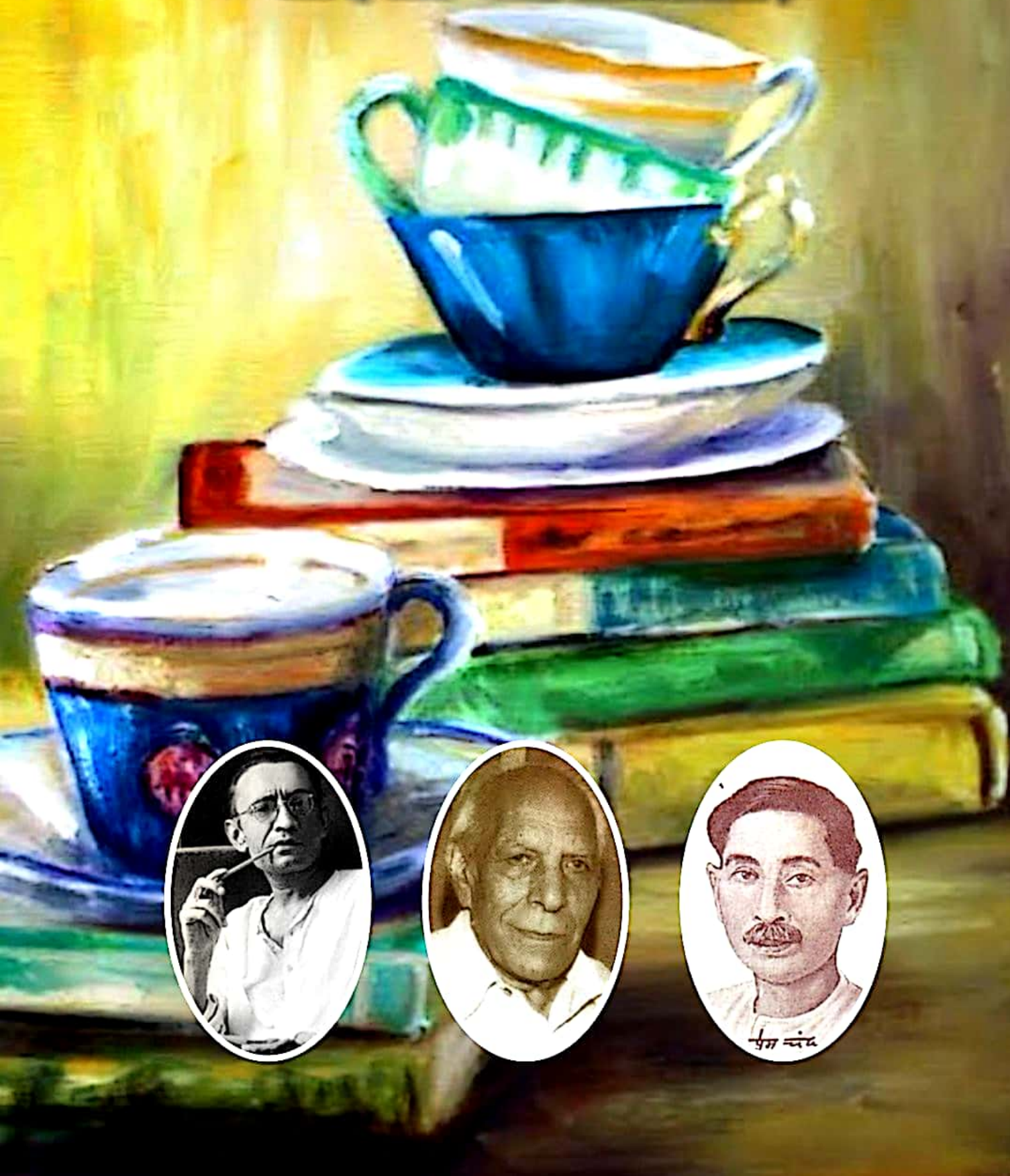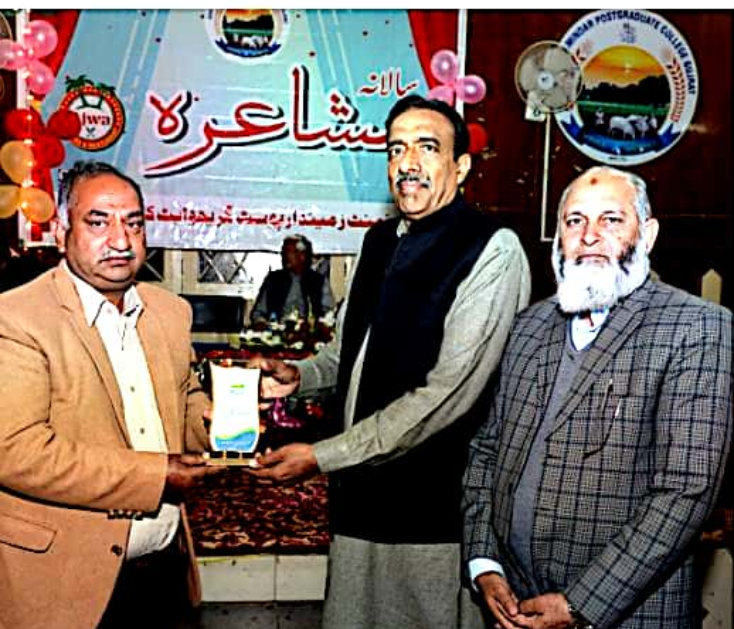
کنجری کا کوٹھا

ایم۔خالد فیاض

وہ دو دن کی مسلسل بھاگ دوڑ سے ہلکان تھا اور جانتا تھا کہ یہ سب بے سود ہے۔ پیسوں کا اب کہیں سے بندوبست نہیں ہو پائے گا۔ ابھی دو ماہ پہلے ہی تو بڑی مشکل سے پچھلے سمسٹر کی فیس جمع کروائی تھی اور اب دو ماہ بعد اگلے سمسٹر کی فیس۔۔۔ پچھلے سمسٹر کی فیس چار ماہ لیٹ لی گئی تھی جس کی وجہ سے اِس سمسٹر کی فیس دو ماہ بعد ادا کرنے کا حکم نامہ جاری ہوا تھا۔ یہ حکم نامہ اگرچہ جائز تھا مگر بہت سوں کے لیے انتہائی اذیت ناک ثابت ہوا تھا اور اُس کے لیے تو خاص طور پر۔ جب پچھلے سمسٹر کی فیس لیٹ ہوئی تھی تو کسی نے پتہ کرنے کی کوشش نہ کی کہ ایسا کیوں ہو رہا ہے اور یہ معاملہ کہیں آنے والے دنوں میں ہمارے لیے کوئی بڑی مصیبت پیدا نہ کر دے، بلکہ دل ہی دل میں سب دعائیں کرتے رہے کہ یہ بلا جب تک ہو سکے ٹلی ہی رہے تو بہتر ہے۔ لیکن اُس وقت کی ٹلی ہوئی بلا اب گلے کا چھچھوندر بن گئی تھی۔ ''کل آخری تاریخ ہے اور میرا نام خارج ہو جائے گا۔'' اُس نے سوچا۔ پھر خیال آیا کہ ''میرا تعلیمی ریکارڈ تو بہت اچھا ہے شاید یونیورسٹی کی انتظامیہ مجھے کچھ رعایت دے دے۔ شاید میرے اساتذہ میری سفارش کریں۔'' پھر اُسے یہ سوچ کر بھی کچھ تسلّی ہوئی کہ اُن طلبا کا نام تو آج تک خارج نہیں ہوا جن کا G.P.A پچھلے سمسٹرز میں کافی کم رہا تھا، جب کہ اس معاملے میں اگر وہ پوری کلاس میں سب سے آگے نہیں تو سب سے پیچھے بھی نہیں تھا۔ اُس کا G.P.A کافی اچھا اور اسائنمنٹس کا ریکارڈ اُس سے بھی اچھا تھا۔ ''نہیں نہیں میرا نام صرف فیس کے مقررہ وقت تک ادا نہ ہونے کی وجہ سے خارج نہیں ہو سکتا۔'' اُس کے دل نے اُسے تسلّی دی۔ لیکن جیسے ہی آخری تاریخ کا دفتری اختتام ہوا تو اُس کے موبائل پر یونیورسٹی انتظامیہ کی طرف سے بھیجا گیا میسج چمکا۔ لکھنے والے نے بڑی بے دردی اور بے رحمانہ انداز سے لکھا تھا کہ ''واجبات کی عدم ادائیگی کی وجہ سے آپ کا نام یونیورسٹی سے خارج کر دیا گیا ہے۔ مزید معلومات کے لیے دفتر سے رابطہ کریں۔'' وہ یک دم جیسے سکتے میں آ گیا اور کچھ لمحوں کے لیے اُس کی حسّیات کا سارا نظام معطل ہو گیا۔ شاید اُس کا وجود اُس سے الگ ہو گیا تھا، یا شاید اُس کا کوئی وجود رہا ہی نہیں تھا۔ وہ عجیب کیفیت سے دوچار تھا۔ اِس سے پہلے بھی وہ کچھ آسانی سے کالج یا یونیورسٹی کے واجبات ادا نہیں کر پاتا تھا مگر کسی نہ کسی طرح یہ مصیبت کچھ دن کی سخت پریشانی پیدا کر کے آخر کار ٹل جایا کرتی تھی لیکن اِس بار وہ اِس بلا کو ٹالنے میں ہر طرح ناکام رہا تھا۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ اب وہ باقاعدہ ملازمت پیشہ فرد تھا۔ پہلے تو وہ صرف طالبِ علم ہی ہوا کرتا تھا اِس لیے اُس کے لیے فیس کا بندوبست کرنا مشکل ہوتا، مگر اب۔۔۔ اب تو وہ ایک باعزت عہدہ پر ایک اہم سرکاری ملازم تھا۔ اور اب وہ ہوا جو پہلے کبھی نہ ہوا تھا۔ زندگی میں پہلی بار اُس کا نام یونیورسٹی سے خارج ہو گیا۔۔۔ اِس سے وہ ایک بات ضرور سمجھ گیا کہ بنا ملازمت کی غیر ذمہ دارانہ زندگی، بہر حال ذمہ دار ملازمت پیشہ زندگی سے کسی نہ کسی طور بہتر ہوتی ہے۔

اُسے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ اب کیا کرے۔ تین چار دن تو وہ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ہی سے عاری رہا۔ پھر اُسے خیال آیا کہ جتنے دن گزریں گے معاملہ اور پیچیدہ ہو جائے گا۔ مگر ایک بار پھر اُس پر مایوسی کا دورہ پڑا تو وہ کان لپیٹ کر مزید ایک دو دن کے لیے غافل سا ہو گیا۔ مگر جتنا وہ اوپر سے غافل رہنے اور بننے کی کوشش کر رہا تھا، اندر پریشانی اتنی بڑھ رہی تھی۔ اُس کو کلاس فیلوز کے فون بھی آنا شروع ہو گئے۔ دو چار دوستوں سے تو بات کی مگر پھر اُس نے ان کی کال ریسیو کرنا بند کر دی۔ سب یہی پوچھتے کہ ''کیا ہوا تم نے فیس جمع کیوں نہیں کرائی؟ اب کیا بنے گا؟ ہمارے پاس پیسے ہوتے تو ہم تمہاری فیس جمع کرا دیتے مگر اس وقت تو ہم بھی مجبور ہیں لیکن پھر بھی تم ہمیں کچھ بتاتے تو سہی۔''

وغیرہ وغیرہ۔ ایسی ہم دردیاں جو ہمارا تماشا بن جائیں، ہم وصول نہیں پاتے ۔ شاید اسی لیے ایک دن وہ اپنے ایک کلاس فیلو پر برس پڑا کہ ''کیوں؟تم کیوں میری فیس جمع کرواؤ گے؟تم میرے باپ لگتے ہو کیا؟'' یہ اور ایسا ہی کچھ اور بھی وہ بکتا رہا جس کی اسے قطعاً خبر نہیں تھی۔ حتیٰ کہ دوسری جانب سے فون بند کر دینے پر بھی وہ کافی دیر تک کچھ بکتا جھکتا رہا۔ کچھ دن گزرے تو اُسے اُس کے استاد کا فون آیا جنھیں وہ بہت عزیز جانتا تھا۔ انھوں نے اُسے یونیورسٹی آنے کو کہا۔ انتہائی بے دلی کے ساتھ وہ یونیورسٹی اُن کے دفتر پہنچا۔ انھوں نے اُس کے لیے چائے اور بسکٹس کا اہتمام کر رکھا تھا۔ چائے کے ساتھ ساتھ انھوں نے اُس کی ساری بپتا سنی اور صرف ایک سوال پوچھا ''تم کب تک فیس کا بندوبست کر سکو گے؟'' اپنے اندر کے کرب کو سمیٹنے تک وہ خاموش رہا پھر اُس نے کسی قدر الجھے ہوئے لہجے میں جواب دیا کہ'' آسانی سے تو شاید کبھی نہیں مگر امید ہے اگلے ماہ تنخواہ آنے پر کچھ کر سکوں۔'' استاد صاحب نے فکرمندانہ لہجے میں کہا ''اُس وقت تک تمہاری کلاسز کا بہت نقصان ہو چکا ہوگا۔'' اِس کے جواب میں اُس کے پاس اُن کی طرف دیکھنے کے لیے صرف دو تلخ اور بے بس آنکھیں تھیں جو کہ رہی تھیں کہ کیا ہم جیسوں کو اس ملک میں کسی طرح کا کوئی فائدہ بھی پہنچ سکتا ہے؟ ہم تو پیدا ہی نقصان اٹھانے کے لیے ہوتے ہیں۔

بہرحال وہاں سے اٹھ کر اُس نے معلومات کے لیے یونیورسٹی دفتر کا رخ کیا۔ اُسے بتایا گیا کہ اب اصل فیس کے ساتھ دو ہزار روپے دوبارہ داخلہ فیس کی مدّ میں بھی جمع کروانے ہوں گے اور پچاس روپے یومیہ، لیٹ فیس جرمانہ ہے، آخری تاریخ سے جتنے دن اوپر ہوں گے اُن سے ضرب دے لیجیے گا۔ اور دوبارہ داخلہ کی درخواست صدرِ شعبہ سے مارک بھی کروانی ہوگی۔ ''جرمانے کے ساتھ فیس کی کوئی آخری تاریخ؟'' اُس نے یہ سوال اِس امید پر کر دیا کہ شاید اب یہ ٹنٹا اِس طرح ہی کسی انجام کو پہنچے۔ ''جی نہیں، اِس کی کوئی خاص حد تو نہیں۔ جب چاہیں جمع کروا دیں یونیورسٹی کو کیا تکلیف ہے، جرمانہ تو آپ نے ادا کرنا ہے، بس اتنا ہے کہ تمام واجبات ادا کیے بغیر آپ کلاس نہیں لے سکتے۔'' متعلقہ کلرک نے غیر متوقع طور پر اُسے ساری بات بڑی تفصیل سے اور کسی حد تک ہم دردانہ انداز سے بتائی۔ اُس نے کلرک صاحب کے تعاون اور انتہائی شائستہ اندازِ گفتگو کا شکریہ ادا کیا۔ ''کوئی بات نہیں جی یہ تو ہمارا فرض ہے آپ بس جتنا جلد ممکن ہو فیس جمع کرانے کی کوشش کیجیے، اور تو کچھ نہیں ہوگا لیکن زیادہ لیٹ ہونے پر زیادہ افسروں کے دستخط کرانے کی مصیبت پڑ جاتی ہے، ویسے بھی نقصان تو آپ ہی کا ہے نا جی۔ اور باقی معاملات فیس جمع ہوتے ہی خود بہ خود ٹھیک ہو جائیں گے، فکر کی کوئی بات نہیں ہے۔'' کلرک نے مزید خوش دلی اور اپنائیت کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ اُس نے چہرے پر زبردستی کی مسکراہٹ لاتے ہوئے سر ہلایا، کلرک صاحب سے ہاتھ ملایا اور دفتر سے باہر نکل آیا۔

اگلے ماہ تنخواہ آئی۔ اُس نے مالکِ مکان سے اِس ماہ کے کرایہ کو اگلے تین ماہ کے کرایہ کے ساتھ اقساط میں ادائیگی کا وعدہ کر کے چھوٹ حاصل کی۔ بجلی اور گیس کے بلوں کو بھی اگلے ماہ پر ڈالا کہ کم سے کم ایک ماہ تک ان کے کنکشنز کے منقطع نہ ہونے کی گارنٹی تو دی جاسکتی تھی۔ ہاں جرمانہ کی مدّ میں اضافی رقم یہاں بھی ادا کرنا پڑے گی مگر تنگ دستی کی اتنی سزا اٹھانا تو جائز بھی ہے اور واجب بھی۔ ماہانہ دیگر اخراجات کو بھی آخری حدوں تک سکیڑ دیا گیا۔ راشن بھی کم سے کم ڈالا گیا۔ اماں کی ماہانہ ادویات بھی میڈیکل اسٹور سے اس ماہ ادھار پر لے لی گئیں اور بینک سے لیے گئے قرضہ کی اس ماہ کی قسط کو بھی اگلے تین ماہ کی اقساط میں تقسیم کر کے بمع اضافی سود کے ادا کرنے کی درخواست دے دی گئی جسے بہ خوشی قبول کر لیا گیا۔ یوں فیس کی رقم کسی نہ کسی طور پوری کر کے وہ یونیورسٹی پہنچا۔ صدرِ شعبہ سے درخواست مارک کروائی انھوں نے دستخط

کرتے ہوئے صرف اتنا کہا ’’بچے! فیس وقت پر جمع کروایا کرو۔‘‘ وہ ’’جی سر‘‘ کہتا ہوا وہاں سے نکلا اور دستخط شدہ درخواست اور واجبات ادا کرنے دفتر پہنچا۔ اِدھر اُدھر نظر دوڑائی مگر متعلقہ کلرک کہیں نظر نہ آیا۔ ایک اور کلرک صاحب سے دریافت کیا تو پتہ چلا کہ موصوف دو دن کی چھٹی پر ہیں جس کا آج پہلا دن ہے۔ اُس نے مدّعا پیش کیا تو حاضر موصوف نے فرمایا کہ ’’ آپ کی فیس اختر صاحب (متعلقہ کلرک) کی غیر حاضری میں وصول کرنا ممکن نہیں کیوں کہ وہ ایک مخصوص فارم پر تاریخ کے ساتھ اینٹری ڈالیں گے تو واجبات جمع ہوں گے اور وہ فارم ان کی دراز میں ہے جو لاک ہے؛ آپ پرسوں آئیں۔‘‘ یہ کہ کر اُس کلرک نے اپنا منہ موڑ لیا اور کچھ اہم فائیلیں دیکھنے لگا۔ وہ شکستہ قدموں سے باہر آیا، ہاتھ میں دبی فیس میں سو روپے اوپر کی جیب سے نکال کر اور شامل کیے، اسے پینٹ کی ایک محفوظ جیب میں الگ سے رکھا اور گھر کی راہ لی۔

پرسوں وہ پھر دفتر پہنچا، اختر صاحب اپنی سیٹ پر موجود سر جھکائے بڑے انہماک سے اپنے فرائض ادا کرتے نظر آئے۔ اُس نے انہیں سلام کر کے مختصراً اپنے آنے کا مقصد بتایا۔ اختر صاحب کی آنکھوں میں اُسے جس شناسائی کی تلاش تھی وہ کہیں موجود نہ تھی۔ لہٰذا اُسے ساری بات پوری تفصیل سے بتانا پڑی۔ حتیٰ کہ وہ باتیں بھی جو خود اختر صاحب نے کہیں تھیں، وہ بھی اُسے دوہرانا پڑیں۔ خیر اختر صاحب نے فارم نکالا، اینٹری ڈالی اور بینک میں تمام واجبات سمیت فیس جمع کروا کر رسید کی کاپی لانے کو کہا۔ اُس نے فیس جمع کروائی اور رسید کی کاپی لا کر اختر صاحب کے حوالے کی۔ اختر صاحب نے اس کاپی کو اس فارم پر چسپاں کرتے ہوئے کہا ’’ آج شام چار بجے تک نوٹس تمہارے ڈیپارٹمنٹ پہنچ جائے گا، کل سے تم اپنی کلاسز لے سکتے ہو۔‘‘

وہ یونیورسٹی جانا شروع ہو گیا اور کلاسز بھی لینے لگا۔ کلاس فیلوز نے بھی اُسے شرمندگی سے بچانے کے لیے اِس موضوع پر کوئی بات نہ کی۔ اُسے نوٹس بھی مل گئے اور یہ بھی بتا دیا گیا کہ اِس دوران اُس کی غیر حاضری سے اُس کے لیے کسی قسم کی کوئی پریشانی پیدا نہیں ہو گی۔ اسائینمنٹس کے نمبر بھی لگا دیے گئے اور باقی معاملات بھی خوش اسلوبی سے طے پا گئے۔ لیکن کوئی یہ نہیں جانتا تھا کہ معاملات ظاہر میں تو اِس قدر آسانی سے سلجھ سکتے ہیں مگر باطن میں نہیں۔ اُس کا اندرون جس طرح الجھایا گیا تھا وہ اب سلجھنے سے قاصر تھا۔ وہ اُس اعتماد اور اطمینان سے محروم ہو گیا جو پہلے اُس کی شخصیت کا حصہ ہوا کرتا تھا۔ اُس کے اندر، بہت اندر کہیں، بہت کچھ ٹوٹ گیا تھا جو اب کبھی نہیں جڑ سکتا تھا۔ اُس کے لیے یک دم بہت سی باتوں کی اہمیت کم ہو گئی تھی اور بہت سی باتیں بے معنی۔ اور جب باتیں اپنی اہمیت کھو دیں یا معنی گنوا دیں تو زندگی میں دلچسپی نہیں رہتی۔ شاید یہی وجہ تھی کہ اُس میں کلاسز لینے کے معاملے میں اب پہلے جیسی نہ تو گرم جوشی رہی تھی اور نہ باقاعدگی۔ اِس واقعے نے اُس میں عجیب قسم کی دو ظاہری تبدیلیاں بھی پیدا کر دی تھیں۔ پہلے وہ اکثر خالی جیب یونیورسٹی چلا آیا کرتا تھا مگر اب پتہ نہیں کیوں جس دن اُس کی جیب میں کچھ معقول رقم نہ ہوتی وہ یونیورسٹی نہ آتا۔ اور جس دن آتا یونیورسٹی گیٹ سے داخل ہوتے ہوئے لاشعوری طور پر جیب تھپتھپا کر اُس میں رقم کی موجودگی کا یقین ضرور کرتا۔ دوسرا یہ ہوا کہ پہلے اُس نے کبھی یونیورسٹی کے چہرے کو غور سے دیکھنے کی کوشش نہیں کی تھی، پر اب وہ ہر بار داخل ہونے سے پہلے ضرور اُس کے چہرے پر نظر ڈالتا، اور حیرت کی بات یہ تھی کہ ہر بار اُسے یہ چہرہ، یونیورسٹی کا چہرہ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ اُسے پہلی بار اِس بات کا شدت سے احساس ہوا تھا کہ ہم اکثر؛ عمارتوں، اشیا اور لوگوں کے نام اُن کے چہروں کی مناسبت سے نہیں رکھتے۔

☆☆☆☆

پُھول اور بہار

محمد محسن شاہ

(سابق طالب علم زمیندار کالج)

ایک زمانہ گزرا ہے دور ہمالیہ کے پہاڑوں میں ایک بادشاہ حکمرانی کرتا تھا۔ سب لوگ خوش و خُرم تھے اور اطمینان سے زندگی بسر کر رہے تھے۔ وہ لوگ دہیان کا گیان ہے۔ اسی لفظ کی طرف متوجہ رہتے اور ایسی بہت سی چیزوں کی طرف توجہ ہی نہ دیتے جو اُن کے گیان کو خراب کرنے والی ہوتی تھیں۔ وہ برائی، ظلم، ناانصافی، ملاوٹ، گراوٹ سے کوسوں دور تھے۔ جو گرو نے بتایا تھا وہی کچھ کرتے تھے۔ وہ بہت دھیان سے رہتے کہ اس جنم میں ہی مکتی ہو جائے اور وہ جنم جنم کی ذلالتوں اور غلاظتوں سے نیک اعمال کر کے بچ جائیں۔ وہاں پر خوشحالی اور رزق کی فراوانی تھی اور لوگوں میں لوٹ کھسوٹ کی بجائے قربانی کا جذبہ تھا اور وہ ایک دوسرے کی مدد کر کے خوش ہوتے تھے۔ وہاں پر ظلم و جبر اور دوسری معاشرتی برائیوں کے لیے جگہ ہی کہاں تھی۔ دُور پہاڑوں سے پانی کے چشمے وادی اور میدانوں میں اُترتے تھے۔ وہاں پر سات بڑے چشمے اور سات بڑے بڑے چٹان نما پتھر تھے۔ وہاں سے اُوپر سادھو اور جوگی لوگ استھان لگائے ہوئے تھے۔ وہ سب علاقہ اُن کے لئے حرمِ پاک کی سی حُرمت رکھتا تھا۔ وہاں سے اُن کے انجینئروں اور کسانوں نے مل کر سات پانی کے راستے بنائے ہوئے تھے۔ اور یہی پانی آگے چل کر نہروں کی صورت اختیار کر لیتا تھا۔ اور اُن کو جہاں کُھلی جگہ ملتی تھی وہاں پر اُنھوں نے ڈیم نما جھیلیں بنالیں تھیں۔ اور کھیتی، باڑی کے لئے سارا سال پانی میسر ہوتا تھا۔ چونکہ وہ گیانی لوگ تھے اس لئے اُن کے مسائل نہ ہونے کے برابر تھے اور اگر کوئی مسئلہ آ بھی جاتا تو وہ فوراً اُس کا حل نکال لیتے تھے۔ وہاں پر کھانے پینے کی ہر چیز میسر تھی، اُن کے دریاؤں اور ڈیموں سے مچھلی بہت زیادہ نکلتی تھی۔ اور وہ کھانے والی چیز کی بہت قدر کرتے تھے۔ اگر وہ خود نہ کھا سکتے تو دوسرے کو دے دیتے تھے۔ ہوا یوں کہ بادشاہ اور وزیر دونوں کے ہاں ایک ہی وقت میں بیٹے پیدا ہوئے۔ موسم بہار کا تھا اور دور تک پُھول ہی پُھول کھلے ہوئے تھے۔ اور بہار کی خوشبوؤں سے ہوا معطر تھی۔ درختوں پر پرندے سرگم کے سارے سُر گا رہے تھے۔ سارے ملک میں چراغاں ہوا اور مٹھائیاں بانٹی گئیں۔ فطرت بھی اُنکی خوشیوں سے خوش تھی۔ اب کی بار بہار بہت دیر جوبن پر رہی۔ اور دونو مولودوں کو لوریاں دیتی رہی۔ اگر نگاہ پُھول پر پڑتی تو خوشبو بھرا ہوا کا جُھونکا بہار کے ہونے کی منادی سُناتا تھا۔ سرسبز و شاداب موسم دیکھ کر اُن کے نام پھول اور بہار رکھ دئے گئے۔ ملکہ کی جُھولی میں پھول تھا تو وزیر کے کندھوں پر بہار کا ملکوتی حُسن تھا۔ پُھول اور بہار کی بچپن ہی سے گہری دوستی تھی۔ پھول اور بہار ایک دوسرے کے بغیر دیوانے سے ہو جاتے تھے۔ اس لیے سبھی کو معلوم تھا جہاں بہار ہے وہیں کہیں پُھول بھی جلوہ نما ہوگا۔ دونوں کی تعلیم و تربیت شاہی ماحول میں ہو رہی تھی۔ اور وقت کے بہترین اساتذہ اکرام اُن کے اتالیق مقرر تھے۔ اُن دونوں کو ادب، اخلاق، کردار اور انسانیت جیسے موضوعات پر لیکچر دینے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ بنیادی انسانی اور اخلاقی کردار اُن کے کسانوں اور مزدوروں میں بھی تھا۔ بہر حال اُن کو ہر لحاظ سے علم سے مرصع کیا گیا۔

وقت تو ایسے لگتا ہے کہ صدیوں کا فاصلہ لمحوں میں طے کر لیتا ہے۔ بہت جلد فرش پر بھاگنے والے ننھے سے بچے جوانی کی سرحدوں سے آنکھ مچولی کرنے لگے۔ اُن کے خوبصورت سُرخ گلابی، لشکارے مارتے ہونٹوں پر نرم مرم سی سبزے کی تہہ اُگنے لگی۔ نظر بھر کر اُن کو دیکھا نہ جاتا تھا۔ اُن کی اُٹھتی جوانی کا حُسن قیامت خیز تھا۔ اُن کی موٹی موٹی کالی اور گُلابی آنکھیں ہر نظر کو اپنے اندر جذب کر لیتی تھیں۔ اُن کو دیکھ کر

کتنے ہونٹ کُھلے کے کُھلے ہی رہ جاتے تھے۔ اور کہاں سے سرد آہیں اُٹھتی ہیں اور کس دل میں اُن کو دیکھ کر آگ لگ گئی! سارا گُلشن جانے تھا اور اگر نہ جانے تو پُھول اور بہار نہ جانے۔ وہ تو کہتے تھے۔ کہ وہ ایک دوسرے کے بغیر جی نہ پائیں گے۔ جلد ہی اُن کی شادی کی باتیں ہونے لگیں۔ اُن کے حُسن واخلاق کے چرچے تو پہلے ہی تھے اور پھر شادی کی بات بھی ساری ریاست میں پنکھ لگائے ہوا کے دوش پر اُڑنے لگی۔ سبھی حیران تھے کہ وہ شادی نہیں کروانا چاہتے۔ سچ تو یہ ہے والدین کے علاوہ بھی وہ ساری ریاست کی آنکھ کا تارہ تھے۔ بہار سے جب ماں موقع دیکھ کر بات کرتی تو وہ کہہ دیتا کہ میرے لیے تو بس پُھول ہی کافی ہے میری زندگی تو پُھول سے ہے۔ پُھول سے جب ماں موقع دیکھ کر بات کرتی تو وہ کہہ دیتا کہ میری زندگی تو بہار سے ہے۔ میرے لیے تو بس بہار ہی کافی ہے۔ پُھول کی زندگی تو بہار سے ہے بہار نہیں تو پُھول خود بخود مر جائے گا۔ اُن دونوں کے درمیاں کسی تیسرے کا آنا ناممکن لگتا تھا۔ وزیر با تدبیر تو کیا یہاں تو اُن کی بیگم بھی زور لگا چُکی تھیں مگر کسی کی دال نہ گلتی تھی۔ یہ بات اُڑتے اُڑتے ایک کنچنی تک جا پہنچی۔ وہ بادشاہ کے پاس آن حاضر ہوئی۔ اور کہا کہ وہ اُن دونوں کی دوستی ختم کرا سکتی ہے۔ پھر جو جی چاہے کر لینا۔ وہ کہنے لگی: ان کی رگوں میں جوانی کا خون ہے مگر بچپن کے بُھول پن میں کھویا ہوا ہے۔ میں اس مشکل کا حل کیے دیتی ہوں بادشاہ اور وزیر بہت خوش ہوئے اور اُسے ہر وہ سہولت دی جو اُس نے مانگی۔

سرِ شام دونوں دوست سیر کرنے دریا کنارے جاتے تھے۔ دریا سے تازگی کی ایک باس اُٹھ رہی تھی۔ اور دُور تک پھیلا ہوا دریا کا مٹیالا پانی ڈوبتے سورج کے نیچے سرُخی مائل ہوئے جا رہا تھا۔ وہ کہنے لگی مجھے ایک ڈولی میں بٹھا کر اُسی راستے پر چھوڑ دیا جائے۔ بہار اور پُھول اپنی باتوں میں کھوئے ہوئے سیر کرتے ہوئے جا رہے تھے۔ کنچنی نے ڈولی میں بیٹھے اُن کو اپنی طرف آنے کا اشارہ کیا۔ پہلے تو دونوں دوست بہت حیران تھے کہ وہ ڈولی اس ویرانے میں کیسے آئی۔ وہ اشارہ اس انداز سے کر رہی تھی کہ اُن کو پتہ ہی نہیں چل رہا تھا کہ وہ بُلا کس کو رہی ہے۔ پُھول کہتا: بہار وہ تمھیں بلاوت ہے اور بہار کو لگتا پُھول کو جانا چاہیئے۔ آخر بات بڑھتی چلی گئی۔ اور آوازیں بلند ہونے لگیں۔ اَب وہ غصّے میں تھے اور ایک دوسرے کو سخت بول رہے تھے۔ اِسی تُوں تکار میں ایک دوسرے کو دھکے مارے۔ پھر بہار وہاں سے چل دیا۔ اب پھول وہاں اکیلا رہ گیا۔ اب وہ خود بخود ڈولی کی طرف چلنے لگا۔ اب ناز وادا اور نخرے اُسے کون بتائے۔ اُس نے پُھول کو بڑے پیار سے بتایا۔ کہ یہی تمھارا دوست تھا جو اس ویرانے میں تمہیں چھوڑ کر چلا گیا۔ یہاں پر طرح طرح کے جنگلی جانور شیر اور چیتے ہیں اور کئی طرح کی بلائیں ہیں جو خون پی جاتی ہیں۔ بہار کو تمہاری تو محبت اور پیار کا کوئی پاس ہی نہیں۔ توں کس سے پیار کرتا ہے۔ جو جب چاہے تمھیں چھوڑ جائے۔ اُس نے شہزادے کو خوب گرمایا اور وہ واپس محل میں آتے ہی پھٹ پڑا۔ اُس نے بادشاہ سے کہا: بہار کو قتل کر دیا جائے! میں اب اُسے زندہ نہیں دیکھ سکتا۔ بادشاہ نے وزیر کو بُلا کر حُکم دیا: بہار کو قتل کر دیا جائے! وزیر: بادشاہ سلامت، شہزادے کا یہ ایک وقتی اُبال ہے۔ وہ بن بہار جی نہ پائے گا، شہزادۂ معظم کو بہار کے خون آلود کپڑے دکھا دیے جائیں مگر بہار قتل نہ کیا جائے۔ بادشاہ نے شاہی جلال میں دوبارہ حُکم دیا، بہار کو قتل کر دیا جائے! بادشاہ کا حتمی حُکم سُن کر وزیر وہاں سے نکل آیا۔ اگلے دن وزیر بادشاہ کے سامنے بہار کے خون آلود کپڑے لے کر حاضر ہوا۔ وہ شہزادے کو وہ کپڑے دکھا دے۔

اب بادشاہ نے بڑی دُھوم دھام سے شہزادے کی شادی خانہ آبادی کر دی۔ اور وہ اپنی نئی دنیا میں کھو گیا۔ زندگی اپنی ڈگر پر چلتی رہی۔ پھر اچانک شہزادہ پھول بیمار سا رہنے لگا۔ آہستہ آہستہ شاہی طبیب اُس کا علاج کرنے سے معذرت خواہ ہونے لگے۔ اُن کو کوئی ایسی

بیماری نہ ملی جس کا وہ علاج کر سکتے۔ شہزادے کی حالت دیکھی نہ جاتی تھی۔ وہ بستر پر پڑا نظر نہ آتا تھا۔ دوسرے ملکوں سے بڑے بڑے طبیب آئے مگر پھول مُرجھاتا ہی چلا گیا۔ اور کسی کو کوئی مرض نہ ملا۔ شہزادہ نہ کھاتا نہ ہی کچھ پیتا تھا اور نہ ہی اُسے کہیں درد تھا۔ اُسے چُپ سی لگ گئی تھی۔ جو چیزیں خوشی کا ساماں تھیں اُن سے اُس نے منہ موڑ لیا تھا۔ آخر ایک دن ایک حکیم آیا اور دیر تک شہزادے کی نبض دیکھتا رہا۔ اُس نے شہزادے سے اپنے عزیزوں کے نام پُوچھے، پھر اُن لوگوں کے نام پُوچھے جو اس دنیا میں نہ رہے تھے۔ بہار کے نام پر آ کر پُھول کی نبض پھڑکی۔ حکیم نے جب شہزادے سے بہار کی بات پُوچھی تو اُس کی نبض چلنے لگی اور اُس کے وجود میں زندگی نے حرکت کرنا شروع کر دی۔ بہار کا نام بجھتے ہوئے چراغ میں تیل بن کر لو دینے لگا۔ مگر جب اُسے بہار کے خون آلود کپڑے یاد آئے تو اُس کا دل ڈوبنے لگا۔ اور وہ اُسی نا اُمیدی کی دُنیا میں کھو گیا جہاں سے کوئی لوٹ کر نہیں آتا۔ حکیم نے آ کر بادشاہ سے عرض کی کہ اگر بہار پُھول کی زندگی میں آجائے تو وہ زندہ بچ سکتا ہے۔ اور اگر بہار اُسے نہ ملے تو شہزادہ نہ بچ پائے گا۔ اب بادشاہ کو دُکھ تھا کہ اُس نے تو خود بہار کے قتل کا حُکم دیا تھا۔ اُس کا خون آلود چُولا بادشاہ کی نگاہوں کے سامنے تیرنے لگا۔ اب وہ خون کے آنسو رو رہا تھا۔ بادشاہ کو اپنے بیٹے کی یقینی موت دکھائی دے رہی تھی۔ اُسے احساس ہوا کہ کیسے اُس نے بہار کی زندگی چھین لی تھی۔ اور اب اپنے بیٹے کو لمحہ لمحہ مارتی ہوئی موت اُسے دکھائی دے رہی تھی۔ اور اُس کا لختِ جگر خاموشی سے مر رہا تھا۔ بادشاہ نے وزیرِ دوربیں سے ساری صورتِ احوال بیان کی کہ بہار کی موت ہی پھول کے مرنے کا سبب ہے۔ وزیر نے عرض کیا: بادشاہ سلامت ہوسکتا ہے بہار ہمیں مل جائے۔ بادشاہ وزیر کے پاؤں پڑ کر بچوں کی طرح بلک بلک کر رونے لگا۔ گویا کسی مرنے والے کو زندگی مل گئی ہو۔ بادشاہ نے کہا شہر شہر نگر نگر ڈھنڈورا پیٹ دو کہ بہار لوٹ آئے۔ وزیر نے باادب انداز میں عرض کی بادشاہ سلامت اُس کے دماغ میں میری عقل ہے اور وہ اتنی آسانی سے ملنے والا نہیں ہے۔ بہار تو مر چُکا ہے جانے وہ اب کس نام سے زندہ ہو یا نہ ہو۔ وزیر نے پُھول سے بات چیت کرنا چاہی مگر وہ بِن بہار کے مرجانا ہی زندگی سمجھتا تھا۔ آخر وہ بہار کی باتوں میں کھو جاتا اور ایسے لگتا اُسے کوئی مرض تھا ہی نہیں! مگر تھوڑی دیر بعد شہزادے کے اپنے خیالات ہی اُس کا خون پی جاتے اور ایسے لگتا کہ وہ تھوڑی دیر کا مہمان ہے۔

دوسری طرف وزیر نے بہت سی بکریاں اپنے ساتھ لے لیں اور ساتھ میں نوکر چاکر لے لیے۔ وہ گوٹھ گوٹھ نگر نگر خود جاتا۔ ہر جگہ وہ دو دو بکریاں دیتا رہا۔ وزیر ساتھ میں بکریوں کا وزن کر لیتا۔ وزیر کہتا کہ ایک سال بعد میں دوبارہ بکریاں واپس لینے آؤں گا۔ اگر بکریوں کا وزن وہی ہوا جو میں آج دے رہا ہوں تو اُس بندے کے لئے شاہی خزانے کے منہ کھول دیے جائیں گے اور اُس کو منہ مانگا انعام دیا جائے گا۔ بادشاہ اور وزیر اُس کو آنکھوں پر بٹھائیں گے۔ وقتِ مقررہ پر وزیر نے بکریاں واپس لینے کے لیے دوبارہ چکر لگایا۔ وہ بکریوں کا وزن کرتا اور اُن سے معلوم کرتا کہ اُنھوں نے بکریاں کیسے رکھیں۔ کہیں وزن کم تو کہیں زیادہ ہوتا۔ کوئی کہتا کہ اُس نے بکریاں ایک دن چرائیں اور دوسرے دن بھوکی رکھیں اور کوئی اُن کو چرانے کے بعد چلا تا رہا۔ کوئی کہتا اُس نے آدھا دن اُن کو چارہ دیا اور آدھا دن بھوکا رکھا۔ الغرض کوئی بات وزیر کے دماغ اور فکر کے مطابق نہ تھی۔ یوں وہ اگلے گراں کو چل دیتا۔ آخر ایک گاؤں میں بکریوں کا تول وہی نکلا جو اُس نے دیا تھا۔ وزیر کے پوچھنے پر کسان کہنے لگا: میں دن بھر اِن بکریوں کی سیوا کرتا تھا۔ اور اللہ کی ہر نعمت اِن کو دیتا رہا۔ جب رات ہوتی تو اِن کو میں ایک پہاڑ کی کھو کے پاس ایک محفوظ جگہ پر باندھ آتا۔ وہاں پر بھیڑیے رہتے تھے۔ مگر بکریاں اُن کی پہنچ سے دُور تھیں۔ رات بھر وہ خوف سے کانپ کانپ جاتیں کہ کہیں بھیڑیے ہمیں کھا نہ جائیں۔ یوں خوف سے اور اُن کا وہ خون خشک ہو جاتا جو سارا دن چارہ کھانے سے بنتا تھا۔ اس طرح ان کا وزن

برابر رہا۔ وزیر کے دل و دماغ نے کسان کی بات کو قبول کرلیا۔ جب وزیر نے گہری نظر سے دیکھا تو اُس کے سامنے بہار کھڑا تھا کیوں کہ وہی اُس کے فہم و فراست کو سمجھ سکتا تھا۔ وزیر نے سب کسانوں کو انعام و اکرام سے نوازا اور اپنے بیٹے کو ساتھ لیا جو روپ بدل کے اپنا گزارہ کر رہا تھا۔ شاہی ہرکارے نے فوری طور پر جا کر بادشاہ سلامت کو بہار کے ملنے کی اطلاع دی۔ جب پُھول کو علم ہوا کہ بہار آ رہا ہے تو اُس کی اُکھڑی ہوئی سانسیں بحال ہوگئیں۔ وہ خود اُس طرف دوڑ پڑا جہاں سے بہار آ رہا تھا۔ بادشاہ نے سارے ملک میں چراغاں کا اعلان کر دیا اور غریبوں مسکینوں کے لیے اپنے خزانوں کے منہ کھول دئے۔

☆☆☆☆

اگر تم کو منانا آ گیا ہے
ہمیں بھی روٹھ جانا آ گیا ہے
پرندوں سے کہو اب لوٹ آئیں
چھتوں پر آب و دانہ آ گیا ہے
کہیں دیوار کھینچی جا رہی ہے
کسی کو گھر بنانا آ گیا ہے
(سعید)

بھان متی کا کنبہ

سید علی اصغر رضوی

پندرہ سال بعد میں سیڑھیاں اترا تو دونوں ستونوں کے ساتھ فولادی زنجیریں اسی طرح بندھی تھیں پندرہ سالوں میں کبھی بھی اس مقفل تہہ خانے کو نہیں کھولا گیا۔ جس طرح میں نے اس تہہ خانے کی تمام کھڑکیاں اینٹوں کی دیواریں کھڑی کر کے بند کی تھیں تمام روشن دان، ہوادار گوشے یہاں تک کہ چونٹیوں کی نلیں بھی سب کچھ پندرہ سال بعد باہر کی ہوا کھا رہا تھا۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ باہر کی ہوا اور ہے اندر کی ہوا اور ہے، دونوں آپس میں مل نہیں رہیں۔ تہہ خانے میں عجب سی سرانڈ تھی سانس لینے میں مشکل ہو رہی تھی مجھے زور لگانا پڑ رہا تھا اور اس سے دل کی دھڑکن بڑھ گئی تھی میں نے سب سے نچلے زینے سے فرش پہ پاؤں رکھا تو جیسے چکر سا آ گیا مجھے یوں لگا جیسے کوئی میرے پاس سے بہت تیزی سے گزر گیا ہو میری نظریں میرے ارادوں کا ساتھ نہیں دے رہی تھیں بہ مشکل میں گردن ٹیڑھی کر سکا مکمل گھوم کر پیچھے نہ دیکھ سکا یوں لگا وہ دونوں مجھ پہ ہنس رہے ہیں یوں ڈیڑھ دھائی بعد سارے واقعات میرے ذہن میں زندہ ہو گئے۔ ایک رات سونے سے پہلے مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ کہانی مکمل ہو گئی ہے کسی بھی وقت کاغذ قلم کی ضرورت پڑ سکتی ہے میں نے کاغذ قلم اپنے سرہانے دھر لیے میں نے خواب میں دیکھا کہ دو آدمی آپس میں بحث کر رہے تھے ان میں سے ایک نے ہاتھ میں لٹھ پکڑی ہوئی تھی جس کی آنکھیں اندر کو دھنسی، مونچھیں بڑی بڑی اور لمبی کھچڑی داڑھی تھی وہ بات کرتے کرتے کبھی مونچھوں کو تاؤ دیتا تو کبھی بے ترتیب داڑھی میں انگلیاں پھیر کر اسے اور بے ترتیب کرتا جاتا وہ کہہ رہا تھا۔ ’’بھائیا! تیرے میرے وچ اک گل ہوئی سی، توں اوس گل توں پھر نا ئیں۔ اوتھاں توں کھڑا سیں۔ ای تھاں میں کھڑا ساں ساڈے وچ برابری دی گل سی۔

اس پر دوسرا مخاطب ہوا جس کے ہاتھ میں کاغذوں کا پلندہ تھا اس نے سفید رنگ کا چغہ پہنا تھا شانوں پر لمبے بکھرے بال داڑھی صفاچٹ جب کہ مونچھیں تھیں اس کا ماتھا چوڑا تھا اور اس کے مقابلے میں چہرہ قدرے چھوٹا محسوس ہوتا تھا آنکھیں نیلی تھیں مگر ایسے جیسے ابلی پڑی ہوں کہ ڈھیلے کسی بھی وقت باہر گر جائیں گے لیکن جو چیز اس کے چہرے کو پرکشش اور باہمت بناتی تھی وہ سوچ کی لکیر تھی جو اس کی سیدھ میں ماتھے پر ابھری تھی اور ماتھے کی آخری حد تک چلی گئی تھی کبھی جب ہاتھ بلند کرتا تو ایسا لگتا کہ ابھی کاغذ ہوا میں اچھال دے گا یا جب ہاتھ نیچے آتا تو یوں لگتا کہ ابھی زمین پر پٹخ دے گا اس نے کہا: ’’صاحب میں آپ کی بات سمجھ گیا ہوں آپ جس مفروضے پر استدلال کر رہے ہیں اس کی سرے سے کوئی بنیاد ہی نہیں میں کوشش کروں گا کہ ساری بات آپ کے سامنے اس طرح بیان کروں کہ آپ کی تشفی ہو جائے‘‘ اس نے اپنا داہنا ہاتھ ایک طرف کو ایسے چلایا جیسے پردہ ہٹا رہا ہو اور واقعی ہوا میں ہاتھ چلانے سے ایک پردہ ہٹ گیا وہاں ایک خاموش فلم چل رہی تھی میں نے دیکھا کہ ایک غار ہے جس میں ایک ننگا پنگا آدمی اکڑوں بیٹھا ہے وہ پریشان ہے اس کے پاس ایک پتھر ہے جب بے چینی بڑھتی ہے تو اپنے پاؤں کے درمیان پتھر سے مٹی کریدنے لگتا ہے۔ غار کے دھانے پر ایک کالا ناگ پھن پھیلائے کھڑا ہے آدمی اپنی جگہ سے ہلتا ہے اور نہ ہی ناگ۔ ناگ غصے سے پھنکارتا جاتا ہے اور آدمی ڈر جاتا ہے۔ دوسرا آدمی کہنے لگا یہ تازہ کہانی ہے یہ اس سے آگے نہیں بڑھ پا رہی (قدرے اونچی آواز میں) یا میں یہ کہوں کہ آپ میرے کردار پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں (یاد رہے کہ وہ کاغذوں والا ہاتھ اوپر لے کر جاتا ہے پھر نیچے جیسے ان کاغذوں کو ہوا میں اچھال دے گا یا زمین پہ پٹخ دے گا)۔ اب پہلے آدمی نے دوسرے کو گھور کے دیکھا اس کی آنکھوں میں

جارحیت، سچائی اوراعتماد تھااورلٹھ پہ پکڑ مضبوط کرلی۔ دوسرے نے جب یہ دیکھا تو اس کے لہجے میں نرمی آ گئی اس نے اپنی بات جاری رکھی

"آپ یہ دیکھیں کہ جب میرے غار پر ناگوں کا حملہ ہوتا ہے۔ آپ ناگوں کے راجہ میرے غار کے دھانے پر پھن پھیلائے جھوم رہے ہیں جتنے روزن ہیں ان پر بھی ناگ فوجی پھن پھیلائے بیٹھے ہیں فرار کا کوئی راستہ نہیں میرے پاس بس ایک حل بچتا ہے کہ میں غار کا چھت توڑ دوں اب آپ یہ دیکھیں کہ میں کتنا بے بس اور آپ کتنے خودمختار ہیں۔ اس پر پہلے آدمی نے کہا" توں بھانویں چالاک ہوویں پر سوٹا میرے کول اے" اب دوسرا کہنے لگا" ایسا ہے کہ صبح ہونے دو ہم افسانہ نگار سے فیصلہ کروالیں گے" مجھے نئی کہانی کا پلاٹ مل گیا تھا میں یہ سوچ رہا تھا کہ آگے کیا ہوگا؟ میں نے مختلف امکانات تلاش کرنے کی کوشش کی ہر بار تصادم ہوجاتا کبھی ناگ مرجاتا کبھی آدمی یا پھر دونوں۔ مثلاً اگر ناگ آدمی پر حملہ کرے اپنے دو زہریلے دانت نکالے ہوئے، پھنکارتے تیز رفتاری سے تو وہ آدمی کو ڈس لے گا یوں آدمی مر جائے گا، کہانی ختم یوں ہوسکتا تھا کہ ناگ آدمی پر حملہ کرے آدمی اچھل کر حملہ ناکام بنائے اور پتھر سے ناگ کا سر کچل دے تب بھی کہانی ختم یا یوں ہوتا کہ ناگ آدمی کو غار سے باہر آنے دیتا، کھلے میدان میں مقابلہ ہوتا آدمی ناگ کا سر کچلتا اور کوئی فوجی ناگ آدمی کو ڈس لیتا دونوں کردار مارے جاتے اور اب بھی کہانی ختم۔ کہانی میں دل چسپی کے لیے تجسس، کشمکش کچھ بھی نہیں بلکہ سرے سے کہانی ہی نہیں ایک واقعہ ہے بس۔

صبح بے چینی کے عالم میں گھر کے باغیچے میں کرسی پہ بیٹھا سوچ رہا تھا کہ گھر سے ملحقہ باغ کی طرف کھلنے والا دروازہ جو ابھی مجھ سے محض دس گز کی دوری پہ تھا ہلکا سا ہلا مجھے یوں لگا کہ جیسے کوئی بہت تیزی سے دروازے کے اس پار گیا ہے میں نے نظر اٹھا کے دیکھا تو جو کوئی بھی تھا جا چکا تھا میں نے سوچا یہ میرا وہم ہے پھر بھی اپنے دل کی تسلی کے لیے میں باغ میں گیا داخل ہوتے ہی میں نے دائیں بائیں دیکھا وہاں کچھ نہیں تھا۔ میں روش پہ ٹہلتا ہوا پھولوں کی کیاریاں دیکھتا جاتا تھا پھولوں کی کیاریوں سے آگے تالاب تھا تالاب کے چاروں طرف سرو کے پودے تھے یعنی ایک طرح کی دیوار تھی۔ میں نے مرکزی روش کو چھوڑا تھوڑا سا دائیں مڑا اور تالاب کی طرف جانے والی روش پر ہو گیا جونہی میں نے روش بدل کر آنکھ اٹھائی میں نے دیکھا دو آدمی تالاب کی سیڑھیوں کے پاس کھڑے تھے آپس میں باتیں کررہے تھے ایک آدمی نے پینٹ کوٹ پہنا اور ٹائی لگائی تھی بھورے رنگ کے جوتے چمک رہے تھے سر کے بال تازہ ترشے تھے چہرے پر فرنچ کٹ داڑھی تھی۔ دوسرے آدمی نے سفید کاٹن کی کلف لگی شلوار قمیص پہنی تھی سر پر سفید رنگ کا پٹکا بندھا تھا پاؤں میں کالے رنگ کی پشاوری طرز کی کھیڑی چمک رہی تھی میں چلتا ہوا آگے بڑھا تو اس نے ہیلو کہہ کے مجھ سے ہاتھ ملایا اس نے بتایا کہ اس کا نام ڈیوڈ بانگا ہے (دوسرے آدمی نے ہاتھ ملایا) یہ میرے دوست چودھری اکرم گلہری ہیں ہم دونوں آپ سے کچھ پوچھنے آئے ہیں میرے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ آئی ظاہر ہے مجھے معلوم تھا کہ یہ کس بارے میں بات کررہے ہیں۔ میں نے کہا چلیے ڈرائینگ روم میں بیٹھ کر بات کرتے ہیں میں نے ان لوگوں کے لیے چائے بنوائی چائے پینے کے بعد میں نے کہا آپ کس بارے میں جاننا چاہتے ہیں؟

ڈیوڈ بونگا بولا سر ہم دونوں کے ساتھ ایک ایک کہانی ہے پہلے آپ وہ کہانیاں سنیں اور پھر درست جواب دیں میرے ذہن میں تھا کہ وہی رات والا جھگڑا ہوگا لیکن جب وہ سنانے لگا تو میں بہت سٹپٹایا لیکن مروت کے مارے کچھ کہہ نہ سکا وہ کہہ رہا تھا سر میں زینو کا پیروکار تھا جس نے حرکت کے خلاف دلائل دیے تھے میں نے بھی زندگی بھر مطلب عارضی زندگی یعنی جب میں یونان میں ہوتا تھا آج سے تقریباً دوہزار سال پہلے میں مرشد کے نظریات کا دفاع کرتا رہا جب اخیر عمر میں اعضاء مضمحل ہو گئے تو میں سمجھ گیا کہ اب کچھ دنوں میں میں مرجاؤں گا دن بہ دن

کمزوری بڑھتی گئی آخر میں یہ نوبت آئی کہ میں ہل جل بھی نہیں سکتا تھا۔حواس کبھی قائم ہوجاتے اور کبھی بے دماغی رہتی یہ بات پھیل گئی کہ زینو کا مرید جان کنی کی کیفیت میں ہے تمام عزیز رشتہ دار، دوست احباب، شاگرد میرے بستر کے گرد اکٹھے ہو گئے جھاڑے کا موسم تھا ہر طرف برف ہی برف تھی زمین نظر نہیں آتی تھی ساری رات میں لرزتا کانپتا رہا علی الصبح کچھ افاقہ ہوا سب یہ سمجھ رہے تھے کہ چراغِ سحری آخری بار ٹمٹمایا ہے اب بجھ جائے گا جب دن بارہ بجے تک بھی میں نہ مرا تو لوگ ایک ایک دو دو کر کے جانے لگے یہاں تک کہ سہ پہر تک قریبی رشتہ دار ہی رہ گئے جب کئی دن تک میری یہی حالت رہی تو لوگوں میں چہ مگوئیاں ہونے لگیں اب سوچوں تو ازحد دلچسپ معلوم ہوتی ہیں تب اذیت دیتی تھیں ایک سال تک میں اس حالت میں رہا اس دوران میری جان کنی کی کیفیت سے متعلق تین باتوں نے قبولِ عام حاصل کر لیا ان میں سے پہلی بات مذہبی پیشوا نے کی تھی انھوں نے بتایا کہ رات کو ملک الموت نے انھیں خواب میں زیارت کروائی اور پوچھا کہ کوئی ایسی بات جو تیرے دل میں ہے جو تجھے پریشان کیے ہوئے ہے؟ میں نے کہا آں حضرت جانتے ہیں آپ سے دلوں کے بھید کہاں چھپے ہیں اس پر ملک الموت مسکرایا اور کہنے لگا اے بنی آدم! جو تم بوتے ہو وہی کاٹتے ہو اس شخص نے ساری عمر کفر کیا دیوتاؤں کا انکار کیا ایک غیر ممکن بات کی رٹ لگائے رکھی قدرت اور فطرت کے بنیادی کلیوں اور قاعدوں سے انکار کیا اب ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ اس کی جان بھی ویسے ہی نکلے گی۔ دوسری بات میرے ایک شاگرد نے کی وہ مذہبی پیشوا کی بات کا الٹ تھی اس نے کہا چوں کہ میرے استادِ محترم قدرت کے ایک بڑے اہم قانون کو اپنے دلائل سے ثابت کر چکے ہیں لہٰذا ان کی موت کا وقت جو کہ بظاہر ایک لمحہ ہے اب زینو کے دلائل کی روشنی میں ساکت ہے، حرکت نہیں کر رہا۔تیسری بات میرے ایک معتقد نے پھیلائی کہ میرے اندر زینو کی روح حلول کر گئی ہے اور میں اب کبھی نہیں مروں گا۔ان تین باتوں سے میں ایک مافوق الفطرت ہستی بن گیا میں ہر چند ان لغویات کی تردید کرنا چاہتا تھا لیکن بدن میں اتنی طاقت نہیں تھی کہ میں بات کر سکتا خدا خدا کر کے ایک سال بعد ملک الموت میرے پاس آیا میں نے آنکھیں کھولیں تو دیکھا سفید پروں والا فرشتہ ہے، نورانی چہرہ ہے اور اس نے اپنے شفیق گداز ہاتھوں میں میرا ہاتھ تھام رکھا ہے میں یہ جان چکا تھا کہ اس کے ہونٹوں پہ جان لیوا تبسم کچھ ہی دیر میں کھِل اٹھے گا اس نے سنجیدگی سے کہا میں تمھارے دل کا حال جانتا ہوں تمھارا سوال یہ ہے کہ ایک سال کیوں؟ اس سوال کا جواب تمھیں خود ڈھونڈنا ہوگا ''تم کیا بننا پسند کرو گے'' ''مجھے خبر بنا دو'' ''خبر تو ایک دن زندہ رہتی ہے'' اب میرا ماتھا ٹھٹکا ''اچھا تو ستارہ بنا دو'' ''سوچ لو بہت دور ہے جاؤ گے، اکیلے رہو گے، پکار کا جواب بھی نہیں ملے گا'' اب تو میں واقعی سوچ میں پڑ گیا آخر میں نے اپنا فیصلہ سنا دیا ''مجھے افسانہ نگار کا ذہن بنا دو'' ملک الموت کہنے لگا ''تم بھلا مرو گے کیسے؟'' تو سر ملک الموت نے میری بات مان لی اس نے مرے سامنے افسانہ نگاروں کی ایک طویل فہرست رکھی اس نے بتایا کہ ہر نام کے آگے سرخ لکیر ہے جس کی لکیر جتنی لمبی ہوگی وہ اتنا ہی ذہین ہوگا میں نے پوچھا کہ ان لوگوں کے تعارف نامے نہیں ملیں گے جن سے پتہ چل سکے کہ یہ لوگ کس زمانے کے ہیں ان کے عادات واطوار، نیز، اخلاق کے بارے میں، مکان کے بارے میں معلومات مل جائیں تا کہ انتخاب میں آسانی ہو ملک الموت نے کہا وہ بس تمھاری قسمت ہے تم انتخاب کرو۔(میں نے دل میں سوچا کتنی بری قسمت تھی)۔تو سر میں نے آپ کا انتخاب کر لیا کئی دہائیوں سے میں اور یہ چودھری اکرم گلھری آپ کے ساتھ ہیں کہ مناسب موقع ملے تو آپ سے دریافت کریں آج آپ کے روبرو اپنا سوال دہرا رہا ہوں کہ ایک سال جان کنی میں کیوں لگ گیا؟ میں نے کہا مسٹر ڈیوڈ آپ کا سوال تو کافی مشکل ہے میں کافی غور کے بعد ہی کسی نتیجے پر پہنچ سکتا ہوں لہٰذا ہم ابھی چودھری اکرم گلھری کی کہانی سنیں گے (دل میں کہا بکواسیات سنیں گے)

چودھری اکرم گلہری نے کھنکار کر اپنا گلا صاف کیا اور اپنے پٹکے کے سرے سے اپنی باچھیں صاف کیں اپنے سونٹے کو اپنی ٹانگوں کے درمیان کھڑا کیا دونوں ہاتھوں سے اسے مضبوطی سے پکڑ لیا ایک دفعہ میرے منہ کی طرف دیکھا پھر ڈیوڈ بونگا کی طرف دیکھا پھر حلا میں گھورنے لگا جب چند ساعتیں گزر گئیں اور چودھری اکرم گلہری نا بولا تو میں نے کھنکار کر اس کی توجہ اپنی جانب مبذول کرائی اور اپنے ہاتھوں سے اشارہ کیا کہ کیا ہوا ہے؟ کہانی کیوں نہیں سنا رہے؟ اس نے بڑے اعتماد سے اپنا سر جی ہاں میں ہلایا اور کہنا شروع کیا۔ میں ایک چرواہا تھا جنگل میں اپنی بھیڑ بکریاں چرایا کرتا تھا قدرت نے مجھے دانائی دی میں نے لوگوں کے درمیان فیصلے کرنا شروع کر دیے میرا فیصلہ ہمیشہ درست ہوتا اور سب لوگ اسے مان لیتے ایک روز میرے دل میں گھمنڈ آیا کہ آہا! میں تو زمانے کا سب سے چالاک آمی ہوں بات سن کر فوراً اس کی تہہ تک پہنچ جاتا ہوں میری قسمت بری کہ میں نے ایسا سوچا۔ اس وقت سے لوگ میرے پاس فیصلہ کروانے کے لیے آنا بند ہو گئے ایک دو دن بعد مجھے خبر ملی کہ ایک نیا منصف آیا ہے اس کے پاس ایک شیر ہے اگر فریقین فیصلے پر متفق نہ ہوں تو پھر شیر فیصلہ کرتا ہے مجھے دکھ تو ہوا لیکن میں نے خود کو اس معاملے سے الگ ہی رکھا ایک روز عجیب بات ہوئی کہ میں تو جنگل میں بھیڑ بکریاں چرا رہا تھا ادھر لوگ لٹھ لے کر غصے میں پھنکارتے ہوئے میرے پاس آئے میں نے پوچھا سب خیریت تو ہے؟ کہنے لگے کہ نیا منصف کہتا ہے کہ تمھارے پاس جو بھیڑ بکریاں ہیں یہ اس کی ہیں۔ چوں کہ وہ جھوٹ نہیں بولتا اور اس کے پاس شیر بھی ہے تو تم چپ چاپ یہ بھیڑ بکریاں ہمارے حوالے کر دو نہیں تو پنچایت میں حاضر ہو جاؤ میں نے سوچا کہ اب موقع ہے کہ میں بھی اپنی صلاحیتوں کو آزماؤں میں نے کہا میں پنچایت میں بات کروں گا اسی وقت میں نے ریوڑ اکٹھا کیا اور ان لوگوں کے ساتھ پنچایت میں پہنچ گیا میں نے دیکھا کہ منصف زمین پر اپنے شیر کے ساتھ ٹیک لگائے بیٹھا ہوا ہے۔ میں نے گھوم کر ایک دفعہ سب لوگوں کو دیکھا پھر اپنے ریوڑ کو دیکھا اور کہنا شروع کیا کہ کون یہ کہہ سکتا ہے کہ یہ بھیڑ بکریاں میری نہیں میرا اتنا کہنا تھا کہ نیا منصف ایک دم سے اپنی جگہ پر کھڑا ہو گیا اس کے چہرے سے جلال ٹپک رہا تھا اس نے کہا جو سچ کہہ رہا ہوتا ہے اس کی آواز اونچی نہیں ہوتی اس کے لہجے سے سچائی کھنک رہی تھی میں نے ذرا دھیمی آواز میں کہنا شروع کیا کہ بھلا آپ یہ کیسے ثابت کر سکتے ہیں کہ یہ ریوڑ آپ کا ہے؟ اس نے کہا میں اپنے شیر کو آزاد کروں گا اور اگر اس نے تمھارے ریوڑ پر حملہ کیا تو تم سچے اور اگر اس نے تم پر حملہ کیا تو میں سچا۔ میں نے کہا کہ مجھے یہ منظور نہیں اس نے سب لوگوں کو مخاطب کر کے کہا کیا آپ یہ دیکھ رہے ہیں کہ یہ ملزم پنچایت کا فیصلہ نہیں مان رہا لوگوں نے آگے بڑھ کر مجھے پکڑ لیا اور رسیوں سے باندھ دیا پھر شیر کے گلے کی زنجیر کھول دی گئی اس نے ایک جھرجھری لی اور اپنے مالک کی طرف دیکھا اس کا سر جھکا ہوا تھا اس نے کوئی جنبش یا اشارہ نہ کیا۔ شیر نے آہستہ آہستہ چلنا شروع کر دیا اس نے ریوڑ کے گرد چکر لگایا پھر میرے سامنے آیا مجھے گھورا، چنگھاڑا جو لوگ مجھے پکڑے ہوئے تھے بھاگ گئے شیر جھپٹا اس نے میری گردن پہ پنجا مارا اور کوسا لگا زخم گہرا ہو گیا دوسرا پنجا پیٹ پہ لگا انتڑیاں باہر نکل آئیں میری آنکھیں پتھرا گئیں اس نے میرا بازو منہ میں ڈال کر گھسیٹنا شروع کر دیا اور ساتھ والے کھیت میں لے گیا جہاں اس نے ملک الموت کا روپ دھارا مجھ میں ابھی رتی بھر جان باقی تھی گو میں ہل جل نہیں سکتا تھا اور بات کرنے کی طاقت بھی نہیں تھی ملک الموت نے کہا کہ میں تمھارے دل کا حال جانتا ہوں تمھارا سوال یہ ہے کہ بھیڑ بکریاں تمھاری تھیں تو تمھیں کیوں مارا؟ میں نے دل میں خیال کیا کہ میں یہی جاننا چاہتا ہوں ملک الموت نے کہا اس کا جواب تمھیں خود ڈھونڈنا ہو گا اب بتاؤ تم کیا بننا چاہتے ہو؟ وہیں ڈیوڈ بونگا ملک الموت کے پیچھے سے نکلا اور مجھ سے کہنے لگا مجھ سا بن جاؤ میں نے دل میں خیال کیا کہ مجھے اس جیسا بنا دیں۔

سو میں اور ڈیوڈ بونگا آپ کی کہانی کے کردار بن گئے تو اب میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ بکریاں میری تھیں تو مجھے مارا کیوں؟ میں نے بڑی اکتاہٹ سے جواب دیا چودھری اکرم گلہری تمھارا سوال بھی کافی مشکل ہے میں اس بارے میں کافی غور کروں گا تب ہی کوئی جواب مل پائے گا اب میں آپ کے سامنے ایک کہانی رکھتا ہوں آپ لوگ بتائیں کہ آگے کیا ہوگا؟ ایک غار کے اندر ایک ننگا پنگا آدمی ہاتھ میں پتھر لیے اکڑوں بیٹھا ہے اور غار کے دھانے پر ناگ پھن پھیلائے بیٹھا ہے جتنے بھی روزن ہیں ان پر ناگ فوجیوں کا پہرا ہے نہ ہی ناگ اپنی جگہ سے آگے بڑھتا ہے اور نہ ہی آدمی اپنی جگہ سے ہلتا ہے ناگ مسلسل پھنکارتا ہے اور آدمی ڈر سے کانپ رہا ہے اب آگے کیا ہوگا؟ ڈیوڈ بونگا نے چودھری اکرم گلہری کی طرف دیکھا دونوں نے شانے اچکائے اور ایک دوسرے کی طرف نفی میں سر ہلایا پھر ڈیوڈ بونگا بولا ہمیں نہیں پتہ کہ آگے کیا ہوگا؟ ہم نے تو یہ کہانی پہلی بار سنی ہے مجھے اس جواب کی توقع نہیں تھی مجھے غصہ آیا لیکن میں نے خود پر قابو رکھا اور سنجیدگی اور متانت سے پھر اپنا سوال دہرایا اور ساتھ ہی وضاحت بھی کر دی کہ یہ وہ کہانی ہے جو کل رات آپ لوگ میرے خواب میں تیار کر رہے تھے اور جھگڑ رہے تھے اب تم لوگ جلدی سے بتاؤ کہ آگے کیا ہوگا؟ ان دونوں نے پھر نفی میں سر ہلایا اب میرے غصے کا پارہ اپنی آخری بلندی تک پہنچ چکا تھا میں فوراً کمرے سے باہر آیا اور اپنے ذاتی ملازم اکرم کو کہا کہ باورچی اور چوکی دار کو بھی بلا لے اور رسی کے ساتھ دونوں مہمانوں کو باندھ کر تہہ خانے میں بند کر دے۔

☆☆☆☆

دھوپ دسمبر کی ہو یا پھر گہری شام کی بارش
تیرے نام کے موسم سارے تیرے نام کی بارش
خاور، جگنو، تتلی، شبنم، پھول ہیں تیرے دم سے
تیرا ساتھ نہ ہو تو میرے پھر کس کام کی بارش

خاور بوسالوی

ہائے میری ثریا!

رافعہ ارشد

ایم۔اے اردو سال اول

گاؤں کے وسط میں ایک کشادہ صحن اس میں پیپل کا درخت۔اس کے دائیں جانب کچھ پودے کیاری میں لگے ہوئے ہیں۔ مغرب کی جانب لکڑی کا دروازہ ہے جس میں بہت سی جگہوں پر شگاف بن چکے ہیں۔صحن میں ایک طرف بھینس بندھی ہے اور کچھ فاصلے پر چارہ رکھا ہے۔مشرق کی جانب بنے برآمدے میں ایک عورت جھاڑو دے رہی ہے اور پیپل کے نیچے چارپائی پر ایک بڑھیا 65 سال عمر،سفید بال، گوری رنگت، جھریوں والا چہرہ، چہرے کی جھریوں میں زندگی کا کرب چھپا ہے۔حیران چندھیائی ہوئی آنکھوں میں ایک دھندلا سا عکس ابھرتا ہے۔وہی صحن لیکن قدرے آباد، برآمدہ کچا، بہت سی بھینس، پیپل کے ساتھ سرو، دھریک اور کیکر اور بیری کے درخت، بڑھیا کی چارپائی کی جگہ ایک چارپائی جو بُنی جا رہی ہے۔ بننے والی چودہ پندرہ سالہ لڑکی، گوری رنگت، بھورے بال، خوبصورت آنکھیں شوخ مسکراہٹ، چہرے پر اعتماد، بڑی مہارت سے چارپائی بن رہی ہے۔ پاس کھڑی سہیلی نے برجستہ ایک سوال کیا۔جس سے اس کے چلتے ہوئے ہاتھ یک لخت رک گئے۔سہیلی :اماں کہہ رہی تھی آج اکرم کی پیشی تھی کیا بنا؟

ثریا :(چہرے پر کرب اور پریشانی کے آثار نمایاں ہوئے جنہیں اب تک وہ چھپائے ہوئے تھی) جج نے اگلی تاریخ ڈال دی ہے۔اللہ خیر کرے اور اکرم بس خیریت سے گھر آجائے۔سہیلی :مقدمہ بھی تو کوئی چھوٹا موٹا نہیں ہے،قتل کا مقدمہ ہے اور اقبال جرم بھی کرلیا اس نے تو۔ثریا :اللہ ہے نا!سب بہتر ہوگا اور وہ سلامت واپس آئے گا میرا دل کہتا ہے۔اسی دوران ایک عورت لکڑی کے دروازے سے گھر میں داخل ہوتی ہے(جو ثریا کی ماں ہے) سفید رنگت، بھرا ہوا جسم، قدرے متفکر۔ثریا :اماں تو آ گئی۔سب خیر ہے ناماسی ملاقات کر کے آئی ہے نا اکرم سے۔ماں:ہاں جج نے اگلی تاریخ ڈال دی ہے پتا نہیں یہ کمبخت مصیبت کب ختم ہوگی مجھ سے تو وہ گھر نہیں دیکھا جاتا سائیں سائیں کرتا ہے۔ہائے میری بہن!ایک بیٹا ان موئے دشمنوں نے مار دیا اور دوسرا جیل میں ہے۔اس گھر کو تو جیسے نظر کھا گئی۔ہاتھ ملتے ہوئے بین کرتی ہے۔ثریا :(بے چینی سے) اماں!اکرم کا بتا وہ کیسا ہے۔ماسی گئی تھی نا ملاقات کرنے۔

ماں :ہاں گئی تھی وہ تو ایسے ہے جیسے جیل میں نہیں ولایت میں ہو تیری ماسی بتا رہی تھی۔جیل میں مونڈھا بچھا کے بیٹھا تھا۔صحت ایسی ہے کہ پہلوان معلوم ہوتا ہے۔اس پر تو جیل کی ہوا کا کوئی اثر نہیں(متفکر ہو کر) چھ سال ہونے کو آئے خدا جانے کب میری بہن کی مشکل آسان ہوگی اور اکرم گھر لوٹے گا ایک بیٹا تو پہلے ہی گنوا چکے اب دوسرا بدلہ لے کر جیل چلا گیا۔

ثریا :اماں ماسی ہے بھی تو بہت پرہیزگار اللہ اس کی سن لے گا کیسے فقیر ہوگئی ہے وہ اب تو پہچانی بھی نہیں جاتی۔آفرین ہے اماں اسکی ہمت پر کیسے مقابلہ کیا اس نے حالات کا۔چند دن بعد دوپہر کا وقت ثریا کی اماں اسے کوٹھڑی میں بلاتی ہے۔ثریا :ہاں اماں کیا بات ہے۔ ماں : آج تیرے ابا کے ساتھ کچھ لوگ آ رہے ہیں۔تیرے رشتے کے لیے۔ثریا :(پھٹی پھٹی نگاہوں سے ماں کو دیکھتی ہے) اور پھر ضدی لہجے میں۔ماں تجھے میں کتنی بار تو کہہ چکی ہوں کہ میں شادی کروں گی تو صرف اکرم سے ابا کو بھی بتا دے یہ بات۔ماں :(جل کر) کل کو اس کو پھانسی ہوگئی تو کیا کرے گی۔ثریا :میں انتظار کرونگی مجھے اس کے سوا کسی سے شادی نہیں کرنی(ماں کے پاؤں میں بیٹھ کر) دیکھ اماں وہ تیرا بھی

تو بھانجا ہے اور ابا کا بھتیجا۔ میں اپنے چاچا کے گھر ہی تو جاؤں گی اور مجھے یقین ہے کہ وہ ضرور لوٹے گا۔ ماں خاموشی سے اس کا چہرہ دیکھتی رہتی ہے۔ دل ہی دل میں سوچتی ہے۔ میں بھی تو تیری اسی ضد سے ڈرتی ہوں ثریا اور وہ بھی تو ضدی ہی ہے کیسے نبھے گی۔ ایک دن اکرم کا باپ دبلا، لمبا آدمی، تہہ بند کرتا پہنے سر پر پگڑی چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ، وہ مسکراہٹ جس سے اس کی بیوی کو سخت چڑ تھی۔ ایک بیٹا گنوانے کے بعد اور دوسرا جیل بھیج کر بھی اس آدمی کے چہرے کی مسکراہٹ، وہیں کی وہیں تھی جسے دیکھ کر اسکی بیوی رو رو دیتی تھی اور بات بات پر لڑ پڑتی تھی۔ آتے ہی بلند آواز سے پکارا۔۔۔ کوئی ہے!! ثریا بھاگتی ہوئی کوٹھڑی میں سے نکلی اور سلام چاچا کہہ کر اماں کو بلانے دوڑی۔ رات کو جو بات ہوئی وہ ثریا نے کسی طرح سن لی۔ جس کے انتظار میں وہ بیٹھی تھی وہ بھی جیل میں کہہ رہا تھا اگر مجھے ثریا نہ ملی تو میں جیل کی دیواروں سے سر ٹکرا کر مرجاؤں گا۔ یہ ایک قسم کی دھمکی تھی جس کے کارآمد ثابت ہونے کے واضح امکانات موجود تھے۔ چنانچہ دونوں کی نسبت طے کر دی گئی۔ چھے ماہ بعد خوشی کی ایک لہر آئی جس نے سب کے چہروں کا احاطہ کیا۔ ہر طرف مسرت تھی۔ مٹھائیاں بانٹی گئیں لوگ مبارکباد کے لیے آنے لگے۔ اکرم رہا ہو کر گھر آ گیا تھا۔ جیل سے آنے اور قتل کے مقدمے کی وجہ سے اکرم سے بات کرنے کی ہمت کسی کی نہ ہوتی تھی۔ بڑی بڑی مونچھوں نے اسکے بارعب چہرے پر ایسا تاثر پیدا کر دیا تھا کہ کوئی بھی اس سے کھل کے بات نہیں کرسکتا تھا ایک عجیب سی ہیبت تھی۔

اسی دوران اکرم اور ثریا کی باقاعدہ نسبت طے کر دی گئی۔ دونوں کی شادی ہوگئی ہر طرف خوشی ہی خوشی تھی سب خوش تھے سوائے اکرم کی ماں کے اپنے مرے ہوئے بیٹے کی یاد میں روئے دیتی تھی۔ ثریا رخصت ہو کر اکرم کے گھر چلی گئی وہ کافی تنک مزاج اور ضدی لڑکی تھی اسی ضد کی وجہ سے وہ آج اکرم کی دلہن تھی۔ ثریا کی ساس بھی زمانے کی مشکلیں برداشت کرنے کے بعد کافی سخت مزاج ہو چکی تھی اس کی طبعیت بھی رعب دار تھی آج تک اس کے گھر میں اس کی اجازت کے بغیر کچھ نہیں ہوا تھا چنانچہ وہ اپنی بہو کو بھی اپنے رنگ میں ڈھالنا چاہتی تھی۔ دونوں میں کئی بار ٹھنی، خوب جھگڑا ہوا جس پر اکرم ہمیشہ ثریا کو ڈانٹتا کیونکہ وہ اپنی ماں کی حد سے زیادہ عزت کرتا تھا وہ چھ سال اس کے لئے جیلوں میں دھکے کھاتی رہی کتنی مشکلیں اور تکلیفیں برداشت کر چکی تھی وہ اپنے بیٹے کے لیے۔ اکرم کی ذات کا دبدبہ ایسا تھا کہ ثریا جیسی ضدی بیوی بھی ایک بار ڈر جایا کرتی تھی۔ سال گزرتے گئے انکا پہلا بچہ پیدا ہوتے ہی مر گیا اسی طرح دوسرا اور پھر تیسرا۔ سب نے بہت منتیں اور دعائیں مانگیں خاص طور پر اکرم کی ماں نے۔ شاید کسی وقت کی دعا قبول ہوگئی اور اللہ نے انہیں چاند سا بیٹا دیا پھر دو بیٹیاں ہوئیں۔ اسی طرح دن گزرتے گئے۔ چھوٹی بیٹی ابھی سال بھر کی تھی کہ ثریا نے اکرم کے اطوار بدلتے ہوئے محسوس کئے۔ اسے محسوس ہونے لگا کہ کہیں نہ کہیں اس کے ساتھ خیانت کی جا رہی ہے ہمت تو اس میں شروع سے ہی تھی لاکھ اکرم کا دبدبہ سہی لیکن وہ کب باز آتی تھی اس سے پوچھ بیٹھی۔ اکرم: تمہارا دماغ چل گیا ہے یہ کیسی باتیں کر رہی ہو ایسا کچھ نہیں ہے وہم ہے تمہارا بس۔ اس وقت تو وہ خاموش ہوگئی لیکن کھوج میں لگی رہی بالآخر اسے پتا چل گیا۔ ہوا وہی جس کا اسے ڈر تھا اس کا شک یقین میں بدل گیا۔ اس نے خوب ہنگامہ برپا کیا شور مچایا۔

اکرم بھی غصے میں آ گیا خوب لڑائی ہوئی بالآخر ساس نے ثریا کو سمجھایا۔ ساس: لڑکی باولی نہ ہو جایا کر شوہر تو تیرا ہی ہے نا۔ پھر وہ مرد ہے ایسی بھی کیا قیامت آ گئی بیوی تو تم ہی ہو اس کی۔

ہاتھی پھرے گراں گراں
جس دا ہاتھی اس داناں

لیکن اس کے اندر رقابت اور غصے کی آگ اسے جلا رہی تھی وہ کہاں برداشت کر سکتی تھی یہ سب اس نے بھی فیصلہ کرلیا کہ چپ نہیں بیٹھے گی اس نے اکرم سے بدلہ لینے کی پوری ترکیب سوچ لی تھی۔ جسے سوچتے ہوئے اسے تھوڑا ڈر لگا لیکن پھر سنبھل گئی۔ ایک دن جب وہ حسب معمول کوڑا پھینکنے جا رہی تھی۔ راستے میں اسے وہی شخص ملا جسے وہ کتنے عرصے سے نظر انداز کر رہی تھی اور کئی بار تو اسے بہت سنائیں اور بھگا دیا۔ لیکن اب کی بار اس نے نہ تو غصہ کیا اور نہ ہی گالیاں دیں بلکہ مسکرائی اور گزر گئی۔ گھر آ کر اس نے فیصلہ کرلیا ''جیسے کو تیسا'' وہ ایسا ہی ہے تو پھر میں بھی ویسی ہی ہوں مرد ہی کیوں سب کچھ کر سکتا ہے۔ کچھ دنوں بعد ہی سارے گاؤں میں سرگوشیاں ہونے لگیں اور ایک سرگوشی اس کی ساس کی کانوں تک پہنچ گئی۔ ساس پانچ وقت کی نمازن پرہیزگار عورت سن کر آگ بگولہ ہوگئی۔ بہو کو خوب سنائیں۔ ثریا تو تیار بیٹھی تھی یہی تو وہ چاہتی تھی ساس نے ایک جملہ کہا اس نے تین سنائیں

ثریا: ہاں کھڑی تھی میں اس کے پاس کیا بگاڑ سکتے ہو میرا بگاڑ لو۔ تیرے بیٹے نے کیا کیا گل نہیں کھلائے میری دفعہ ہی تو آگ لگ گئی۔

ساس: تیری اتنی ہمت کہ تو میرے آگے زبان چلائے آنے دے میرے بیٹے کو تیری ساری اکڑ نکلواتی ہوں اکرم آیا تو خوب گرما گرمی ہوئی جب ثریا سے پوچھا وہ ہٹ دھرمی سے بولی ''ہاں کیا ہے جو کرنا ہے کرلو'' اس جملے نے اکرم کے تن بدن میں آگ ہی لگا دی۔ ماں اسکو غصے میں دیکھ کر ڈر گئی اور اسے لے کر کوٹھڑی میں چلی گئی کچھ دیر بعد کوٹھڑی کا دروازہ کھلا اور اکرم باہر نکل گیا۔

ثریا ساری رات روئی۔ دوسرے دن دوپہر کے وقت ثریا روٹیاں بنا رہی تھی اسکی ساس گھر پر نہیں تھی۔ دھڑام سے دروازہ کھلنے کی آواز آئی وہ ٹھٹک گئی اکرم اس کے سر پر آپہنچا۔

اکرم: کہہ دو کہ جو کچھ کل تم نے کہا وہ جھوٹ تھا۔

ثریا: کیوں کہوں کہ جھوٹ تھا

اکرم: (بغل سے پستول نکال کر) کہہ دو کہ جھوٹ تھا۔

ثریا: غم اور غصے سے گنگ تھی کچھ نہ بول سکی۔

بس دو آنسو آنکھوں سے نکل کر گالوں پر آ گئے۔

اکرم: سچ سچ بتاؤ کہ وہ سب جھوٹ تھا۔

ثریا: بے بسی اور غصے کی انتہا میں ''سچ تھا''

ایک لمحے کی خاموشی اور ایک دھماکے کی آواز! کووں نے فائر کی آواز پر کائیں کائیں کا شور مچانا شروع کر دیا۔ بچے جو کوٹھڑی میں کھیل رہے تھے بھاگتے ہوئے باہر نکلے اور پھر دہل کر رو دیے۔ اکرم نے پستول والا ہاتھ ہوا میں بلند کیا ہوا تھا اور پاس ثریا کا مردہ جسم پڑا تھا۔ جس کے سر سے خون بہہ رہا تھا۔ بچے ماں کو دیکھ کر چیخیں مار کر رونے لگے اور اکرم بجلی کی سی تیزی سے دروازہ کھول کر گھر سے باہر نکل گیا۔ کسی آہٹ پر سوچ کا یہ سلسلہ ٹوٹا تو بوڑھی عورت کے چہرے پر کرب اور آنسوؤں کی نمی تھی۔ کتنی دفعہ اس نے اس کہانی میں اپنی بیٹی کا قصور تلاش کرنے کی کوشش کی لیکن ہر دفعہ ہر طرف سوال ہی سوال ابھر آئے جن کا جواب کسی کے پاس نہیں تھا۔

ایک تیز ہوا کا جھونکا آیا اور درخت میں سرسراہٹ پیدا ہوئی پتے گرنے لگے اور بڑھیا نے آہ بھری۔ ''ہائے میری ثریا''!

اپنا خیال رکھنا...

رامین ملک

ایم اے انگلش سال اول

سونیا باورچی خانے میں کھڑی ناشتہ بنا رہی تھی یہ ایک چھوٹا سا گھر تھا دو کمروں، باورچی خانے اور تنگ کھڑکیوں والا ایک گھٹن زدہ گھر۔

چائے اپنے رنگ پر آنے کو تھی جب نجمہ خالہ وہاں آئیں چہرے پر اب بھی ناراضی اور آنکھوں میں غُصہ تھا۔

سونیا نے اُنکی آہٹ محسوس کر لی تھی اور اُنکا غُصہ بھی۔۔

" کیا بات ہے خالہ آپ اب تک ناراض ہیں" سونیا نے نارمل انداز میں بنا اُنکی طرف پلٹے سوال کیا۔

" تو کیا نہیں ہونا چاہیئے۔۔۔؟ اچھی بھلی سمجھدار ہو کر بھی ایسی حماقت؟" نجمہ خالہ کے لہجے میں رات والی تلخی تھی۔

"مُجھے نہیں پتا تھا کہ کسی کی جان بچانا حماقت کہلاتا ہے اور کسی بے آسرا کو پناہ دینا گناہ ہے" اب سونیا بھی سنجیدہ تھی۔۔۔تم نہیں جانتی سونیا جو لوگ گناہوں کی غلیظ دنیا میں رہنے کے عادی ہو جاتے ہیں گناہ ان کی فطرتِ ثانیہ بن جاتا ہے۔۔۔وہ موقع ملتے ہی اپنی فطرت کا رنگ دکھا دیتے ہیں۔۔۔میں صرف یہ چاہتی ہوں کہ تم اس لڑکی کو اپنے گھر سے چلتا کرو۔۔۔خالہ یہ بے سہارا لڑکی مجبوراً اس دلدل میں اتری۔۔۔کوئی بے وفا اسے اپنا مطلب نکال کر گناہوں کی سرزمین میں بے یار و مددگار چھوڑ گیا۔۔۔واپسی کے تمام راستے اس کے لیے بند ہو چکے تھے۔۔زندہ رہنے کے لیے اس نے گناہ کی زندگی کو قبول کیا۔۔۔میں جانتی ہوں وہ اس زندگی سے خوش نہیں۔۔۔وہ واپس آنا چاہتی ہے اسی دنیا میں جہاں پیسوں کے بدلے، عورت کی حرمت پائمال نہیں ہوتی۔۔۔جہاں عورت ماں ، بہن ، بیٹی اور بیوی کے سوا کسی مکروہ پہچان کا حوالہ نہیں۔۔۔

خالہ وہ بالا خانے کی زینت نہیں بننا چاہتی وہ خاندانی لڑکی ہے ایک لمحے کی غفلت کی اتنی بڑی سزا نہیں ہونی چاہیے۔۔ہمیں اس کی مدد کرنی چاہیے۔۔۔ٹھیک ہے لیکن یاد رکھنا سیانے کہتے ہیں کہ گناہ کی عادت پڑ جائے تو گنہگار کے سینے میں دل نہیں رہتا۔۔۔وہ بچھو بن جاتا ہے اور اپنے محسن کو بھی موقع ملنے پر ڈس لیتا ہے خالہ پھر سے وہی باتیں دہرانے لگیں جو کل رات کو کہہ رہی تھی جب سونیا ادا جان کو روڈ ایکسیڈنٹ کے بعد اپنے گھر لائی تھی۔

" دیکھ سونیا اگر تیرے منگیتر جمال کو ادا جان کی حقیقت کا پتا چلے گا تو وہ کیا سوچے گا، خاندان اور محلے والے بھی طرح طرح کی باتیں بنائیں گے۔

" خالہ جب ادا کا روڈ ایکسیڈنٹ ہوا اور اسے ہم اٹھا کر گھر لائے تھے، اس وقت جمال میرے ساتھ تھا اُسے سب معلوم ہے "

" کیا۔۔۔؟ پھر تو تُم دونوں پاگل ہو گئے ہو۔۔۔۔۔ میرا کام تھا سمجھانا سو سمجھا دیا۔۔۔ پر جان لے کہ جو کر رہی ہے نا وہ ٹھیک نہیں ہے۔" خالہ اتنا کہتی ہوئی وہاں سے چلی گئیں۔سونیا نے ناشتہ بنایا اور کمرے کی طرف بڑھی وہ ایک اسکول میں پڑھاتی تھی پر آج وہ کام پر نہیں گئی اور سارا دن ادا جان کا خیال رکھا شام کو جمال اور سونیا اُسے ڈاکٹر کے پاس لے گئے ڈاکٹر کا کہنا تھا کہ ادا جان کو ذہنی صدمہ پہنچا ہے

ٹانگ ٹوٹی تو نہیں ہے پروہ کچھ دن چل پھر نہیں سکتی اُسے دوا کے ساتھ توجہ اور پیار کی بھی ضرورت ہے۔

"جمال آپکو اداجان کا میرے گھر رہنا بُرا تو نہیں لگتا؟" سونیا نے پوچھا۔

"مجھے بُرا کیوں لگے گا میں جانتا ہوں ہم بہت اچھا کام کر رہے ہیں خدا نے ہمیں اس نیک کام کا ذریعہ بنایا ہے ہمیں تو مطمئن ہونا چاہیے"

جمال نے تسلی دینے والے انداز میں کہا اور سونیا مطمئن ہو گئی۔

رات کا وقت تھا سونیا کمرے میں داخل ہوئی تو دیکھا اداجان پھر سے کمرے میں اندھیرا کیے بیٹھی تھی۔

"یہ کیا۔۔۔؟تُم پھر اندھیرا کیے بیٹھی ہو ارے اندھیرے سے میرا دم گھُٹتا ہے ادا" سونیا نے کہا اور لائٹس آن کر دیں۔

"اندھیروں میں رہنے والے پہلے پہل روشنی کے لیے تڑپتے ہیں سونیا, پھر سوچنے لگتے ہیں کہ شاید روشنی اُنکا نصیب نہیں ہے اور ایک دن اُنکو روشنی سے نفرت ہو جاتی ہے" اداجان نے کہیں کھو کر کہا تھا بہت درد تھا اُسکی آواز میں۔

" کیا مطلب۔۔۔۔؟" سونیا آکر اُسکے روبرو بیٹھی۔

"مطلب تُم مُجھے یہاں اپنے گھر لے آئی ہو پر اب میں کیا کروں گی مجھے کون قبول کرے گا میں ایک گنہگار دنیا میں رہنے والی، اس بھلی دنیا میں کیا کرے گی۔؟"

"ایسی باتیں نہ کیا کرو ابھی صرف اپنی صحت پر توجہ دو میں اور جمال ہیں نا تمھارے ساتھ سب ٹھیک ہو جائے گا تم واپس اس دنیا میں آؤ گی" سونیا نے تسلی دی۔

"جمال۔۔۔۔وہ اچھا انسان ہے تمھارے قابل ہے تُم دونوں بہت اچھے ہو شادی کب کر رہی ہو اُس سے۔۔۔؟" یہ سوال کرتے ہوئے ادا قدرے پریشان لگی۔۔۔

" جمال کا اس دنیا میں کوئی نہیں ہے اور مجھے بھی بس خالہ کا ہی سہارا ہے پر اب ہم دونوں نے مل کر ایک چھوٹا سا آشیانہ بنا لیا ہے بس جیسے ہی جمال کہیں سیٹ ہو جائے گا ہم نکاح کر لیں گے اور ایک نئی زندگی شروع کریں گے

پھر مجھے یہ جاب کرنے کی ضرورت بھی نہیں رہے گی۔ جمال نے کہہ رکھا ہے کہ تُم آرام کرنا اور میں کام کروں گا۔"

"خوش قسمت ہو تُم سونیا بہت خوش قسمت۔۔۔۔۔خُدا تمہیں ہمیشہ خوش رکھے"

" آمین۔۔۔میں چائے بنا کر لاتی ہوں" سونیا نے مسکرا کر کہا اور وہاں سے چلی گئی۔ اداجان نے خود کو سامنے لگے آئینے میں دیکھا 30 سال کی عمر ہونے کے باوجود اب بھی بہت دلکش تھی۔ ایک پل کو اداجان نے محسوس کیا کہ جیسے اُسکا عکس اسے کہہ رہا ہو کہ موقع بھی ہے اور دستور بھی۔۔۔کر گزرو دیکھا جائے گا۔۔۔

دوپہر کا وقت تھا جب سونیا نے جمال کو کال کی۔

"ہاں بولو سونیا سب خیریت۔۔۔؟"

"جی وہ آج اسکول میں میٹرک کے پیپر ہو رہے ہیں میری ڈیوٹی ہے میں شام سے پہلے فارغ ہونے والی نہیں خالہ بھی گھر نہیں۔ آپ فارغ ہیں تو گھر جا کر ادا کو کھانا کھلا کر دوا دے دیں وہ پریشان ہو رہی ہوگی" سونیا نے بتایا

"اچھا ٹھیک ہے تم فکر نہیں کرو میں جا رہا ہوں" اور اس کا پورا خیال رکھوں گا۔۔۔۔

سونیا شام میں گھر آئی ادا سو رہی تھی جمال نے بتا دیا تھا کہ اس نے ادا جان کو کھانا کھلا دیا تھا اور دوائی بھی دے دی تھی۔ سونیا مطمئن ہو گئی اور جا کر دوسرے کمرے میں سو گئی۔

دو دن گزرے سونیا صبح جاگی اور ناشتہ بنانے لگی جب سے ادا جان یہاں مکین تھی خالہ اپنی کسی جاننے والی کے گھر رہنے لگی تھی آج بھی وہ گھر نہیں تھی۔

سونیا ناشتہ لے کر کمرے میں آئی تو ادا جان وہاں نہیں تھی۔

"ادا۔۔۔۔ کہاں ہو تم۔۔۔؟" سونیا نے پہلے آواز دی اور پھر سارے گھر میں اُسے تلاش کرنے لگی۔

پر ادا جان وہاں نہیں تھی سونیا پریشان ہو گئی جمال کو کال کرنے لگی پر اُس کا نمبر آف تھا سونیا نے پھر سے کال ملائی کہ اُسکی نظر آئینے پر لگے ایک کاغذ پر پڑی۔

وہ آگے بڑھی اور پڑھنے لگی۔

تم روشنی تھی سونیا اور میں اندھیرا۔۔۔ میں اس قابل ہی نہیں تھی کہ تم مجھے اتنی اہمیت دیتی۔ اتنے دن میرا خیال رکھنے کا بہت شکریہ مگر میں مزید یہاں نہیں رہ سکتی۔۔۔ میں اپنی وجہ سے تمہں مشکل میں نہیں ڈال سکتی۔ تمہارے اپنے نہیں چھین سکتی۔۔۔ سونیا میں جانتی ہوں خالہ میرے یہاں رہنے پر خوش نہیں ہیں اور جمال۔۔۔۔۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ اور سوچے۔۔۔ میں یہاں سے جا رہی ہوں۔۔

۔۔۔ میں تم سے تمہاری خوشی نہیں چھین سکتی۔ میں نے تم سے حقیقی روشنی کشید کی ہے میں اندھیروں سے نکل آئی ہوں سونیا۔۔۔ خالہ کو واپس بلا لو اور انہیں کہنا کہ ایک طوائف ایک عورت ہوتی ہے اور عورت کی فطرت میں طوائف ہونا نہیں ہوتا۔ اسکے گرد و پیش کے لوگ اسے مجبور کرتے ہیں کہ وہ، وہ کچھ کرے جو وہ چاہتے ہیں۔۔ میں اندھیروں کی باسی تھی سونیا! تم نے مجھے روشنی دی۔ اور میں نے تمھیں تمھارا جمال۔۔۔ اپنا خیال رکھنا"۔۔۔۔

☆☆☆☆

اُلجھی لڑکی کا سلجھا خواب...

سیدہ عائشہ حبیب

(ایم ایس سی نفسیات)

آج ہوا میں نمی ہے اور ہوا بھی تیز ہے ۔لگتا ہے بارش ہونے والی ہے عائشہ نے تیزی سے چلتے ہوئے اپنے ساتھ چلتی ہوئی نائلہ ،مشعال اور یمنیٰ سے کہا: ہاں لگتا تو یہی ہے تم صبح چھٹی کر لینا پلیز۔ وہ چاروں باتیں کرتی ہوئیں تیزی سے ایم۔اے بلاک سے نکلیں اور کینٹین پہنچ گئیں۔

کینٹین پر چائے پیتے ہوئے عائشہ نے اچانک اپنی کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی کو دیکھا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ نائلہ اور مشعال حسب عادت اسے چھوڑنے دروازے تک گئیں۔ دروازے پر خدا حافظ کہتے ہوئے اس نے پھر سے اپنی گھڑی جس پر بار بار ٹائم دیکھنا اس کی عادت بن چکی تھی، پھر سے دیکھا۔ وہ کالج سے اپنے گھر کی طرف روانہ ہوئی۔

آج اس کا دل اداس تھا شاید موسم کا اثر تھا طبیعت کچھ بوجھل سی تھی۔ وہ نظریں جھکائے اپنے ہی خیالوں میں گم سٹاپ سے کچے راستے پر چلنے لگی۔آج اسے اپنے آبائی گھر جانا تھا۔راستہ تقریباً سنسان تھا بس اکا دکا لوگ ہی نظر آرہے تھے وہ آہستہ آہستہ چل رہی تھی۔اچانک اس کی نظر ایک بوڑھے قد آور درخت پر پڑی۔جس کی ٹہنیاں پتوں کے بوجھ سے تقریباً آزاد ہو چکی تھیں۔ نہ جانے کیوں وہ رک گئی وہ درخت کچے راستے سے ذرا ہٹ کر تھا وہ کسی مقناطیسی طاقت کے زیر اثر اسے کی طرف بڑھتی چلی گئی۔ اسے حیرت اور دکھ کے ملے جلے احساس نے گھیر لیا۔ یہ درخت کچھ دن پہلے ہی تو ہرا بھرا تھا وہ اس کی چشم دید گواہ تھی یا شاید اس نے پہلی بار اتنے غور سے اسے دیکھا تھا۔ وہ اکثر گزرتے ہوئے لاشعوری طور پہ اسے دور سے بہت چھوٹا اور قریب آنے پر بڑا ہوتا دیکھا کرتی تھی۔

وہ دیوقامت درخت اسے اچانک بوڑھا بہت بوڑھا محسوس ہوا۔اس کی چھال میں اسے بڑھاپے کی جھریاں نمایاں نظر آنے لگیں۔ درخت کے نیچے پڑے مڑے تڑے پتے جن پر چل کر وہ درخت کے تنے تک آئی تھی اس کے پروں تلے شور مچانے لگے جیسے نوحہ کر رہے ہوں اور بتا رہے ہوں کہ کس طرح ظالم موسم اور ہوا نے انہیں ٹہنیوں سے توڑ کر زمین بوس کر دیا اس نے پھر سے اوپر اس درخت کی ٹہنیوں کی جانب دیکھا جن کا جھکاؤ نیچے کو تھا جیسے شرمندہ ہوں کہ وہ ان پتوں کے لئے کچھ نہیں کر سکیں جنہوں نے کبھی اس درخت کی خوبصورتی بڑھائی تھی۔

شاید جتنی تکلیف ان پتوں کو ٹہنیوں سے جدا ہو کر ہوئی اتنی ہی تکلیف ٹہنیوں کو بھی ہوئی ہوگی۔مگر ٹہنیاں اس کے سر سے اونچی تھیں، بہت اونچی......اس کی رسائی سے بہت دور۔اس لیے اس نے ان کے بارے میں سوچنا موقوف کیا اور اس قد آور درخت کے سامنے گھٹنوں کے بل بیٹھ گئی۔اس نے چند پتوں کو زمین سے اٹھایا اور اپنی ہتھیلی میں لے کر بیچارگی سے دیکھنے لگی۔ وہ اس وقت خود کو اس منظر میں ایسے ہی محسوس کر رہی تھی جیسے زمانہ قدیم میں دیوتاؤں کے سامنے عقیدت سے بیٹھے ہوئے پجاری۔ جو شاید عقیدت سے تو نہیں مگر ڈر کے مارے ضرور ان دیوتاؤں کی پوجا کیا کرتے تھے۔ وہ پتے ابھی بھی اس کی ہتھیلی میں کسی دعا کی مانند رکھے تھے۔ جسے وہ دیوتا سے مانگنے اس کے سامنے موجود تھی۔ پھر اچانک اس نے وہ پتے دوبارہ زمین پر رکھ دیے اور اس دیوقامت درخت کے تنے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ اپنے بیگ کو ایک

سائیڈ پر رکھا اور ارد گرد دیکھنے لگی۔ ارد گرد بہت سے ہرے بھرے درخت، پودے اور جڑی بوٹیاں موجود تھے مگر چند ہی درخت خالی ٹہنیاں لیے ہوئے تھے۔

ہوا کی تیزی بڑھ رہی تھی اور اس کے ساتھ ہی دیگر درختوں کے پتوں کی تالیوں میں اضافہ کر رہی تھی۔ ہوا کے ساتھ ساتھ شور بھی بڑھ رہا تھا۔ اسے یہ شور ذرا نہ بھایا۔ اسے لگا کہ ہرے بھرے درخت اس خالی درخت کا مذاق اڑا رہے ہیں۔ اس نے اچانک چہرہ آسمان کی طرف اٹھایا اور غور سے ان ٹہنیوں کو دیکھنے لگی اسے ٹہنیوں کے سروں پہ کچھ محسوس ہوا وہ اچانک اٹھی اور پھر سے غور سے دیکھنے لگی ارے! یہ تو نئے پتے تھے اور تقریباً ہر ٹہنی پر موجود تھے۔ اسے خوشی اور حیرت کے ملے جلے احساس نے گھیر لیا۔ اچانک اداسی غائب ہوگئی۔ اور وہ بوڑھا درخت اسے پھر سے جوان ہوتا ہوا محسوس ہوا اسے لگا کہ اس درخت کی جھکی ہوئی ٹہنیاں شرمندگی سے نہیں بلکہ شکرانے سے جھکی ہوئی ہیں۔ شاید وہ درخت اب ہواؤں اور موسموں کا مزاج سمجھ گیا تھا اس لیے پرانے پتوں سے آزاد ہونے کے بعد اب ان کے غم سے بھی آزاد ہو چکا تھا وہ پرانے پتوں کو آہستگی سے ہواؤں کے حوالے کر کے نئے پتوں سے منظر کو ہرا بھرا کرنے والا تھا۔ وہ درخت اور قدرت اسکا بھرپور ساتھ دے رہے تھے ہلکی ہلکی بارش ہونے لگی مگر وہ ابھی بھی اس درخت کے نیچے کھڑی تھی وہ سچ میں اس درخت کو ہرا بھرا دیکھنا چاہتی تھی اس درخت کی خالی ٹہنیاں اسے واقعی ہی اداس کر گئی تھیں جیسے کسی لڑکی کی کچی عمر کے کچے خواب ٹوٹ جانے پر وہ اداس ہو جاتی ہے اور پھر دوبارہ خواب دیکھنے سے گھبراتی ہے۔ مگر یہ عمر تو ہوتی ہی خواب دیکھنے، تتلیوں کے پیچھے بھاگنے، جگنوؤں کو مٹھی میں قید کرنے، ریت کے گھروندے بنانے کی ہے اور یہی عمر پھر سے اسے خواب دیکھنے پر اکساتی ہے اور وہ پھر سے ست رنگی خوابوں کو اپنی آنکھوں میں بسائے ہواؤں کے سنگ خواب نگر کی دہلیز پر قدم رکھنے کو تیار کھڑی ہوتی ہے۔

اب ٹہنیوں پر نئے پتوں کو دیکھ کر اسے یقین ہونے لگا کہ اب خواب نہیں ٹوٹیں گے کہ اب ٹوٹ بھی گئے تو کوئی بات نہیں، آنکھیں تو ٹہنیوں کی طرح سلامت ہیں نا۔ نئے پتوں کی طرح نئے خواب پھر سے بُنے جا سکتے ہیں۔ اس نے عزم کیا کہ اب کے خوابوں کے ٹوٹنے کے ڈر سے، خواب دیکھنا تو نہیں چھوڑے گی۔ خواب دیکھنا ہر ایک کا حق ہے اور اب وہ کسی ڈر کے زیر اثر اس حق سے کسی طور دست بردار نہ ہوگی۔ خواب آنکھوں کو روشنی دیتے ہیں۔ خواب دیکھنے والوں کی آنکھوں میں ایک دلکش چمک ہوتی ہے جو انہیں سب میں نمایاں کرتی ہے۔ خواب زندگی کے خوبصورت پہلوؤں کی پہچان ہوتے ہیں۔ خواب امید ہوتے ہیں۔ جو خواب دیکھنے والوں کو ہمیشہ زندگی کا احساس دیتے رہتے ہیں خواب رنگ ہوتے ہیں جو خواب دیکھنے والوں کی زندگی کو خوبصورت بنا دیتے ہیں یہ سوچتے ہوئے وہ کسی خوبصورت احساس کے زیر اثر پھر سے لاشعوری طور پر اپنی گھڑی کو دیکھنے لگی۔ اور چل دی اب کہ اس کے ہونٹوں پر ایک پرسکون سی مسکراہٹ تھی۔

وہ ہلکی ہلکی بارش میں ذرا تیز چلنے لگی اب اسے گھر جانے کی جلدی تھی کیونکہ گھر جا کر اسے ست رنگی، خوبصورت خواب بھی تو دیکھنے تھے کہ جن کے پورا ہونے پر اس کا یقین کچھ اور پختہ ہو گیا تھا۔ اور ہاں بھیگ کر بیمار نہیں ہونا تھا اور نہ ہی چھٹی کرنا تھی ورنہ وہ جانتی تھی کہ نائلہ، مشعال اور یمنیٰ اسے خواب نگر میں قدم رکھنے سے پہلے ہی مار ڈالیں گی۔

☆☆☆☆

''غیرت مند''

سدرہ شہزادی

ایم،اے اردو سال اول

برآمدے میں رکھے تخت پر اوندھے منہ لیٹی وہ باہر آم کے پیڑ پہ چہکتی چڑیوں کی چوں چوں میں اس قدر مگن تھی کہ اماں کی آواز سنائی ہی نہ دی۔ اماں نے ہولے سے اس کا پاؤں ہلایا تو چونک کر سیدھی ہوئی اور بوکھلاہٹ میں ہاتھ اماں کے ہاتھ میں پکڑی چائے کو جا لگا کپ الٹا اور گرم گرم چائے اس کے پاؤں پہ آ گری۔ اگلے ہی لمحے پارس عرف پری کی چیخ میں کپ ٹوٹنے کی آواز دب گئی۔ اپنے کمرے میں لیٹا احمد بغیر جوتا پہنے دوڑ کر باہر آیا پری کو پاؤں پکڑے روتا دیکھ کر اس کی گویا جان نکل گئی تھی وہ تڑپ کر پری کے پاس بیٹھا پاؤں کو دیکھا سرخ آبلے دیکھ کر اس کے دل میں جلن ہوئی اماں ڈبڈبائی آنکھوں سے پری کو دیکھ رہی تھی۔ اماں کو رنجیدہ دیکھ کر احمد نے گہرا سانس لیا اور نرمی سے ان کا ہاتھ تھام کر بولا ٹھیک ہو جائے گی میں ڈاکٹر کو بلا کر لاتا ہوں اور فوراً اٹھ کر باہر نکل گیا۔ شام کو حمید گھر آیا تو پری کی سوجی ہوئی آنکھیں اور پاؤں پر بنے آبلے دیکھ کر زہرا بیگم پر برس پڑا بچی کا پاؤں جلا دیا کیا ضرورت تھی اتنی گرم چائے لے کر اس کے سر پر سوار ہونے کی۔ پری نے بے بس کھڑی ماں کو دیکھا تو حمید کا ہاتھ پکڑ کر بولی ابا میری غلطی تھی اماں کو کیوں ڈانٹ رہے ہیں۔ پاس کھڑے احمد نے اس کے سر پہ ہاتھ رکھا اور کہا آئندہ گھر میں چائے نہیں بنے گی۔ پری کے پاس بیٹھے عمیر اور علی نے بھی اثبات میں سر ہلایا۔ حمید نے پری کے سر پہ بوسہ دیتے ہوئے کہا سن لیا زہرا بیگم چائے سے میری بچی کا پیارا سا پاؤں جلا دیا ہے اب ہمارے گھر سب کا بائیکاٹ ہے چائے کے ساتھ۔ زہرا نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا بالکل ٹھیک ہے اب نہیں بنے گی۔ تین بیٹوں کے بعد منتوں مرادوں سے زہرا کی گود میں جب بیٹی آئی تو حمید نے بیٹوں کی پیدائش سے زیادہ خوشیاں منائی تھیں۔ دودھ جیسی رنگت اور سیاہ بڑی بڑی آنکھوں والی اس موم کی گڑیا کا نام حمید نے پارس رکھا تھا اور بارہ سالہ احمد نے کانچ کی گڑیا کو محبت سے اٹھاتے ہوئے پری کہا تھا۔ حمید کریانے کا سٹور چلاتا تھا گھر میں خوشحالی تھی۔ پری کی پیدائش کے بعد کاروبار میں اتنی برکت آئی کہ ایک سٹور کی جگہ تین سپر سٹور بن گئے۔ پری کے ناز اٹھانے میں کبھی کوئی تاخیر نہ ہوئی وہ اتنی نازک تھی یا شائد باپ اور بھائیوں کی محبت نے اس کے وجود کو کانچ جیسی نزاکت بخش دی تھی اور بھائی اس پر جان چھڑکتے تھے۔ حمید اکثر زہرا سے کہتا پری کتنی جلدی بڑی ہو گئی ہے ابھی کل تو میری گود میں تھی میری روئی کی گڑیا! اور اب دیکھو ماشاءاللہ اس کا قد میرے برابر آ گیا ہے۔ پری کے ذکر پر ہمیشہ حمید کی آنکھیں چمکنے لگتی تھیں۔

پری گاؤں کے پرائیویٹ سکول میں پڑھتی تھی اس کی جماعت میں پانچ لڑکے اور چار لڑکیاں تھیں۔ آٹھویں جماعت کے بعد زہرا نے دبے لفظوں میں پری کے اب اسی سکول میں لڑکوں کے ساتھ پڑھنے پر اعتراض کیا تو احمد نے سختی سے انکار کرتے ہوئے کہا کہ پری گورنمنٹ سکول میں نہیں جائے گی میری پری یہیں پڑھے گی اور حمید نے ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے ملامتی نظروں سے زہرا کو گھورا تو وہ اٹھ کر باورچی خانے میں چلی گئی۔ وہ ماں تھی اور بیٹی سے محبت بھی کرتی تھی مگر اسے یہ بھی احساس تھا کہ پری جوان ہو گئی ہے اس کو دوسرے گھر بھی جانا ہے اس کی تربیت کرنا چاہتی تھی مگر وہ جب بھی کوئی بات کرتی تو حمید اور احمد کے گویا دل پہ ہاتھ رکھتی تھی وہ دونوں ہی اسے چپ کروا دیتے۔ پری کسی کام کو ہاتھ نہیں لگائے گی آپ بھی نہ کیا کریں اگر نہیں ہوتے کام والی رکھ لیں ایک اور۔ احمد کا ہمیشہ یہ جواب ہوتا تھا اور حمید صاحب

تو بات ہی ختم کردیتے بیٹے بیاہو زہرا بیگم اور بہویں لاؤ کام کے لیے میری بیٹی ہے نہ کہنا۔اور زہرا خاموش ہو رہتی۔گاؤں کے لوگ خصوصاً لڑکیاں پری پر رشک کرتی تھیں نہم جماعت میں پری کے ساتھ دو نئے لڑکے بھی داخل ہوئے تھے دونوں چچازاد تھے اور بلا کے شرارتی تھے۔زین عرف موٹو کھانے کا زبردست شوقین تھا جب کہ عادل عرف کالوا پنے دبتے ہوئے رنگ کی وجہ سے احساس کمتری میں مبتلا تھا۔پارس اپنی جماعت میں سب سے زیادہ خوبصورت تھی اور خوبصورتی کے ساتھ ساتھ اس کا رکھ رکھاؤ اور معصومیت دیکھنے والے کو جکڑ لیتی تھی۔پری بچپن سے نظروں میں اپنے لیے ستائش دیکھنے کی عادی تھی۔عادل کو مکھن جیسی رنگت والی پارس بہت پیاری لگتی اور جب وہ اپنی سیاہ آنکھوں کو شرارت سے مٹکاتی تو عادل دم بخود ہو کر اس کی آنکھوں میں چمکنے والے جگنو دیکھتا رہ جاتا۔اسے اپنی نظروں کے ارتکاز کا احساس نہیں تھا مگر دیکھنے والے معنی خیز نظروں کا تبادلہ کرنے لگے تو پارس کی سہیلی انعم نے زین کو شکایت کی کہ عادل کو کہو ہمیں گھورا نہ کرے ورنہ ہم پرنسپل کے پاس جائیں گے اس کے گھر میں بھی بہنیں ہیں لڑکیوں کو ایسے دیکھتا ہے جیسے کبھی دیکھا ہی نہیں۔وہ تو بہت کچھ بڑبڑاتی رہی مگر زین حیران سا فوراً عادل کی طرف آ گیا۔آتے ہی اس کے کندھے پر دھپ رسید کرتے ہوئے بولا۔کیوں اوئے کالو! کیا مسئلہ ہے۔کیوں گھورتا ہے انعم کو؟ عادل نے بازو سہلاتے ہوئے غصے سے زین کو دیکھا۔کس انعم کو دیکھا ہے میں نے۔زین نے شاکی نظروں سے گھورتے ہوئے اس کے پاس بیٹھ کر کہا کالو ہم ادھر نئے آئے ہیں یہ ہماری بہنیں ہیں یار۔لڑکیوں کو دیکھنا کوئی اچھی حرکت نہیں ہوتی اور انعم جیسی لڑاکا خاتون کو دیکھنا تو بالکل بھی نہیں سیدھی پرنسپل کے آفس جائے گی اور ہمیں سکول سے باہر نکلوا دے گی۔عادل نے زین کو سنجیدہ دیکھا تو ہنسنے لگا۔اوئے بس کر منہ ٹیڑھا ہو گیا ہے تیرا تم پہ اچھی نہیں لگتی سنجیدگی اور میں نہیں دیکھتا کسی انعم کو، میں تو پری کو دیکھتا ہوں۔اس کی آنکھیں چمکنے لگی تھیں۔زین نے اس کی طرف دیکھا اور بولا کیوں؟ وہ ہے ہی بہت پیاری دل کرتا دیکھتا ہی رہوں عادل نے مسکرائی نظروں کے ساتھ جواب دیا۔زین نے اٹھتے ہوئے کہا پیاری ہے مگر لڑکی ہے کم ہی گھورا کر بھوک لگوادی مجھے ٹینشن دے کر۔

دو دن سکون سے گزرے تیسرے دن بریک ٹائم عادل بےخودی میں پری کو دیکھ رہا تھا جب اس کے پاس بیٹھی انعم نے اسے آنکھیں دکھائیں وہ چونک کر انعم کی طرف متوجہ ہوا اور اسے ایک نظر دیکھ کر کینٹین کی طرف جانے لگا۔انعم دانت پیس کر اٹھی اور اس کے سامنے آ گئی۔کیا مسئلہ ہے کبھی لڑکیاں نہیں دیکھی تھیں وہ راستہ چھوڑ کر گراؤنڈ کی طرف مڑا تو انعم نے پیچھے سے چلا کر کہا کالو اپنا منہ دیکھا ہے کبھی ہر وقت دوسروں کو دیکھنے سے بندہ گورا نہیں ہو جاتا۔انعم کے مضحکہ اڑانے پر عادل کو تاؤ آ گیا اس نے انعم کو گھورتے ہوئے کہا اتنی تم حسن کی دیوی خوش فہم کہیں کی۔بھول ہے تمھاری میں تمھیں دیکھنے کے قابل سمجھتا ہی نہیں۔تو جو دیدے پھاڑ پھاڑ کر جہاں ہم جائیں وہاں دیکھتے رہتے ہو۔اس کا کیا مطلب ہے بھلا۔عادل نے طنزیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا پھر بھی تمھیں نہیں دیکھتا۔پری کو دیکھتا ہوں۔اردگرد کھڑے ہجوم میں خاموش نظروں کا تبادلہ ہوا۔انعم نے تلملا کر کہا آئندہ تم دیکھنا ذرا پری کو بھی پرنسپل سے آنکھیں نکلوا دوں گی تمھاری۔عادل ان سنی کرتا ہوا چلا گیا۔بات پھیلی تو لڑکیاں عادل اور پری کو شک سے دیکھنے لگیں کچھ تو بہانے سے پارس کے پاس بیٹھ کر عادل کا ذکر چھیڑ دیتیں تاکہ پری کے تاثرات جانچ سکیں۔پری معصومیت سے ہر بات کا جواب دیتی یا مسکراتی رہتی مگر انعم کے طنزیہ فقروں اور اشاروں سے اس کا ماتھا ٹھنکا۔پری طبعاً امن پسند اور ڈرپوک تھی وہ عادل سے کترانے لگی۔جہاں عادل دکھائی دیتا وہاں سے ہٹ جاتی۔عادل نے سمجھا کہ پری ناراض ہو گئی ہے۔اس نے پری کو منانے کے لیے ایک ''سوری کارڈ'' بنایا۔سرخ گلاب اور کانچ کی چوڑیوں کے تحفے کے ساتھ صبح سکول آتے ہی

خاموشی سے پری کے بستے میں رکھ دیا۔ اسمبلی کے بعد جب سب کمرے میں آئے تو انعم نے جلدی سے پری کا بستہ کھولا چوڑیاں اور پھول سرک کر اس کی جھولی میں آ گرے۔ پاس بیٹھی پارس نے اچھنبے سے ایک دفعہ انعم کو دیکھا اور پھر بستے کو گویا یقین کر رہی تھی کہ بستہ کس کا ہے۔ انعم نے اس کی حیرانی کو بھانپ کر پوچھا یہ تم نہیں لائیں پری نے نفی میں سر ہلایا تھا تو انعم نے غصیلی نظروں سے عادل کی طرف دیکھا وہ ان کو ہی دیکھ رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ انعم اس کے سر پہ سوار ہوتی مس صبا کلاس میں داخل ہوئیں۔ پری انعم کے تیور دیکھ کر ہی سہم گئی تھی مس صبا کے آنے سے عادل کی بھی سانس خشک ہوئی۔ مس صبا نے کلاس کو خاموش محسوس کیا تو پوچھا سب خیریت ہے؟ انعم جھٹ سے اٹھی چوڑیاں اور پھول مس کی میز پر رکھ دیں۔ مس نے استفہامیہ نظروں سے دیکھا تو بولی مس یہ عادل نے پری کے بستے میں رکھی ہیں پہلے یہ اسے سارا وقت دیکھتا رہتا تھا اور گلی میں بھی پیچھا کرتا ہے اور آج یہ تحفہ لایا ہے۔ مس صبا پہلے بھی اس حوالے سے کافی چہ میگوئیاں سن چکی تھیں مگر آج انعم کے لہجے نے انھیں غصہ دلا دیا۔ انھوں نے چھڑی منگوا کر بغیر کوئی وضاحت سنے عادل کی پٹائی لگا دی اور اس کو مارتے ہوئے سخت سخت بھی سنا دیں۔ تم سب کو یہاں پڑھنے کے لیے بٹھایا ہے۔ پیار محبت کے کھیل کھیلنے کے لیے نہیں، آئندہ اس طرح کی کوئی حرکت یا شکایت مجھے ملی تو سخت برا پیش آؤں گی مس صبا غصے سے چلی گئیں۔ پارس رونا بھول کر مس کے الفاظ پر غور کر رہی تھی۔ پیار محبت تو کیا؟ اس سے آگے سوچتے ہوئے اس کا دل زور سے دھڑکا تھا۔ بریک کے وقت بستے میں کتابیں رکھتے ہوئے انعم کی نظر کارڈ پر پڑی۔ پارس نے کارڈ نکال کر دیکھا اور ملامتی نظروں سے انعم کو دیکھا اور کارڈ اس کے ہاتھ میں پٹخ دیا۔ انعم سوری کارڈ دیکھ کر شرمندہ ہوئی پری نے تاسف سے کہا عادل کو بہت مارا ہے مس صباء نے تمھاری وجہ سے۔ انعم نے عادل کے پاس جا کر معذرت کی تو عادل نے اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھا آئندہ اگر مجھے بلایا تو جان نکال دوں گا تمھاری۔ گندی عورتوں جیسی سوچ ہے تمھاری میری تم سے دوستی ختم۔ ہر بات کو ہی برا سمجھتی ہوں انعم نے مریل آواز میں کہا میں مس کو بھی بتا دیتی ہوں۔ میری غلطی تھی۔ مس صبا نے شدید تاسف سے ساری بات سنی اور کہا تم اور پری دونوں جا کر عادل سے پوری کلاس کے سامنے سوری کرو۔

اس طرح پوری کلاس میں چھائی بدمزگی تو ختم ہو گئی اور دو تین دن میں کلاس کا ماحول دوبارہ بے تکلف ہو گیا مگر اب عادل کی جھجک بھی ختم ہو گئی۔ وہ بلا تکلف کسی بھی وقت پارس کو مخاطب کر لیتا اور اکثر اس کی تعریف کر دیا کرتا کبھی اس کے بالوں کی کبھی ہاتھوں کی اور کبھی آنکھوں کی۔ پری اس کی تعریف پر جھینپ جاتی۔ سالانہ پرچوں سے قبل نہم جماعت نے انھیں الوداعی تقریب میں بلایا۔ ہر کوئی بن سنور کر آیا۔ لڑکیاں نک سک سے تیار ایک سے بڑھ کر ایک پیاری لگ رہی تھیں۔ پری ہلکے گلابی نازک سے کام والے ریشمی فراک میں ملبوس، پیروں میں گلابی نازک سے سینڈل پہنے کھلے بالوں اور ہلکے میک اپ کے ساتھ سب کی نظروں کا مرکز بنی ہوئی تھی مگر دو نگاہیں جو مسلسل وہ خود پر محسوس کر رہی تھی وہ عادل کی تھیں اب اسے عادل کی یہ والہانہ نگاہیں مسرور کرتی تھیں۔ ہر لڑکی کی طرح اسے بھی چاہے جانے کا احساس مغرور کرتا تھا۔ اب وہ عادل کی تعریفوں کی عادی ہو چکی تھی اور عادل بھی کئی دفعہ دبے دبے لفظوں میں اقرار محبت کر چکا تھا۔ نہم جماعت نے بھرپور طریقے سے ان لوگوں کو خوش آمدید کہا ہال میں داخل ہوتے وقت جب ان لمحات کو کیمرے کی آنکھ محفوظ کر رہی تھی عادل چپکے سے زین کو چھوڑ کر پارس کے داہنی جانب کھڑا ہو گیا اس کے بعد جتنی بھی گروپ تصاویر بنی سب میں پارس لڑکیوں کی قطار کے آخر میں رہی اور اس کے دوسری جانب عادل ہی دکھائی دیا۔ دونوں ایک دوسرے میں مگن تھے۔ شاید وہ آخری کچھ پل ایک ساتھ ہی رہنا چاہتے تھے اور اس کوشش

میں وہ ارد گرد گھومتی اور ملامتی نگاہوں پر دھیان نہ دے سکے۔ تقریب کے آخر میں جب سارے دوست ایک دوسرے سے مل رہے تھے ایک کونے میں عادل نے پارس کو اشارے سے اپنی طرف بلایا۔ پارس غیر محسوس انداز میں اپنی دوستوں کے پاس سے ہٹ کر پانی کے کولر کی جانب گئی اور پھر سب سے آنکھ بچا کر عادل کے پاس چلی گئی۔ اس کونے میں قدرے تاریکی تھی۔ عادل کی والہانہ نظروں سے گھبرا کر پارس نے ادھر ادھر دیکھا اور بے چینی سے بولی کیا ہے؟ عادل نے کہا ہاتھ دکھاؤ پارس نے حیرت سے ہاتھ آگے کیا تو عادل نے اک ہلکی سی چاندی کی انگوٹھی جس میں کالا پتھر جڑا ہوا اس کی انگلی میں پہنا دی اور اس سے پہلے کہ پارس حیرت سے نکلتی اس نے اس کے ہاتھ کی پشت پر مہر محبت ثبت کر دی۔ پارس ایک جھٹکے سے پیچھے ہوئی اور دھڑ دھڑ کرتے دل کے ساتھ اپنے بیگ کی طرف گئی اور انگوٹھی اتار کر اس میں رکھی اور پورا گلاس پانی کا پیا۔ اور خود کو نارمل کرتے ہوئے دوستوں میں آ گئی سب سے پہلے اس کی اڑی ہوئی رنگت کا نوٹس انعم نے لیا۔ کیا ہوا پری طبیعت تو ٹھیک ہے؟ پری ہونک بن کر اس کا چہرہ دیکھنے لگی۔ پاس کھڑی فاریہ نے ونیزہ کو آنکھ مارتے ہوئے قدرے اونچی آواز میں گانا شروع کر دیا۔

موت سے ڈر نہیں لگتا مجھ کو
ایک تم سے جدائی کا ڈر ہے
ماہی وے محبتاں سچیاں نے
منگدا نصیباں کجھ ہور وے

پارس مرے مرے قدموں سے ہال سے باہر نکل کر گراؤنڈ میں بیٹھ گئی۔ انعم اس کے پیچھے آئی کیا ہوا پری رو کیوں رہی ہو پارس نے حیرانی سے چہرے پر ہاتھ پھیرا اوہ رہی تھی میرے میرے سر میں درد ہو رہا ہے۔ اس نے ہکلاتے ہوئے کہا اچھا چلو! موڈ تھوڑا فریش کرو ٹیچرز سے مل کر ہم گھر چلے جاتے ہیں۔ تمام اساتذہ نے انھیں نیک تمنائیں اور دعائیں دے کر رخصت کیا۔ جب پری سکول کے دروازے میں پہنچی تو انعم کو پیچھے سے زین کی آواز آئی عادل دروازے کی اوٹ میں باہر کی جانب کھڑا تھا۔ پارس اسے دیکھ کر سمجھ گئی کہ انعم کو واپس بلانے کا عادل نے ہی کہہ رکھا تھا۔ عادل نے اس کے خالی ہاتھ کو شکوہ کرتی نظروں سے دیکھ کر کہا پہننے کے لیے دی ہے اسے کبھی اتارنا مت۔ یہ میری محبت کی نشانی ہے۔ پری نے مریل آواز سے کہا کوئی دیکھ لے گا جاؤ میں پہن لوں گی۔ عادل نے محبت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا بس کچھ سال اور پھر میں تمھیں اپنا بنا لوں گا۔

اس بات پر پارس کا رنگ گلنار ہوا تھا۔ دل اک عجیب سی لے پر دھڑکا تھا۔ اتنے میں عادل انعم کو آتا دیکھ کر ملتی رہنا کہہ کر جلدی سے دروازے کے پیچھے ہو گیا انعم اس کے پاس آ کر بولی سوری پری۔ میں سمجھی زین کو کوئی ضروری کام ہو گا مگر وہ فضول انسان پوچھ رہا تھا کالج جاؤ گی؟ یہ لڑکے بڑے عجیب اور فضول ہوتے ہیں۔ پارس کے گھر تک وہ مسلسل بڑبڑاتی رہی پھر پری کو گلے مل کر اپنے گھر کی طرف بڑھ گئی۔ پری نے دروازے کے پاس رک کر اپنے حواس بحال کیے سامنے برآمدے میں کھڑی اماں کو دیکھ کر ہونٹوں پر مسکراہٹ سجائی اور اماں کو سلام کرتے ہوئے سیدھی کمرے میں گھس گئی۔ پاؤں جوتے سے آزاد کیے بغیر پلنگ پر لیٹ گئی وہ اپنی کیفیت سمجھنا چاہتی تھی وہ چور حرکتیں کیوں کر رہی تھی۔ سوچتے سوچتے اس کی آنکھ لگ گئی۔ اماں دودھ کا گلاس لے کر جب اس کے کمرے میں داخل ہوئیں تو اسے سوتا دیکھ کر مسکرائیں اور واپس

چلی گئیں۔شام کو پری سو کر اٹھی تو اس کے تینوں بھائیوں کی آوازیں آ رہی تھیں وہ سب کھانے کی میز پر اکٹھے ہو چکے تھے اور پری کا انتظار کر رہے تھے۔ پری جلدی سے منہ ہاتھ دھو کر باہر نکلی سب کو سلام کر کے لاڈ سے حمید کے گلے میں بانہیں ڈال کر جھولنے لگی۔حمید نے ہاتھوں سے پکڑ کر سامنے کیا اور ماتھے پر بوسہ دیا تینوں بھائی بھی ستائشی نظروں سے دیکھ رہے تھے عمیر نے باقاعدہ بے ہوش ہونے کی ایکٹنگ کی۔یار احمد بھائی یہ خوبصورت گڑیا کون ہے وہ آنکھیں پٹپٹاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔احمد نے پری کے سر پہ ہاتھ رکھ کے پیار سے کہا یہ ہماری پارس ہے۔عمیر نے پری کو چھیڑنے کے لیے کہا (وہ تو چڑیل تھی یہ تو بہت پیاری لگ رہی ہے۔ پری احمد کے لاڈ سے خوش تھی۔عمیر کو زبان چڑا کر احمد کو بتانے لگی کہ اس نے پارٹی پر کتنا انجوائے کیا۔ بتاتے بتاتے اسے ان گفٹس کا خیال آیا جو سب دوستوں نے دیے تھے۔اس نے احمد سے کہا کہ وہ کھانے کے بعد اسے گفٹ دکھائے گی۔عمیر کو نہیں دکھانے۔کھانے کے بعد احمد،عمیر اور علی اس کے کمرے میں آئے پری نے خوشی خوشی انھیں سارے گفٹ کھول کر دکھائے آخر میں جب اس کے ہاتھ میں انگوٹھی آئی تو اس کے چہرے کی سرخی اور آنکھوں کی چمک اک دم بڑھ گئی بہن کے معصوم چہرے کو غور سے دیکھتا احمد چونکا۔اس کے ہاتھ سے انگوٹھی پکڑ کر بولا (ارے واہ یہ تو سب سے پیاری ہے یہ کس نے دی پری کو)۔ پری نے خوش ہوتے ہوئے بتایا۔عادل نے احمد کے چہرے پر سایہ سا لہرایا۔مگر پری اپنی دھن میں مگن انگوٹھی کو ہاتھ میں پہنتے ہوئے بولی۔ پیاری لگ رہی ہے نا؟ یہ میں ہمیشہ پہنوں گی۔

احمد خاموشی سے اٹھ کر کمرے سے نکل گیا عمیر اور علی پارس کے ساتھ شرارتیں کرتے رہے پری بے حد خوش تھی دن میں ہونے والی الجھن ختم ہو چکی تھی۔ پری اپنے امتحانوں کی تیاری میں جت گئی اسے کالج میں داخلے کے لیے اچھے نمبر حاصل کرنا تھے۔وہ احمد کے رویے میں تبدیلی نوٹ نہ کر سکی۔احمد نے جب عادل کو دو دفعہ اپنے گھر کے دروازے پر دیکھا تو اس کی پیشانی سلوٹ زدہ ہو گئی وہ ماں سے بولا یہ لڑکا کیوں آ جاتا ہے روز؟

زہرا نے سرسری لہجے میں بتایا پری کا ہم جماعت ہے کچھ کتابیں وغیرہ لینے آتا ہے احمد ہونٹ بھینچ کر رہ گیا۔ پری کو ہر طرح کی آزادی دینے والا احمد اس کے لباس پر تنقید کرنے لگا یہ کیا پہنا ہے۔اتارو یہ تنگ پاجامہ کھلی شلوار پہن کر گھر سے نکلا کرو۔ پری کے تمام پرچوں میں وہ اس کے ساتھ سکول جاتا اور اس کو ساتھ لے کر ہی آتا عادل پری سے ملنے کی کوشش کرتا مگر احمد کی گھوری سے سہم جاتا۔ پری بھی بھائی کے رویے پر حیران و پریشان تھی مگر کچھ سمجھ نہیں پا رہی تھی۔

آخری پرچے والے دن عادل نے کمرہ امتحان سے باہر نکلتی پارس کا راستہ روک لیا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر بے قراری سے بولا مجھے ملتی کیوں نہیں ہو فوراً کیوں چلی جاتی ہو۔اس سے پہلے کہ پارس کوئی جواب دیتی احمد کی پھنکارتی ہوئی پکار پر وہ سن ہو گئی۔عادل بھی ٹھٹک گیا تھا۔اسے اندازہ نہیں تھا کہ احمد پیچھے کھڑا دیکھ رہا ہے۔

وہ جلدی سے پارس کا ہاتھ چھوڑ کر دوسری جانب دوڑ گیا احمد نے پارس کا بازو پکڑا اور اس کو گھسیٹتے ہوئے گھر لے گیا۔ پارس اس قدر ششدر تھی کہ رونا بھی بھول گئی۔اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ احمد جو کبھی اسے غصے سے دیکھتا نہیں تھا اس قدر سخت کیوں ہو گیا تھا۔احمد اسے پلنگ پر گرا کر اپنے کمرے میں گیا۔زہرا کچن میں تھی انھیں ان دونوں کے آنے کی خبر بھی نہ ہوئی۔

احمد آدھے گھنٹے بعد کمرے میں داخل ہوا تو اس کے ہاتھ میں جوس کا گلاس تھا۔اس نے پیار سے پری کو پکارا تو وہ بھائی کو نرم دیکھ

کر سسکنے لگی۔احمد نے اسے گلے سے لگاتے ہوئے کہا جوس پیو پری ۔نے روٹھے پن سے کہا آپ نے میرا ہاتھ اتنی سختی سے پکڑا کیوں تھا مجھے درد ہو رہا ہے۔احمد نے اس کا ہاتھ سہلاتے ہوئے اپنے ہاتھ سے جوس اسے پلانا شروع کر دیا۔

اگلے دن گاؤں کی مسجد میں اعلان ہوا کہ حمید کی بیٹی رضائے الٰہی سے وفات پا گئی ہے ۔ہر کوئی حیران و افسردہ ان کے گھر جا پہنچا۔ پارس کے دوست سکتے کی حالت میں تھے۔ پارس کی آخری رسومات کی ادائیگی میں اس قدر جلدی کی گئی کہ کوئی بھی پارس کا آخری دیدار نہ کر سکا۔تعزیت کے لیے آنے والے لوگوں کو بتایا گیا کہ پارس کی موت ہیضے کی وجہ سے ہوئی ہے ۔شاید یہ وجہ سچ ہو مگر گاؤں کے در و دیوار نے پارس کی موت کی اتنی وجوہات سنیں جتنی اس گاؤں کے لوگوں کی زبانیں تھیں۔

احمد نے اپنی معصوم بہن کی موت کی جو آخری وجہ گاؤں کی ایک عورت کے منہ سے سنی جو دوسری عورت کو بہت رازداری سے بتا رہی تھی وہ یہ تھی کہ ''بے غیرت تھی وہ کالا سا لڑکا ہے نا اس کے ساتھ تعلقات تھے ماں باپ کو منہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑا تھا اس لیے بھائی نے مار دیا۔

ااے مرے عشق یہاں کارِ جنوں میں تم بھی
پیاس صحرا کی بجھاؤ گے چلے جاؤ گے
عامر علی

لعل

کومل لیاقت

رول نمبر 117، ایم اے، اردو

شام کے وقت سورج غروب ہو چکا تھا، کشادہ صحن جس میں کیکر، انار اور چند کیاریوں میں کچھ اور پودے۔ صحن کی دوسری جانب مغربی دیوار کے ساتھ بھینس اور چند ایک آدھ اور جانور بندھے ہیں۔ صحن میں کیکر کے درخت کے پاس تین چار پائیاں بچھی ہیں جن پر تین آدمی عمر لگ بھگ بیس سال، باریک مونچھیں، تہہ بند اور کرتے پہنے بڑے شاہانہ انداز میں محفل جمائے بیٹھے ہیں۔ حقے کے کش باری باری لگاتے گفتگو کے دوران قہقہوں کو بلند کرتے جاتے ہیں۔

صحن سے اٹھتی گھمبیر آوازوں اور قہقہوں کا یکے بعد بلند ہونا رابعہ کو انتہائی نا گوار لگ رہا تھا۔ رسوئی میں دودھ کی بالٹی رکھ کر تیز تیز قدموں سے چلتی، غصے کے عالم میں منہ ہی منہ میں بڑبڑاتی ہوئی برآمدے کی جانب چلی گئی۔

اماں کو صبح ہی خط لکھتی ہوں گھر میں مجھے اکیلی جان کو چھوڑ کر خود ہسپتال جا بیٹھی۔ اور یہ جو میاں جن کی ذمہ داری پر اماں گھر چھوڑ کر گئی ہے۔ ان کے چلن، بھئی دیکھنے سننے والے کیا کہیں گے کہ ماہ نور بیٹی کو گھر میں اکیلا چھوڑ کر خود دیکھنے کو ایک بار نہیں پلٹی، میں تو یہ سب برداشت نہ کروں گی۔ مرے باپ کی قبر پر باتیں میں نہیں بننے دوں گی۔

رابعہ طبیعت کی سخت تھی۔ نو ماہ کی عمر میں باپ کا انتقال اور ماں اس پر ماں کی بھولی طبیعت، یہاں دنیا میں بھولے پن کے ساتھ جینا کوئی آسان بات نہیں۔ رابعہ کے باپ کی وفات کے بعد رشتہ داروں کا رابعہ کے باپ کی جائیداد پر بار ہا جھپٹنا اور دوسرے مسائل جو گھر کا سربراہ نہ ہونے پر پیش آتے ہیں۔ رابعہ کو سخت طبیعت بنا گئے۔

اگلے روز صبح ہوتے ہی رابعہ نے بی بی کے شوہر جو ریلوے میں نوکر تھے انھیں جا سب بیان کیا اور اماں کو خط لکھنے کا کہا۔ رابعہ کی ماں کو ٹی بی کا مرض جو بی بی کا دن بدن بڑھتا جا رہا تھا اس کے باعث اسے ہسپتال میں رکھے ہوئے تھی۔ بی بی رابعہ کی بڑی بہن جس کو بی بی کہہ کر مخاطب کرتی تھی ایک عرصہ سے ٹی بی کے مرض میں مبتلا تھی۔

رابعہ:۔ لالہ اماں مجھے یہاں اکیلا گھر میں چھوڑ کر خود وہاں جا بیٹھی اور اسلم کو گھر کی دیکھ بھال کی ذمہ داری سونپ کر گئی لیکن اس کی روز کی محفلیں اور صحن میں ہٹے کٹے لا کر بٹھا دینا بھلا خود ہی بتاؤ لالہ یہ کوئی کرنے کی بات ہے۔ مجھے سو کام اندر باہر کرنے اور دیکھنے ہوتے ہیں کیا کہیں گے آس پڑوس کے لوگ۔ لالہ تم اماں کو خط لکھو اور اسے کہو کہ مجھے نکالے اس جھنجھٹ سے۔

لالہ سر پہ ہاتھ رکھتے ہوئے حوصلہ دینے کے انداز میں، رابعہ پتر اسلم گھر کا بیٹا ہے یہ سب حرکتیں اسے زیب نہیں دیتی۔ پھوپھی نے بیٹا بنا کے پالا اسے خیر تو پریشان نہ ہو میں آج ہی پھوپھی کو خط ڈالتا ہوں، جا تو گھر۔ رابعہ، لالہ اماں کو جلد آنے کا کہنا، کہنا خط ملتے ہی آجائے۔ لالہ، اچھا جا تو میں کہہ دوں گا اور سن کسی چیز کی ضرورت ہو تو مجھے کہنا۔

رابعہ کا خط ملتے ہی اماں اگلے ہی روز آ پہنچی۔ رابعہ روز کے اس معمول سے عاجز آئی ہوئی تھی اماں کے آتے ہی گھڑے سے پانی کا پیالہ بھرا اور آگ بگولہ ہوئی اماں کے پاس آئی۔

رابعہ :۔اماں یہ جسے توگھر کا سربراہ کہتی ہے پتر پتر کہتے تھکتی نہیں، تیرے گھر کو مجلس خانہ بنا رکھا ہے۔ناک میں دم کر دیا اس نے اورتو اسے میرے سر کا تاج بنانے کا سوچے بیٹھی ہے۔ جسے گھر کی عزت کا، ماحول کا کچھ خیال نہیں، جو اپنی روزمرہ عیاشیوں میں مگن ہے اماں لاڈ سے خراب کرر کھا ہے تو نے اسے، رابعہ غصے اور اکتاہٹ سے بولتی چلی گئی۔

اماں :۔فکر اور پریشانی کے عالم میں کچھ سوچتے ہوئے فیصلہ کن انداز میں، رابعہ!

رابعہ :۔جی اماں

اماں :۔ پتر تیری بی بی بڑی بیمار ہے میں اسے وہاں چھوڑ کر آئی ہوں وقت کا کچھ پتہ نہیں پتر میں تیرا اور اسلم کا نکاح کروا کر سرخرو ہونا چاہتی ہوں۔دیکھ پتر تہہ شدہ نسبت ہے اگر شادی ہو جائے میرا فرض ادا ہو جائے گا۔

رابعہ اماں کی بات کو سمجھتے ہوئے اسی میں مصلحت سمجھتے ہوئے بولی بی بی وہاں اکیلی ہے اماں کو جانا ہوگا اماں ٹھیک کہتی ہے۔اسلم کے سر پہ ذمہ داری ہوگی کچھ بوجھ پڑے گا تو سدھر جائے گا۔

آخر رابعہ اور اسلم کا نکاح ہو گیا۔وقت گزرتا گیا ان کے تین بیٹے اور دو بیٹیاں ہوگئیں مگر اسلم کی خصلتیں اس کی عادتیں پختہ ہو چکی تھیں۔گھر سے زیادہ باہر توجہ،غیر ذمہ داری کا مظاہرہ کرتا۔رابعہ نے اسے سمجھانے کی بہت کوشش کی اور اسی وجہ سے اکثر ان دونوں کے درمیان تلخ کلامی ہوتی رہتی۔بعض اوقات تو اس نے رابعہ کو اس کی عادتوں پر شکوہ کرنے کے باعث تھپڑ بھی رسید کر دیا۔محض اپنا رعب جمانے کے لیے۔گھر سے باہر اس کی سرگرمیوں کی رابعہ کو خوب خبر تھی اور کئی دفعہ تو اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھا مگر وہ مضبوط دل ودماغ کی سمجھ دار عورت تھی۔جب سے ہوش سنبھالا تو ذمہ داریوں کے بوجھ نے سے سمجھ داری اور معاملہ فہمی سکھا دی۔

اسلم اپنی روشوں پر قائم رہا رابعہ نے جیسے تیسے وقت گزارا اس کی اولاد ماں کی فرمانبردار اور نہایت سمجھ دار حالات کی سمجھ بوجھ رکھنے والی تھی۔اس کا بڑا بیٹا اصغر جیسے ہی اس نے ہوش سنبھالا ماں کا سہارا بنا رابعہ کو ساری زندگی کے صبر کا صلہ وہ لعل معلوم ہونے لگا اسے اپنی ساری زندگی کا سفر کا پھل اپنے بچوں میں ملا۔سب سے بڑھ کر اس کا بڑا بیٹا اصغر ماں کا بازو بنا، ماں کے کندھوں سے ذمہ داری گھٹی۔سترہ سال کا خوبرو جوان پتلا جسم،لمبا قد،چہرے پر خوبصورتی اور معصومیت، چہرے کے نقوش میں کسی حد تک باپ کا عکس نظر آتا۔نویں جماعت میں ہوا تو صبح سبزی کا ٹوکرا منڈی رکھتا اور واپسی پر پیسے وصول کرتا۔گھر کا خرچ کچھ بہتر چلنے لگا۔ابھی اس کی تعلیم مکمل نہ ہوئی تھی کہ جوان بیٹے کے سر پر سہرا دیکھنے کی تمنا ماں اور باپ دونوں کی شدت پکڑ گئی۔گھر اور حتیٰ کہ گاؤں میں ہر طرف خوشی کے شادیانے بجائے جانے لگے۔اصغر کی شادی اس کی چچا زاد سے ہوئی۔اصغر اور اس کی بیوی مطمئن اور بہت خوش تھے۔کچھ عرصہ گزرنے کے بعد اصغر کی شادی کو چند ماہ ہی گزرے تھے کہ اسلم نے اپنے دوسرے بیٹے جمال کی نسبت اپنے پرانے تعلقات میں کہیں کرنا چاہی۔اصغر اور رابعہ دونوں نے مخالفت کی بہت کوشش کی۔کیوں کہ وہ جانتے تھے کہ جس لڑکی سے اسلم جمال کی نسبت تہہ کرنا چاہتا ہے وہ اپنے ماموں کے گھر منسوب ہے۔

رابعہ :۔تیرا ابا کیا کرنے جا رہا ہے وہ اپنے ماموں کے گھر منسوب ہے۔

رابعہ :۔تیرا ابا کیا کرنے جا رہا ہے ساری زندگی اس نے کیا ہمارے لیے اپنے گھر کے لیے اور آج یہ اپنی بات پر اڑ بیٹھا ہے یہ کوئی نقصان کروالے گا۔

اصغر:۔اماں جی اباجی کو میں نے سمجھانے کی کوشش کی مگر سنتے کہاں ہیں کسی کی وہ جو کہہ دیا بس وہ کر کے رہیں گے۔کہتے ہیں بات کر چکا ہوں۔زبان دے چکا ہوں کہ زہرہ کی بیٹی کو بہو بناؤں گا۔زبان سے ہرگز نہ پھروں گا۔ابھی ماں بیٹا بات کر رہے تھے کہ دروازہ کھلنے کی آواز پر خاموش ہوکر دروازے کی جانب دیکھنے لگے۔اسلم پگ کو درست کرتا ہوا سفید تہہ بند اور کرتا پہنے چہرے پر ہلکی ہلکی مگر شوخ مسکراہٹ جو ہر گھڑی اس کے چہرے پر براجمان رہتی بلکہ آج تو اس کی آنکھیں بھی مسکرا رہی تھی۔آتے ہی خبر سنائی کہ وہ اپنے جمال کے لیے زہرہ کی بیٹی کی بات پکی کر آیا ہے۔یہ سنتے ہی رابعہ آگ بگولہ ہوگئی۔

رابعہ:۔ہائے ہائے ساری زندگی تو نے کیا کیا ہے جواب یہ کرنے جا رہے ہو۔پتہ نہیں وہ کون سی گھڑی تھی جب اماں نے تیری سوغات مجھے سونپ دی ساری زندگی سکون کا سانس نہیں لینے دیا۔

اسلم:۔کیا کرتا میں گھر میں بیٹھا رہتا یہاں چار دیواری میں قید رہتا تو،تو خوش رہتی۔

اصغر:۔اباجی آپ سوچیں کیا یہ مناسب ہے کہ کسی کی امانت کو کسی کے حق کو چھین لینا۔

اسلم:۔بس!ہاتھ کے اشارے سے زوردار آواز میں کہا۔

رابعہ اور اصغر جو اسلم کو روکنے کی کوشش میں جنگ کے انداز میں بول رہے تھے زوردار گھمبیر آواز سن کر اپنی اپنی جگہ خاموش ہو گئے۔

اسلم طوفان کی سی تیزی سے انھیں قدموں پر باہر کو لوٹ گیا۔

اپنی بات کو پورا کرتے ہوئے آخر اسلم نے جمال کے ساتھ زہرہ کی بیٹی کی نسبت تہہ کر دی یہ معاملہ کچھ روز تو بیزاری کا باعث بنا رہا مگر آخر کار سب خاموش ہو گئے۔صبح سویرے تڑکے اٹھ کر رابعہ نے رسوئی کے باہر ہی چولہے میں آگ جلائی اور ناشتے کے لیے چائے کا پانی چولہے پر چڑھا دیا۔خود آٹا گوندھنے میں مصروف ہوگئی۔اصغر صبح جلد ناشتہ کرنے کا عادی تھا ہر روز جانوروں کا چارا لانے کے بعد وہ ناشتہ کرتا۔رابعہ نے اس کے آنے سے پہلے ناشتہ تیار کیا اصغر دروازے سے داخل ہوا سر پر چارے کی گٹھڑی،ہاتھ میں درانتی کپڑے کسی قدر میلے۔

رابعہ:۔بسم اللہ

اصغر نے سر سے گٹھڑی اتاری گھڑے سے پانی کا پیالہ بھرا اماں کے پاس جہاں وہ روٹیاں پکا رہی تھی زمین پر جا بیٹھا۔

گرم پراٹھے کے اوپر مکھن پیڑا رکھا ساتھ لسی کا گلاس پگھلے ہوئے مکھن پر شکر ڈال کر بڑی شفقت اور محبت سے بیٹے کو ناشتہ دیا۔

رابعہ:۔اصغر پتر روٹی کھا کر جا اور جا کر ہٹی سے سیر سارا گڑ لے آ۔

اصغر:۔اچھا اماں جی،اماں!چائے تو بنا۔

اماں:۔جا نا گڑ لے کر آ۔

چائے کا پانی تو رکھا تھا مگر گڑ نہیں تھا آتا ہے لے کر تو بناتی ہوں۔

اصغر اٹھا،انگڑائی لی اور سستی کے عالم میں ٹہلتا ہوا چل دیا۔

تھوڑی دیر کے بعد ہاتھ میں لفافہ جس میں گڑ ہے لا کے ماں کو دیا لفافہ پکڑاتے ہوئے اس نے گڑ کا ٹکڑا اٹھا کر منہ میں ڈالا

اور شرارت سے اماں کو دیکھ کر ہنسنے لگا جو گڑ نکالتے ہوئے دیکھ چکی تھی۔ گڑ کا تو وہ دیوانہ تھا۔

اصغر:۔ اچھا اماں میں ذرا کام سے جا رہا ہوں آتا ہوں۔

رابعہ:۔ کدھر جا رہا ہے تپتی دوپہر ہونے کو ہے۔

اصغر:۔ آتا ہوں نا اماں آ کر بتاتا ہوں۔

رابعہ:۔ اچھا جا اللہ دے حوالے۔

رابعہ کام میں لگ گئی ابھی صحن میں جھاڑو دے رہی تھی تو حاکم علی کی بیوی جن کا گھر ساتھ پڑوس میں تھا چھت جڑا ہوا اور درمیان کی دیوار ایک تھی۔ آپس میں اچھا لین دین، بات چیت تھی۔ روتی چیختی آئی اور رابعہ کو دیوانہ وار آوازیں دینے لگی۔

رابعہ او رابعہ ارے کدھر رہ گئی، غضب ہو گیا رابعہ،

رابعہ:۔ ارے بہن کیا ہو گیا آ رہی ہوں، آ رہی ہوں۔

اصغر کہاں ہے؟

رابعہ:۔ اپنی پریشانی پر قابو پاتے ہوئے قدرے سنبھل کر مگر گھبراہٹ کے انداز میں ارے بہن بتا تو میرے پیروں تلے زمین کھسکی جاتی ہے بتا تو ہوا کیا۔

اصغر کو ٹرین کی پٹڑی پر گولی لگ گئی۔

ایک ساعت کے لیے رابعہ کو لگا جیسے زمین آسمان آپس میں آ ملے ہیں۔ وہ بیچ میں پس گئی۔ جسے سب مٹ گیا۔ رابعہ کو ایک لمحے کے لیے پورے جہاں میں سناٹا سا محسوس ہوا جسے سب رک گیا ہو۔ جیسے ہی ہوش کی دنیا میں آئی، اعصاب جاگے تو پیروں سے ننگی دیوانہ وار دوڑتی روتی پیٹتی وہاں پہنچی جہاں اصغر نیم بند آنکھوں سے ہجوم کو گھورتا تقریباً آخری سانس لے رہا تھا۔

رابعہ بیٹے کو اس حال میں دیکھ کر سہمے ہوئے اور غشی کے عالم میں اصغر کا سر گود میں رکھے دیوانہ وار بین کرتے روتے بے بسی کی حدوں کو جا پہنچی تھی جو اپنے صحیح سالم بیٹے کو چند ساعت میں اس حال میں دیکھ کر کچھ نہ کر پائی جو اس کی گود میں دم توڑ گیا۔

رابعہ صدمے کے عالم میں بے ساختہ اسلم کو کوسنے لگی جب ہجوم کی آوازوں سے معلوم ہوا کہ کوئی شخص اصغر سے نام دریافت کر رہا تھا نام نہ بتایا مگر اس نے جمال اور اصغر کی صحیح پہچان نہ ہونے پر اصغر کو گولی ماردی۔ یہ وہ شخص تھا جو جمال کی منگیتر کا ماموں زاد جس سے پہلے اس کی نسبت تہہ ہوئی تھی۔ جس سے نسبت ختم کر کے جمال کے ساتھ تہہ کی گئی تھی۔

وہ نہ جانے کب سے پکتا ہوا لاوا رابعہ کے لعل کو بہا لے گیا رابعہ کی دنیا اجاڑ دی۔

پھاٹک ڈیوٹی پر موجود شخص نا جانے کیا کچھ بولتا رہا مگر رابعہ اپنے لعل کو چومتی کرب، تڑپ سے روتی ہاتھ ملتی اسلم کو کوس رہی تھی جسے لاکھ کہا، جس سے ساری زندگی اپنا کہا منوایا صحیح غلط سے عاری، کچھ نہ کیا، کچھ نہ سوچا سمجھا آج میرا لعل گنوا دیا۔ وہ بے بسی کے عالم میں روتی کرب اور صدمے کی حدوں کو جا پہنچی۔

شالا مسافر تھیوے کوئی　　　　نے ککھ جناں تے بھاری ہو

ماں

ایچ اے رضا

جس روز حیدر علی کے ہاں بیٹا پیدا ہوا وہ اتنا رویا کہ اس کی ہچکیاں بندھ گئیں۔اپنے لخت جگر کو گلے لگانے پہ وہ تیار تھا لیکن تقدیر نے آج ایک عجیب دوراہے پر اسے لاکھڑا تھا۔مایوسی اور غم کی شدت میں اپنی زندگی پہ اس نے ایک نظر ڈالی۔نرم الفاظ میں بھی،اسے وہ ایک جہنم زدہ زندگی ہی کہہ سکتا تھا۔اس کا بچپن یتیمی میں گزرا تھا۔بمشکل وہ تین چار سال سکول جاسکا تھا۔لڑکپن مختلف زمینداروں کے ہاں محنت مزدوری میں گزرا۔جہاں ایک سال میں وہ تھوڑا بہت غلہ کمالیتا۔جھڑکیاں اور مار کھاتے ہوئے وہ کب جوان ہوا پتہ ہی نہ چلا۔

یہ وہ حالات تھے جن میں شادی کرنے اور اپنا گھر بسانے کا خواب بھی اس نے نہ دیکھا۔انھی دنوں حیدر علی کے باپ کا چچازاد دور دیس سے واپس آیا وہاں سے وہ بہت دولت کما کر لایا تھا اور پورے علاقے میں اس کا چرچا تھا۔اب وہ اپنی آبائی زمین آباد کرنا چاہتا تھا۔ڈاکٹروں نے کہا کہ وہ سخت بیمار ہے۔اپنے وسیع وعریض فارم کے وسط میں چارپائی پر وہ پڑا رہتا اور نوکروں کو حکم جاری کرتا رہتا۔

حیدر علی بھی کام کی تلاش میں اس کے پاس گیا۔باپ کے چچازاد نے جب اسے دیکھا تو اس کی آنکھوں میں چمک پیدا ہوئی کچھ بتائے سنے بغیر ہی حیدر علی نے اسے پہچان لیا تھا۔جیسے ایک نیک روح دوسری کو پہچانتی ہے پھر آزمائش کے لیے کچھ کام اس نے حیدر علی کے ذمہ کیے۔جو حیدر نے چند دنوں میں نمٹا دیئے۔چند دن کے بعد حیدر علی اس کی چارپائی کے سامنے سر جھکائے بیٹھا تھا۔اس نے پوچھا کتنی تنخواہ لو گے۔حیدر علی نے کہا کہ اس نے کبھی کسی سے مطالبہ نہیں کیا جو کچھ اسے دے دیا جائے اسے وہ قبول کرتا ہے۔حیدر علی نے دیکھا چچا جان کی آنکھیں نم ہوگئیں۔اندر ہی اندر کوئی اسے کھائے جارہا تھا یوں بھی وہ سخت بیمار تھا۔

اس روز سے اس نے حیدر علی کو حویلی کے اندر ٹھہرالیا تھا۔اسے اپنا جانشین بنایا۔حیدر علی کو اس نے یہ بتایا کہ بیماری اسے کھا گئی ہے اور اس کے پاس صرف چند ماہ کی مہلت باقی ہے۔اس نے کہا کہ اپنی وراثت میں سے وہ صرف ایک نوجوان بیٹی چھوڑ جائے گا۔ایک نوجوان لڑکی دولت منداور حسین وجمیل اکیلی کس قدر غیر محفوظ ہوگی۔جائیداد پہ وہ لوگ قبضہ کرلیں گے جو اس کی موت کے منتظر ہیں۔

حیدر علی سے اس نے کہا وہ اس کی بیٹی میشا فاروق سے شادی کرلیں کچھ دیر کے لیے تو حیدر علی پہ سکتہ طاری ہوگیا وہ مشکل سے قبول صورت،رنگ بھی اس کا گہرا تھا۔میشا حسین وجمیل،وہ غریب تھا اور میشا بے حد امیر،بہر حال زمانے کے جبر نے باپ بیٹی کو ایک سمجھوتے پر مجبور کردیا تھا۔یہ وہ حالات تھے جن میں یہ شادی ہوئی۔پہلے دن ہی حیدر علی پہ یہ بات کھل گئی کہ میشا اس سے نفرت کرتی ہے۔اس کی کمتر شکل سے،گہرے رنگ اور غربت سے بھی۔باپ کا فیصلہ مجبوری میں اس نے قبول ضرور کیا تھا لیکن دل سے بدگمان تھی۔باپ کی زندگی میں یہ بات خاموشی کی چادر تلے چھپی رہی اس کے مرتے ہی یہ بغاوت اعلانیہ شکل اختیار کرگئی،اٹھتے،بیٹھتے،آتے جاتے لوگوں کے سامنے اور تنہائی میں اسے وہ بے عزت کرتی اسے ''بدصورت کنگلا'' کہہ کر مخاطب کرتی۔اپنی قسمت کو کوستی۔باپ کے مرنے کے بعد چند روز ہی میں اس نے اپنا بستر الگ کرلیا۔

حیدر علی پہلے تو اس کا منہ دیکھتے رہ گیا دولت منداور خوبصورت لڑکی سے شادی وہ ایک خواب سمجھا تھا۔اب معلوم ہوا کہ وہ ایک

بھیانک سپنا تھا۔غربت اسے راس تھی کہ اپنی مرضی سے اٹھتا بیٹھتا اور اسے بے عزت کرنے والا کوئی نہ تھا۔اس نے فیصلہ کیا کہ وہ یہاں سے اپنابوریا بستر سمیٹ کر یہاں سے وہ چل دے گا۔اسی وقت میشا تے کرتے ہوئی آئی اور بیٹھ کررونے لگی۔

یہاں سے حیدرعلی کی زندگی نے ایک نیا موڑ لیا۔میشا روتی رہتی تھی اور بار بار کہتی تھی کہ ایسے بدصورت کنگلے کا بچہ پیدا کرنے سے پہلے اسے موت کیوں نہ آ گئی۔علی الاعلان اس کا کہنا یہ تھا کہ بچہ بدصورت ہوا تو وہ اس کا گلا گھونٹ کر مار دے گی۔حیدرعلی جانتا تھا کہ یہ ایک دھمکی نہیں بلکہ سچ ہو بھی جائے گا۔بدصورتی سے (امنیہ) میشا کو ایسی شدید نفرت تھی کہ یقینا وہ یہ کر گزرتی ان حالات میں انتظار کے سوا وہ کر بھی کیا سکتا تھا۔اس نے سوچ رکھا تھا کہ بچہ بدصورت رنگ کا کالا ہوا تو فوراً ہی اسے لے کر وہاں سے چلا جائے گا۔وہ تو خود ہی کو بدنصیب سمجھتا تھا آنے والا بچہ اس سے بھی زیادہ بدنصیب ہوتا۔

پھر فیصلہ کن گھڑی آئی امنیہ کے ہاں ایک نوزائیدہ بچے نے جنم لیا دروازہ کھول کر حیدرعلی اندر گیا اور اس کا دل دھک کر رہ گیا کہ بچہ باپ سے بھی زیادہ بدصورت تھا۔وہ رو رہا تھا اور نرس اسے اس کی ماں کے ساتھ لگا رہی تھی۔امنیہ اس وقت نیم بے ہوشی کی حالت میں تھی۔

حیدرعلی تیزی سے باہر نکلا۔اپنے کچھ کپڑے اور ضروری چیزیں اس نے پہلے سے باندھ رکھی تھی۔سب چیزیں اس نے جانے کے لیے تیار کر کے امنیہ کے ہوش میں آنے کا انتظار کرنا شروع کیا۔اس نے امنیہ کو''الوداع'' کہہ کر اور اپنے لخت جگر کو ساتھ لے کر ایک نامعلوم منزل پہ روانہ ہونا تھا۔

وہ نوزائیدہ بچے کو امنیہ کے پاس چھوڑنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔جب وہ کمرے میں داخل ہوا تو امنیہ ہوش میں تھی۔''امنیہ میں جا رہا ہوں''۔حیدرعلی نے کہا''آہستہ'' امنیہ نے سرگوشی میں کہا۔''ننھے شہزادے کو سونے دو''۔حیدرعلی نے چونک کر امنیہ کی طرف دیکھا۔امنیہ کے منہ پہ ممتا کا نور تھا۔

☆☆☆☆

رنگِ پرشور سے ویسے بھی فسوں طاری ہے
یعنی تعطیل ہے اور سیرِ چمن جاری ہے
احمد عطا

اچھی آنکھوں کے پجاری ہیں میرے شہر کے لوگ

عافیہ امجد

ایم اے اردو سال دوم

اُس کا قلم نہایت سُبک روی سے چل رہا تھا۔ اور لفظ صفحہء قرطاس پر بکھرتے چلے جا رہے تھے اور اس کے ساتھ کئی طرح کی سوچوں نے اُس کے ذہن کو منتشر کر رکھا تھا۔ وہ اضطراری انداز میں اپنی نوٹ شدہ معلومات کا جائزہ لیتا، اور کبھی اُس کی آنکھیں لیپ ٹاپ سکرین پر مرکوز ہو جاتیں۔ اُس کے آس پاس کا ماحول اُس کے ذہن سے کئی زیادہ بکھرا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ سامنے رکھے میز پر ایک عدد چائے کے خالی کپ اور ایک عدد لیپ ٹاپ کے علاوہ باقی ماندہ جگہ اخبارات کے پلندے نے ڈھک رکھی تھی۔ اخبارات کی منتشر حالت اس بات کی گواہ تھی کہ سامنے بیٹھے کہ وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر آنے والے حالات کا لائحہ عمل تیار کرنے میں محو تھا۔ اُس کا ذہن نہایت تیزی سے کئی سمتوں پر سوچ رہا تھا۔

صبح کا ناشتہ تو گول ہو ہی چکا تھا۔ اب چار کو چھوتی گھڑی کی سوئیاں، اس بات کی غماز تھیں کہ دوپہر کا کھانا بھی گول رہا ہے۔ مگر ان میں سے کوئی بھی چیز اس کی محویت کو توڑنے میں کامیاب نہ ہو سکی تھی۔ اور جس چیز نے اُس کی محویت میں خلل ڈالا وہ فون کی چیختی چنگاڑتی بیل تھی۔ ایک جی بھر کر بدمزہ ہوا تھا، نظریں لیپ ٹاپ کی سکرین پر مرکوز تھیں۔ جی۔۔۔ ''ایک شجاعت'' سپیکنگ۔۔۔ اس نے نہایت محویت میں اپنا تعارف کرانے میں پہل کی۔ مقابل کی آواز کو وہ لاکھوں آوازوں میں پہچان سکتا تھا۔۔۔ ''چپ کر او صحافی کی اولاد! مقابل نے اُسے بُری طرح ڈانٹ دیا۔ مقابل: تم سمجھتے کیا ہو خود کو! چار لفظ کیا اخبار میں چھپنے لگتے ہیں، خود کو تیس مار خان سمجھنے لگتے ہو۔ میری بات کان کھول کر سن لو۔۔۔ میں تمہیں دھمکی سے ٹالنے کی کوشش نہیں کروں گا۔ بس اتنا یاد کروانا چاہتا ہوں کہ تمہیں اپنے باپ کا حشر معلوم ہوگا اس کی تو لاش بھی نہیں تھی ملی۔ مگر تمہیں اس جگہ گھاڑوں گا کہ تمہاری بوڑھی ماں تمہاری لاش کو بھی ترستی رہ جائے گی۔ ایک کالال ہوتا چہرہ اُس کے ضبط کا غماز تھا۔ ملک حیات خان کی ساری گفتگو تحمل سے سننے کے بعد اُس نے نہایت سکون سے صرف ایک جملہ کہا تھا'' زندگی اور موت خدا کے ہاتھ میں ہے، تم جو چاہو کر سکتے ہو۔ میں پیچھے ہٹنے والوں میں سے نہیں ہوں'' ملک حیات خان نے کھولتے ہوئے خون کے ساتھ اسے موٹی سی گالی سے نوازا اور کال ڈسکنیکٹ کر دی۔ یہ اوائل سردیوں کے دن تھے۔ رات قطرہ قطرہ پگھل رہی تھی۔ سارے ماحول کو گہری خاموشی نے اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ گھڑی کی سوئیاں اپنی رفتار سے چلتی جا رہی تھیں۔ گھڑی کی ٹِک ٹِک کے ساتھ نفیسہ بیگم کے دل کی دھڑکن بھی بار بار ڈوب کر ابھرتی، اور وہ کسی انہونی کے ڈر سے کانپ کر رہ جاتیں۔ جائے نماز پر بیٹھے وہ جانے کب سے دعا میں مشغول تھیں۔ آنسو ایک تواتر سے ان کی آنکھوں سے جاری تھے۔ لیکن دعائیں کسی طور کم نہ ہو رہی تھیں۔ بھیگتی رات اپنے تمام تر سحر کے ساتھ موجود تھی۔ گھڑی کی مخصوص آواز نے جونہی دو بجنے کا عندیہ دیا تو نفیسہ بیگم کے آنسوؤں میں اور بھی شدت آ گئی۔۔۔ یا خدا خیر کرنا!۔۔۔ میرے مالک اسے اپنی پناہ میں رکھنا، وہ پہلے تو اتنی دیر سے کبھی نہیں لوٹا۔۔۔ میرے مالک! میرے وطن کی حفاظت کر۔ میرے وطن دشمنوں کے ناپاک عزائم کو خاک میں ملا دے۔ میرے مالک! میرے بیٹے کو کامیابی عطا کر۔ اُسے اُس کے مقاصد میں سرخرو کر دے۔۔۔ میرے مالک۔۔۔ ان کے الفاظ بے ترتیب اُن کے لبوں سے پھسلتے جا رہے تھے۔۔۔ میرے مالک۔۔۔ آمین۔ اُن کی محویت کو مردانہ آواز میں'' آمین'' کے لفظ نے توڑا۔ اس آواز کو نفیسہ

بیگم میلوں فاصلے سے بھی سن سکتی تھیں۔انہوں نے جلدی سے سجدہ شکر بجالایااور بیٹے کی کشادہ پیشانی پر بوسہ دیا۔ایبک کی سرخ آنکھیں،ملگجا حلیہ اور بڑی شیو،اُس کی دربدری اور جدوجہد کی غماز تھی۔یہ ایسی جدوجہد تھی جو ہر محب وطن اپنے وطن کی ناموس کی حفاظت کے لیے کرتا ہے۔ایبک تمام تر تھکاوٹ اور نیند کے باوجود ماں کو باتوں میں مشغول کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔وہ جانتا تھا کہ اس کا تین دن گھر سے باہر رہنا،اُس کی ماں کو کس قدر بے چین رکھے ہوئے ہوگا۔لیکن ایک قرض،ایک فرض،اُس پر دھرتی ماں کا بھی تھااور یہ قرض اسے ہر حال اور ہر قیمت پر چکانا تھا۔نفیسہ بیگم تو شاید اسے معاف کر دیں لیکن دھرتی ماں اسے شاید کبھی معاف نہ کرے۔ایبک نے پاؤں ٹیبل پر رکھ دیے اور سر صوفے کی پشت پر ٹکا دیا۔۔۔۔

بس کل کا دن ''ملک حیات خان'' بس کل کا دن۔اُس کی آنکھوں میں امید کے کئی جگنو جگمگا رہے تھے۔ لیجئے ایڈیٹر صاحب!۔۔۔ایبک نے موٹی سی فائل ایڈیٹر ''محمود قریشی'' کے سامنے رکھ دی۔محمود قریشی صاحب نے فائل کو ہاتھ لگائے بنا کہا۔۔۔ایبک میں اب بھی تمہیں کہوں گا کہ ان رازوں کو دفن کر دو،میں تمہیں کھونا نہیں چاہتا۔میں اپنے بیٹے کو کھو چکا ہوں،جوان اولاد کا جنازہ اپنے کندھوں پر اُٹھانا کس کرب کا مرحلہ ہوتا ہے مجھ سے بہتر کون جان سکتا ہے۔مجھے تمہاری ماں کا خیال آتا ہے جس کا اس بھری دنیا میں تم واحد سہارا ہو۔تم باخبر رہو،کہ اگر تم ''ملک حیات'' کے خلاف ثبوت اکٹھے کرتے رہے ہو تم سے بے خبر وہ بھی نہیں ہوگا۔تو سر!میں سمجھوں آپ کا اخبار اس سچ کا متحمل نہیں ہو سکتا(اس نے کھڑے ہوتے ہوئے اور اپنے لفظوں پر زور دیتے ہوئے کہا)۔سر!آپ جانتے ہیں پچھلے ڈیڑھ سال سے میں نے راتوں کی نیند ترک کر کی ''ملک حیات خان'' کے خلاف ایک ایک جرم ٹھوس حقائق کے ساتھ اکٹھے کیے تھے۔آپ بھول گئے اسی ملک حیات کی نام نہاد جعلی دوا ساز کمپنی کی ادویات استعمال کر کے ڈیڑھ سو افراد لقمہء اجل بنے ہیں۔سمگلنگ،منشیات فروشی،اغواء غرضیکہ کونسا جرم ہے جس میں ملک حیات ملوث نہ رہا ہو۔اور آپ پھر بھی مجھے خاموش رہنے کا کہہ رہے ہیں۔کیا آپ کو اس بات کا خوف ہے کہ آپ پر حرف آئے گا،تو میں کسی دوسرے اخبار۔۔۔۔

ایبک کے الفاظ زبان پر ہی دم توڑ گئے،جب محمود قریشی صاحب اپنی کرسی سے اُٹھ کر اس کے پاس آئے اور اسے بازوؤں میں بھینچ کر اس کی کمر تھپتھپائی۔۔۔مجھے تم پر فخر ہے نوجوان،میں کیسے بھول سکتا ہوں،میرے بیٹے کو اسی ملک حیات نے قتل کروایا ہے۔میں کیسے بھول سکتا ہوں کہ میرے مفلوج بازو پر گولی اسی ملک حیات کے خلاف سچ کا ساتھ دینے کا صِلہ ہے۔انہوں نے اپنا بایاں بازو ایبک کو دکھایا۔محمود قریشی : میں تمہارے عزائم کی جانچ کر رہا تھا۔خدا تمہیں کامیاب کرے۔میں وعدہ کرتا ہوں کہ کل کا اخبار ملک حیات کی نام نہاد نیک نامی کا پردہ چاک کر دے گا۔تمہارا سچ اس عوام تک رسائی ضرور حاصل کرے گا۔جس کی آنکھوں پر ملک حیات نے اپنے مکر و فریب کے پردے ڈال رکھے ہیں۔ڈھلتی شام کا منظر اُسے ہمیشہ سے ہی دلفریب اور دل کے بہت قریب محسوس ہوتا تھا۔مگر آج کی شام کا اسے شدتوں سے انتظار تھا۔آج وہ بہت مطمئن اور شاد تھا کہ اس نے اپنے مشن کو پایہء تکمیل تک پہنچا دیا ہے۔وہ اسی سوچ میں غلطاں،اپنے مسرور انداز میں سنسان اور خاموش سڑک پر چل رہا تھا کہ اچانک سڑک پر اسے کسی کے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔مڑ کر دیکھنے کی مہلت بھی نہ دی گئی اور ایک ساتھ کئی گولیاں اس کے جسم کے آر پار ہو گئیں،وہ منہ کے بل زمین پر گرا اور دونوں لب زمین پر رکھ دیئے۔

متاعِ لوح و قلم چھن گئی تو کیا غم ہے
کہ خونِ دل میں ڈبو لی ہیں انگلیاں میں نے (فیض)

قرض

ارم شہزادی

ایم،اے اردو۔سال دوم

شمی...اوہ ری شمی

کہاں مرگئی...پانی کا گھونٹ پلا دے کب سے آوازیں دیے جارہی ہوں مجال ہے جو اس لڑکی کے کان پہ جوں تک رینگی ہو۔

کافی صلواتیں سنا چکنے کے بعد بھی دادی شمی کے آنے کا امکان نہ پا کر اسے دیکھنے اٹھ کھڑی ہوئی۔گھر کے اکلوتے کمرے کی دہلیز پر پہنچ کر دادی نے اندر جھانکا جہاں شمسہ آئینے کے سامنے کھڑی تھی اور ایک ادا سے کاجل کی سلائیاں بھر بھر کے اپنی آنکھوں میں ڈال رہی تھی ۔وہ گلابی چست قمیض پہنے ہوئے تھی جس کے گریباں پر سبز دھاگے سے پتیاں کاڑھی ہوئی تھیں لمبے سیاہ بالوں کی چٹیا سینے پر ڈالے وہ گنگناتی آنکھیں جھپک جھپک کر آئینے میں دیکھ رہی تھی۔

دادی ایک تیز نظر شمی پر ڈال کر غصے سے آگ بگولہ ہوگئی۔اپنی بوسیدہ سی چپل اتار کر شمی کی کمر میں جڑ دی۔

حرام خور...کمینی

تجھے کتنی دفعہ کہا ہے کہ نہ اتنا بن ٹھن کر نکلا کر ایک لوہار کی بیٹی ہے کوئی شہزادہ نہیں بیاہنے آئے گا تجھے ۔غضب خدا کا پرائی اولاد میں بوڑھی جان کب تک تیرے پیچھے ہلکان ہوتی رہوں سوچا تھا بڑھاپے کا سہارا بنے گی پر تیرے لچھن تو تیری ماں کی طرح کے نکلتے نظر آرہے ہیں۔

شمی اس اچانک افتاد پر بلبلا اٹھی ۔کمر سہلانے لگی ۔اتنی دیر میں باہر گلی سے سکینہ نے شمی کو آواز دی۔شمی دادی کی آخری بات کی پھانس دل میں لیے سکی کے ساتھ ملکانی کے گھر کام پر جانے کے لیے نکل پڑی۔

راستے میں سکی نے شمی کو بتایا کہ آج ملکانی نے چھوٹے ملک کمال کی بات پکی کرنے کے لیے اپنے بھائی، بھاوج کی دعوت رکھی ہے یہ بات سن کر شمی کا رنگ لٹھے کے کپڑے کی طرح سفید پڑ گیا۔سکی اس کی حالت دیکھ کر کہنے لگی کہ وہ چھوٹے ملک کمال سے بات کرے کیوں کہ سکی کو یقین ہے کہ چھوٹا ملک کمال شمی سے بہت محبت کرتا ہے وہ عام رئیسوں کی طرح کا رنگین مزاج نہیں ہے شمی پر سوچ انداز میں آگے بڑھتی جاتی ہے۔

شمی سب سے نظر بچا کر چھوٹے ملک کے کمرے میں جاتی ہے ملک کمال شمی کو دیکھ کر بے تابی سے اس کی طرف بڑھ کر اس کا ہاتھ تھام لیتا ہے اور اسے یقین دلاتا ہے کہ ثمینہ سے شادی نہیں کرے گا وہ شمی کو بتاتا ہے کہ وہ اس سے بے حد محبت کرتا ہے اور اس کی خاطر اپنا گھر اور باپ کی جاگیر بھی چھوڑ سکتا ہے ۔مگر شمی کی محبت سے کسی صورت دست بردار نہیں ہوسکتا۔شمی کو کمال کی محبت پر یقین ہے۔

ملک اسفند یار کا اکلوتا بیٹا ملک کمال اسفند باہر سے پڑھائی کر کے آیا تھا۔پہلی نظر میں ہی شمی پر فریفتہ ہو گیا تھا۔شمی تھی بھی بہت حسین اور معصوم اس پر اسے حسن کو سجانے سنوارنے کا شوق بھی تھا ملک کمال دل کے ہاتھوں مجبور تھا وہ ذات پات اونچ نیچ اور نام نہاد سٹیٹس کے ناسور میں پڑ کر شمی کو کھونا نہیں چاہتا تھا۔

کمال کی پسندیدگی کا اندازہ ملکانی کو بھی ہو گیا تھا۔ اس نے ملک اسفند کے کان میں بھی یہ بات ڈال دی تھی وہ کسی کی کمین کی بیٹی کو بہو قطعی طور پر نہیں بنا سکتے تھے۔ اس لیے ملک کے کہنے پر ملکانی اپنی بھتیجی اور کمال کی بچپن کی منگ کو جلد از جلد بہو بنا کر لانا چاہتی تھی۔

شام کو جب سکی اور شمی تھکی ہاری ملکانی کے گھر سے لوٹنے لگیں تو ملکانی نے بچا ہوا کھانا ان دونوں کو دیتے ہوئے گہری نظریں شمی کے وجود پر گاڑھ کر طنزیہ بولی کہ مٹھائی بھی لیتی جانا شمی۔ ہم مرتبہ سے رشتہ جوڑا ہے۔ کمی کمین کا حسن تو ملک اور رئیس زادوں کے لیے عیش کا سامان ہوتا ہے اور تیری ماں۔۔۔ ہونہہ! اس نے بھی کچھ تیری طرح کے بہت اونچے خواب دیکھ لیے تھے ملکانی بننے کے خواب۔۔۔ مگر انجام کیا ہوا وہی ذلت اور موت۔۔۔ شمی شکست خوردہ قدموں سے گھر میں داخل ہوئی۔ دادی کے لیے کھانا نکال کر چارپائی پر رکھا اور بجھے بجھے کھوئے انداز میں پاس بیٹھ گئی۔

دادی نے شمی کو غور سے دیکھا اس کے چہرے پر تھکن اور فکر کے آثار نمایاں تھے۔ دادی شمی کو اس ذہنی حالت کو صبح کی ڈانٹ کا اثر سمجھ کر اس کو پچکارنے لگی اور اس کے سر میں تیل ڈالنے لگی تاکہ تھکن کم ہو جائے۔ شمی کے دماغ میں بہت سی گرہیں تھیں جو مسلسل اس کے دماغ میں کچوکے لگا رہی تھی۔

شمی نرمی سے بولی! دادی میری ماں کیسی عورت تھی۔ دادی پہلے تو ٹالتی رہی مگر پھر اس نے بتا دینا ہی بہتر سمجھا۔ شمسہ کا باپ دین محمد لوہار نہایت محنتی نیک اور شریف انسان تھا۔ اس کی نوراں انتہائی خوبصورت عورت تھی۔ گاؤں کی ساری عورتوں کی خوبصورتی ایک طرف اور نوراں کا ملکوتی حسن ایک طرف تھا۔

نوراں خوبصورت تو تھی مگر غضب یہ تھا کہ اس کو خوبصورت ہونے کا احساس بھی تھا خوبصورت ہونا ایک عام بات ہوتی ہے مگر خوبصورت ہونے کا احساس غالب ہونا ایک خطرناک بات ہوتی ہے وہ بھی چھوٹے طبقے کی عورت کے لیے۔

دین محمد نوراں کو خوش رکھنے اور اس کے نازنخرے اٹھانے کی پوری کوشش کرتا مگر نوراں کی طلب اور خواہش کہیں زیادہ تھی۔ دین محمد کی نوازش نوراں کے لیے اونٹ کے منہ میں زیرہ ثابت ہوتی۔

نوراں ملک اسفند کے گھر ملکانی کی خدمت پر معمور تھی۔ ملک اسفند نوراں کے حسن کا دیوانہ تھا اور وہ نوراں کی بے لگام خواہشات اور کمزوری سے آگاہ تھا جلد ہی گاؤں بھر میں نوراں کے ملک اسفند سے مراسم کا چرچا ہونے لگا۔ ایک دن اچانک نوراں کے غائب ہونے کی خبر پھیل گئی۔ دین محمد رسوائی، بیوی کی جدائی اور اس کی بے وفائی کے صدمے سے مر گیا۔ اماں رشیداں کا بھرا پرا گھر اجڑ گیا۔ اکلوتا بیٹا مر گیا۔ بہو رسوائی کا کالک پونچھ گئی۔ ایک دن آدھی رات اماں رشیداں کے گھر کا دروازہ بجا دہلیز پر اس کی پوتی بیٹھی رو رہی تھی۔ اسی دن نوراں کی لاش نہر سے ملی۔ شمی یہ سارا قصہ جو اس کا اپنا قصہ تھا سن کر ساری رات اضطراب میں ٹہلتی رہی آخر ایک فیصلہ کر کے مطمئن ہو گئی اس کو اپنی ماں کی غلطی کا قرض اپنی محبت کی قربانی سے چکانا تھا۔ اس سے اگلے دن شمی کو سکی سے پتا چلا کہ ملک کمال نے اپنی ماموں زاد ثمینہ سے شادی سے انکار کر دیا اور خود کو کمرے میں بند کر لیا ہے۔

شمسہ کی شادی اپنی حیثیت کے کمی کمین ذات کے لڑکے سے ہو گئی اور ملک اسفند یار کے گھر باہر سے بلوائے گئے بڑے بڑے ڈاکٹر اس کے پاگل بیٹے کا علاج کرنے آتے ہیں۔

ممتا

ڈاکٹر ایم۔اے فاروقی

رات کی تاریکی میں جوں جوں اضافہ ہورہا تھا ویسے ہی ثریا کی طبیعت کی ہول ناکی بڑھ رہی تھی۔ جاڑے کی طویل رات کیا گل کھلائے گی ثریا اس راز سے بھی بخوبی آگاہ تھی۔ چار کنال پر محیط حویلی جو شہر سے دو کلومیٹر کے فاصلہ پر واقع تھی، تاریکی میں خاموش نگر کا روپ دھارے ہوئے تھی۔ دن بھر یہاں میلے کا سا منظر رہا تھا لیکن رات اسی قدر ویران اور سنسان تھی۔ سردی کی شدت بڑھ رہی تھی لیکن ثریا موسم کی سختی سے بے نیاز گہری سوچوں میں گم دکھائی دے رہی تھی۔ یوں ہی آدھی رات گزر گئی، اچانک تیز سرد ہوا کے جھونکوں سے دروازے کے پٹ ہلنے لگے جن سے آواز پیدا ہوئی۔ ثریا کو محسوس ہوا کہ شاید کوئی اس کے کمرے کی جانب آیا ہے۔ خوف کے مارے وہ بوکھلا گئی اور کون ہے؟ کون ہے؟ کی صدا بلند کی لیکن کوئی جواب نہ ملا۔ وہ اٹھی اور دروازے کی جانب بڑھی ادھر ادھر نظر دوڑائی لیکن کوئی نہ تھا۔ اس نے سوچا شاید آنے والے خوف ناک وقت کی ابتدا ہو چکی ہے۔ اس نے دروازہ بند کیا اور چار پائی پر سرھک گئی۔ تھوڑی دیر بعد دروازے پر دستک ہوئی اس نے پوچھا کون ہے؟ جواب ملا ثریا پتر دروازہ کھولو۔ وہ دروازے کی طرف لپکی، دروازہ کھولا کہ سامنے اس کی ماں تھی۔ وہ بے ساختہ ماں کے سینے سے چمٹ گئی اور دل کا غبار آنسوؤں کے ذریعے نکالا۔

ماں بھی روئی لیکن جلد ہی سنبھل کر ثریا کے منہ پر ہاتھ رکھ کر بولی ابھی تیرا باپ اور بھائی شہر میں کسی جشن میں گئے ہیں۔ میرا خیال ہے دو تین گھنٹے بعد لوٹیں گے اور واپسی پر معمول کے مطابق نشے کی وجہ سے اوسان خطا ہوں گے، تب تک تم یہاں سے بھاگ سکتی ہو۔ میری بیٹی! تو اچھی طرح جانتی ہے صبح یہ دونوں تجھے بیچ دیں گے۔ تم جلدی سے عمران کو بلا لو اور اس صوبے سے ہی دور نکل جاؤ۔ ثریا کی خوف کے مارے سانس اکھڑ رہی تھی۔ اسے کچھ سمجھ نہ آ رہی تھی کہ کیا کرے۔ کچھ دیر توقف کے بعد اس نے ماں سے کہا، یوں تو بابا اور بھائی کی بدنامی ہوگی۔ میرے یہاں سے بھاگ جانے کا سارا ملبہ آپ پر آئے گا۔ نہیں ماں میں آپ کی اور اپنے خاندان کی عزت نہیں اچھال سکتی، زندگی کا زہر پی لوں گی۔ میں جانتی ہوں چودھری رشید بڑا بزنس مین اور بڑا سیاست دان ہے اور اس کی چوتھی بیوی بنوں گی۔ ماں بولنے لگتی ہے تو ثریا بات کاٹ کر کہتی ماں میں جانتی ہوں کہ وہ بھڑوا اپنی بیویاں اپنے سیاسی مقاصد کے لیے استعمال کرتا ہے، میں جانتی ہوں میں بھی ٹشو پیپر ہوں جس کا کام صرف استعمال ہونا ہے۔

ماں عورت تو ہوتی ہی قربانی کے لیے ہے۔ سب سے پہلے اپنی خواہشات کی قربانی، اپنے وجود کی قربانی، اپنی روح تک تو عورت کو قربان کرنا ہوتی ہے۔ تم نے بھی تو اپنا سب کچھ قربان کیا۔ تیس برس ہو گئے قربان ہوتے ہوئے، اب مجھے اس قربانی سے کیوں روک رہی ہو؟

ماں نے خوب قہقہہ لگا کر اپنے خاوند اور بیٹے کا ماتم کیا اور ثریا کو گلے لگا کر کہا، عزت کی بات کرتی ہو؟ جب صبح تمھیں تمھاری مرضی کے بغیر بیچا جائے گا اور بدلے میں جی ٹی روڈ والا پلازا لیا جائے گا تب تو خوب عزت ہوگی نا۔ پگلی یہ غیرت اور عزت جیسے ہتھیار اپنے مفاد کے حصول کے لیے بنائے گئے ہیں۔ تم جلدی سے عمران کو بلاؤ اور اس عذاب خانے سے بھاگ جاؤ نہیں تو صبح ایک مہذب کوٹھے کی بھینٹ چڑھ جاؤ گی۔ ایک ماں کی ممتا کیسے اپنی بیٹی کو غلاظت کی گہرائیوں میں اپنے ہاتھوں پھینکے۔ ثریا سے ماں کے آنسو نہ دیکھے گئے اور فوراً حویلی کی تاریکی سے نکل کر زندگی کے اجالوں کی طرف مائل ہوئی۔ اس نے فوراً عمران کا فون نمبر ملایا لیکن رابطہ نہ ہو سکا۔ تقریباً بیس منٹ بار بار اس کو

فون کال ملائی لیکن شاید وہ سو رہا تھا اس لیے کال نہ اٹھائی۔

عمران ثریا کا کلاس فیلو تھا اور دونوں نے ایک دوسرے کے ساتھ زندگی گزارنے کے عہد و پیماں کیے ہوئے تھے۔عمران ثریا سے ٹوٹ کر محبت کرتا تھا اور اس سے شادی کرنے کی قسم کھائی تھی۔عمران کے فون کال نہ اٹھانے سے دونوں ماں بیٹی پریشان ہوگئیں۔کافی دیر دونوں خاموش کھڑی رہیں۔چالیس منٹ بعد ثریا نے دوبارہ کال کی۔اس بار اس سے رابطہ ہوگیا،ثریا نے عمران کو تمام بات بتائی اور اس کو فوراً حویلی کے عقبی دروازے کے پاس آنے کا کہا۔عمران نے تمام بات سن کر ثریا کو بیوقوف اور پاگل کہہ کر حامی نہ بھری اور فون بند کر دیا۔ماں نے فوراً ثریا سے استفسار کیا کہ کتنی دیر میں آئے گا لیکن وہ بالکل خاموش بے حس و حرکت کھڑی تھی۔اس کا جی چاہ رہا تھا کہ پھوٹ پھوٹ کر روئے لیکن آنسو عمران کی طرح ساتھ چھوڑ گئے تھے۔

ثریا نے ماں سے کہا مجھے چودھری رشید سے شادی منظور ہے۔طنزیہ ہنسی کے ساتھ اس کے لہجے میں کڑواہٹ نمایاں تھی۔عمران ہو یا رشید دونوں میں کوئی فرق نہیں۔میرا باپ بھی تو رشید ہے،میرا بھائی بھی تو عمران کا کردار ادا کر رہا ہوگا۔مجھے بھاگ کر کہیں نہیں جانا۔عمران نے ٹھکرا دیا اب رشید سے بھی ہاتھ نہیں دھونا چاہتی۔اس کے بعد ماں،بیٹی دیر تک روتی رہیں۔اسی اثنا میں حویلی کی بڑی گھڑی نے تین بجنے کی آواز لگائی۔آواز سے دونوں کے دل تیزی سے دھڑکنے لگے،ماں نے کہا میری بیٹی یہاں سے نکل جا۔چلی جا یہاں سے،میں اپنی آنکھوں کے سامنے تمہارا سودا ہوتا نہیں دیکھ سکتی۔ثریا نے ہنستے ہوئے کہا میری معصوم ماں کہاں جاؤں؟ عورت کہاں جا سکتی؟ جہاں بھی جاؤں گی انہی کرداروں سے پالا پڑے گا۔کچھ دیر خاموشی رہی،پھر بولی،ماں میرے پاس اس مصیبت سے چھٹکارا حاصل کرنے کا بہت آسان حل موجود ہے،تم مجھے اپنے ہاتھوں سے زہر دے دو۔میں روز روز نہیں مروں گی اور تم بھی نہیں مرو گی۔اس میں ہی ہم دونوں کی بھلائی ہے۔دونوں کی زندگی ایک زہر کے پیالے میں پوشیدہ ہے۔ماں!یوں میری موت نہیں ہوگی،خدا کے لیے مجھے زہر دے دے۔ماں تمہارا مجھ پر احسان ہوگا مجھے زہر کا ایک جام دے دے۔یوں مجھے نئی زندگی ملے گی۔ایسی لازوال زندگی جو کبھی ختم نہ ہوگی،ایسی پرمسرت زندگی جس میں کوئی غم نہ ہوگا۔ماں تامل سے ثریا کی باتوں کو سنتی رہی پھر اس کو زہر پلانے کے لیے آمادہ ہوگئی۔اس کے بعد دونوں کے چہروں پر مصنوعی مسکراہٹ نمودار ہوئی لیکن سر پر غم کے سائے منڈلانے لگے۔تھوڑی دیر بعد حویلی کے مرکزی دروازے پر گاڑی کے ہارن کی آواز آئی۔ماں فوراً کمرے سے باہر نکلتے ہوئے ثریا سے بولی کہ صبح آؤں گی۔تب تک رو لو پھر اس کے بعد آنسو ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائیں گے۔

ثریا کی ماں فوراً اپنے کمرے میں آ گئی اور بستر پر دراز ہوگئی۔چند ساعتوں بعد اس کا خاوند کمرے میں نمودار ہوا جو نشے سے چور تھا۔ثریا کی ماں کو گالیاں دیتے ہوئے چائے بنانے کا حکم جاری کیا۔رات کے تیسرے پہر کوئی ملازم یہاں موجود نہ تھا۔وہ عاجزی سے اٹھی اور چائے بنانے کے لیے باورچی خانہ کی طرف چل دی۔باورچی خانے کے قریبی کمرے سے بیٹے نے آواز دی کہ او پاگل بے بے مجھے بھی چاہ دے۔تھوڑے وقت بعد ماں نے باپ اور بیٹے کو ہنسی خوشی چائے دی اور اپنے بستر پر بیٹھ گئی۔

صبح آٹھ بجے کے قریب ثریا کے کمرے میں ملازمہ روتے ہوئے نمودار ہوئی! غضب ہوگیا اے باجی،غضب ہوگیا۔سیٹھ جی اور صاحب جی کو رات کسی نے زہریلی شراب پلا دی جس کی وجہ سے دونوں مر گئے ہیں۔ثریا روتے ہوئے دوڑی،باپ اور بھائی کی لاش کے قریب پہنچی جہاں اس کی ماں بیٹھے رو رہی تھی۔اس کی آنکھوں میں آنسوؤں سے زیادہ ممتا دکھائی دے رہی تھی۔

مزاحیات

سالانہ
مشاعرہ

سالانہ
مشاعرہ

سالانہ
مشاعرہ

سالانہ
مشاعرہ

سالانہ
مشاعرہ

سالانہ
مشاعرہ
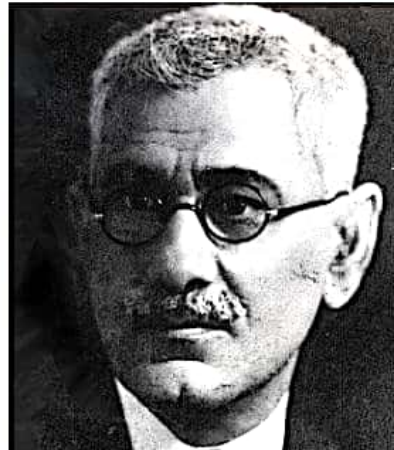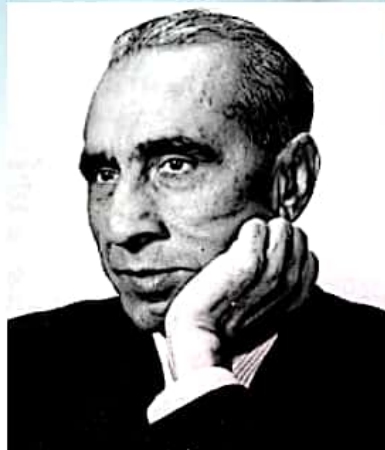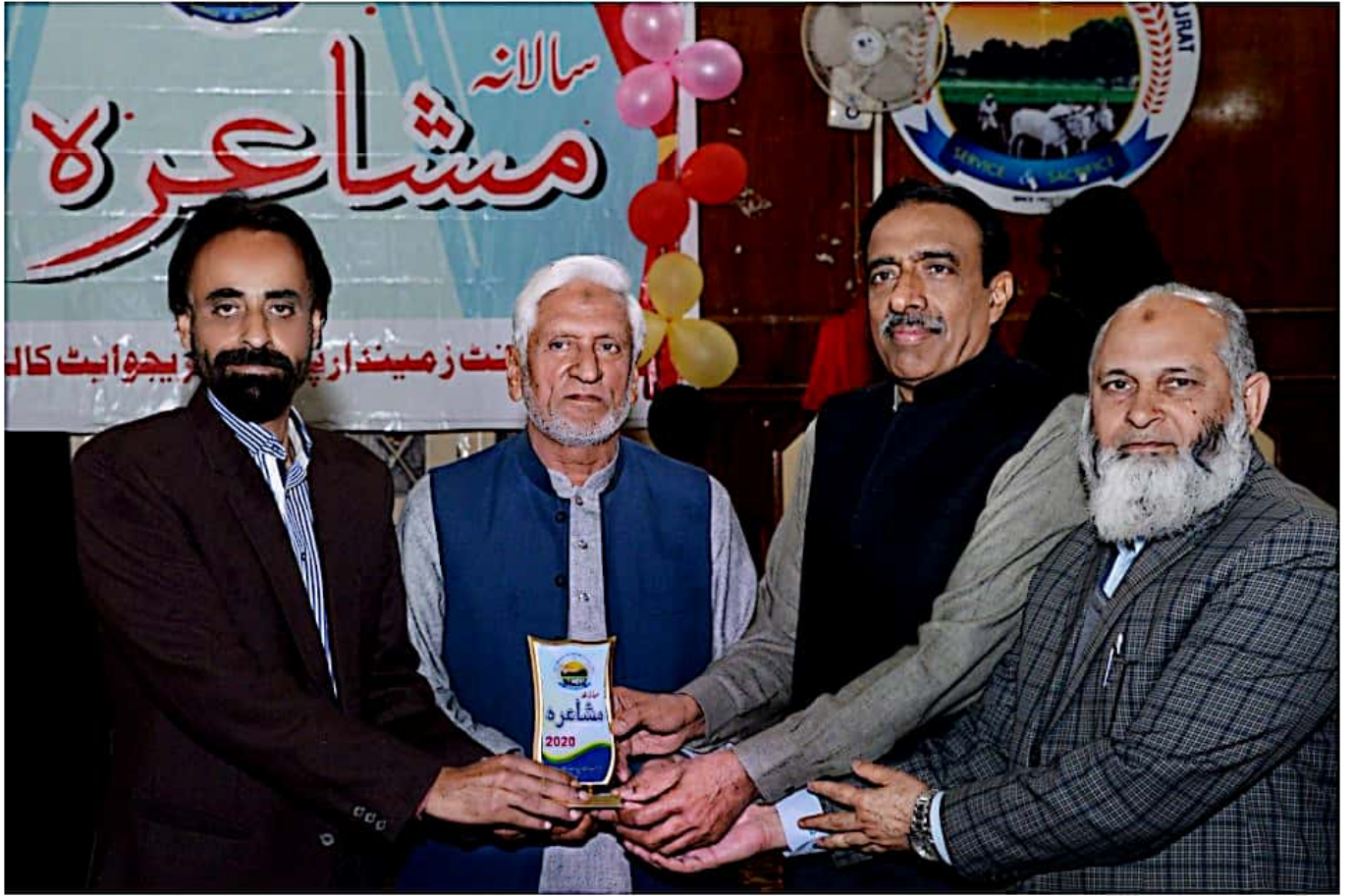
زمیندار کالج برائے خواتین و حضرات

سید وقار افضل

استاد کا کہنا ہے ''اگرچہ گورنمنٹ زمیندار پوسٹ گریجوایٹ کالج، بھمبر روڈ گجرات، قیامِ پاکستان سے دس سال پہلے یعنی 38-1937 میں معرضِ وجود میں آچکا تھا لیکن اسے تاریخی حیثیت اب کہیں جا کر حاصل ہوئی ہے۔ کیونکہ مورخین کے مطابق اداروں کی کارکردگی اپنی جگہ لیکن تاریخ میں کسی ادارے کو تاریخ ساز قرار دینے کے لیے مورخ کو کم از کم ستر اسی (80) سال انتظار کرنا پڑتا ہے۔ میاں! یہ تاریخ کی بے رحمی کا جبلی تقاضا ہے''۔ ''استاد جی! آپ کی یہ ساری باتیں درست ہیں، لیکن ہمیں تو عالمی تاریخ کے اس بے رحم رویے سے ڈر لگتا ہے کہ جب کوئی تاریخی چیز پرانی ہونے لگتی ہے تو اسے عموماً میوزیم میں سنبھال کر رکھ دیا جاتا ہے تا کہ آیندہ نسلوں کو بتایا جا سکے کہ پہلے ہم ایسے تھے اور اب ایسے نہیں۔ اس لیے جو اکھاڑنا ہے اکھاڑلو''۔ ہماری اس تشویش پر استاد پیڑھی نے ہمیں بتایا کہ زمیندار کالج گردشِ ماہ و سال کے تھپیڑے کھا کھا کر اور اپنی کارکردگی دکھا دکھا کر تاریخی ضرور ہوا ہے لیکن پرانا نہیں۔ اس لیے کسی بھی صاحبِ اختیار کے لیے یہ ممکن نہیں کہ وہ اس عظیم درسگاہ کو عمارت سمیت بھمبر روڈ گجرات سے اٹھا کر مال روڈ لاہور کے میوزم میں سجا سکے۔ اور اگر کبھی ایسا کرنے کی کوشش کی بھی گئی تو انتظامیہ کو منہ کی کھانا پڑے گی کیونکہ عجائب گھروں کی صدیوں پرانی تاریخ میں، ابھی تک کسی بھی تاریخ ساز عمارت کو حجمیاتی پھیلاؤ کی وجہ سے عجائب گھروں میں رکھنے کی کوشش نہیں کی گئی اور اگر کبھی ایسی مثال قائم کرنے کی کوشش کی بھی گئی تو پاکستان میں سب سے پہلے شاہی قلعہ لاہور اور پنجاب یونیورسٹی اولڈ کیمپس کو میوزم کی زینت بنانا پڑے گا۔ فی الحال پاکستان میں یہی دو ایسی عمارتیں ہیں جو تاریخیت اور آثارِ قدیمیت کی تعریف پر پوری اترتی ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ اس طرح کے تاریخی عجوبے جب عہدِ نو کے تقاضوں کو پورا کرتے کرتے تھک جاتے ہیں، تب سرکار انھیں عجائب گھروں میں شیفٹ کرنے کی بجائے، خود انھیں میوزم کا درجہ دے دیتی ہے اور محکمہ مالیات کے کندھوں سے ان سفید ہاتھیوں کو اتار دیتی ہے۔ میاں! سرکار جانتی ہے کہ مرے ہوئے ہاتھی کی قیمت سوا لاکھ اور زندہ مفت میں بھی مہنگا ہوتا ہے۔

یاد رہے، زمیندار کالج تاریخی ہونے کے باوجود ابھی تک پرانا نہیں ہوا۔ اس کا سبب یہ ہے کہ اسے ہر سال تعلیمی سیشن کے آغاز سے پہلے چونا لگایا، لگوایا اور پھروایا جاتا ہے۔ کچھ سال پہلے اس کے در و دیوار کو نیا روپ دینے کے لیے، اس کے پرانے مگر تاریخی گیری رنگ کو بدل کر آف وائیٹ کر دیا گیا۔ اگرچہ ابھی تک مورخین کو اس چونا لگوائی کی معقول وجہ سمجھ میں نہیں آئی لیکن یہ قیاس آرائیاں زبان زدِ عام ہیں کہ اس ادارے کے تاریخی پیراہن کو بدلنے کے دوران میں، تاریخ نے صاحبانِ پتلون و کوٹ کے سامنے، اس روغنیاتی تبدیلی سے باز رہنے کے لیے، ایک دو دفعہ ہاتھ بھی جوڑے، لیکن وہ ہٹ کے پکے تھے، باز نہ آئے۔ شاید رنگ تبدیل کرانے والوں کا یہ خیال ہو کہ اس کارہائے نمایاں کی بدولت، ان کا نام بھی تاریخ کے کسی کونے کھدرے میں لکھا جائے گا۔ بہر حال اب زمیندار کالج کے تاریخی رنگ کو پرانی تصاویر ہی میں دیکھا جا سکتا ہے۔ عین ممکن ہے، صاحبانِ پتلون و کوٹ چاہتے ہوں کہ اب اس درس گاہ کی تاریخی حیثیت کے تعین کے لیے مورخین اس کی پرانی تصویروں سے رجوع کریں اور اس کا اصل رنگ ڈھنگ ڈھونڈنے کے ساتھ ساتھ، ان افراد کی نشان دہی بھی کریں جو تبدیلیِ رنگ و روغن جیسے کارِ خیر میں پیش پیش تھے۔ میاں! تاریخ کا حصہ بننا آسان کام تھوڑی ہے۔ اتنی پینترے بازی تو ضروری ہے۔ ویسے بھی تاریخی شعور

کے فروغ کے لیے اس نوع کی چھوٹی موٹی حرکتیں، برکت کے لیے کرنی پڑتی ہیں تا کہ جستجوِ پیہم اور تحقیقی کارگزاریوں کی فطری راہ ہموار رہے اور جمالیاتی نشوونما کے در کھلے رہیں۔

یہ بات اب بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ اسّی (80) کی دہائی سے پہلے زمیندار کالج صرف لڑکوں کا کالج تھا۔لیکن اسی ((80 کی دہائی کے آغاز سے چند سال بعد جب ایم اے کی کلاسز کا آغاز ہوا تب اس ادارے کی سرزمین، پہلی دفعہ نسائی قدموں کی پرکیف خرام آرائیوں سے آشنا ہوئی۔اور اب صورتِ حال یہ ہے کہ اس ادارے میں صبح وشام طلبہ وطالبات قدرتی گلزاروں میں مل جل کر گلگشت کرتے دکھائی دیتے ہیں اور ایک گھاٹ پر پانی پیتے ہیں۔اس لیے بعض من چلے اس ادارے کو''دل پشوری'' کے واسطے" گورنمنٹ زمیندار پوسٹ گریجوایٹ کالج برائے خواتین وحضرات، گجرات" کہہ کر سوہنی اور مہیوال کے رومان پرور قصے کو اپنے تخیل میں مجسم کر لیتے ہیں۔

صاحب زادے! اب کسے کیا خبر؟ اب تو صرف تاریخ ہی جانتی ہے کہ یہ تاریخی درس گاہ کسی عہد میں ایک ایسے دور سے بھی گذری ہے، جس میں طلبہ وطالبات کے لیے یونیفارم کی پابندی لازم نہیں تھی۔کم از کم اس معاملے میں وہ مرضی کے مالک تھے۔چنانچہ اُس سنہرے دور میں طلبہ وطالبات کے رنگارنگ ملبوسات کی وجہ سے عام آدمی کا دھیان کیاریوں میں لگے پھولوں کی طرف کم ہی جاتا تھا۔اور شاید اسی لیے بادِ بہاری کے اُس موسم میں انتظامیہ نے بھی پھول، پودے لگانے چھوڑ دیے۔جب یہ سلسلہ کچھ عرصہ یونہی چلا تو زمیندار کالج، جنگل میں منگل کا سماں پیش کرنے لگا۔اس صورتِ حال میں، صاحبانِ دال وحلیم کو یہ فکر دامن گیر ہوئی کہ کہیں اس ملبوساتی گہماگہمی میں لینے کے دینے نہ پڑ جائیں۔اور اگر کہیں کچھ ایسا ویسا ہو گیا تو یہ زمیندار کالج کی تاریخی حیثیت کے لیے ایک بہت بڑا دھچکا ہوگا۔صاحبانِ دال وحلیم کے اسی اندیشہ کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے کالج انتظامیہ سر جوڑ کر بیٹھ گئی اور بیک جنبشِ قلم یہ فیصلہ صادر کر دیا گیا کہ جو طلبہ وطالبات پراسپیکٹس میں تجویز کردہ یونیفارم کی پابندی نہیں کریں گے ان کو جرمانہ کیا جائے گا۔جب جرمانوں کا یہ سلسلہ چلا تو ابتدا میں اس مد میں اتنے پیسے جمع ہوئے کہ کالج انتظامیہ نے ایک ٹریکٹر خرید لیا۔اور کالج کے جن مقامات پر جنگل میں منگل کا خطرہ تھا وہاں ہل پھروا کر پھول پودے لگوا دیے۔اس طرح عرصہ بعد زمیندار کالج کی راہ داریوں اور روشوں پر خوش خرام ملبوساتی گلابوں کے چہچہوں اور قہقہوں کی بجائے ایک بار پھر کیاریوں سے گلِ خوش رنگ کی خوش بو اور برگِ گل کی رعنائیاں، جنگل کو چمنستان بنانے لگیں۔ہائے ہائے یار! اس مقامِ فکر پر ذرا ٹھہرو! قوتِ شامہ کو معطر کرنے والے پھول تو کھلے لیکن ہوش اڑانے والوں نے نقاب اوڑھ لیے۔

برخوردار! جیسے ہی زمیندار کالج میں یونیفارم کی پابندی مردوزن پر لازم ہوئی خواتین طالبات نے احتجاجاً برقعے پہننے شروع کر دیے اور مرد طلبہ نے چھوٹی چھوٹی ڈاڑھیاں رکھ لیں۔ابتدا میں یہ دونوں کام احتجاجاً ہوئے لیکن کچھ عرصے بعد مذکورہ دونوں احتجاج طلبہ کے لغات میں سہولت قرار پائے۔وہ اس طرح کہ طالبات کو مشاطاوں سے نجات ملی اور مرد طلبہ روز کی ڈاڑھی منڈھائی کے جنجال سے آزاد ہوئے۔اب تو اکثر طالبات کے بارے میں سننے میں آتا ہے کہ انھوں نے صبح سویرے منھ دھونا چھوڑ دیا ہے کہ اس موئے نقاب سے کسی کو کیا دِکھتا ہے۔اس مقامِ مفکر پر یہی کہا جاسکتا ہے۔" کوئی دکھلائے کہ ہم دکھلائیں کیا۔۔۔؟

زمیندار کالج کی قدیم تاریخی عمارت میں اب نیا تعلیمی نظام (بی۔ایس پروگرام) متعارف ہو چکا ہے۔اس پر صاحبانِ دال وحلیم کا کہنا ہے "اب تو نئے نئے گل کھلا کریں گے اور کالج میں دیگر کھیلوں کے ساتھ ساتھ ''لکن میٹی'' کا چلن عام ہوگا اور اس روایتی کھیل کی کشا کش

میں اس اندونخنے کی صدائیں جگہ جگہ سے سنائیں دیں گی۔

میں تے اونہوں تھاں تھاں لبھیا لا کے پورا زور
اوہدی میٹی آئی تے اونہے لبھ لیا کوئی ہور
عامر غفار گورسی

ایک صاحب بولے "بس اتنا نہیں، آیندہ کالج کی راہ داریوں، چوراہوں، سبزہ زاروں اور ویرانوں میں صبح وشام فراق گورکھپوری کا یہ شعر بھی گونجا کرے گا۔

ذرا وصال کے بعد آئنہ تو دیکھ اے دوست
ترے جمال کی دوشیزگی نکھر آئی

یہ سن کر صاحبانِ سگرٹ و چائے اس شعر کے نشے میں مدہوش ہوئے اور کہنے لگے "یہی تو وہ ہم نصابی سرگرمیاں ہیں جو نصاب کو زیادہ بامعنی بناتی ہیں" اور ساتھ ہی ساتھ، وہ عالمِ وجد و سرور میں باہم مل کر کہنے لگے "ہم نہ کہتے تھے :" ''رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن''

زمیندار کالج میں جس تیز رفتاری سے طلبہ کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے۔ اس حوالے سے کالج کے انتظامی عہدوں پر مامور پنڈتوں کا کہنا ہے کہ چند سالوں بعد کلاس رومز کم ہونے کی وجہ سے طلبہ بھمبر روڈ کے وسط میں صفیں باندھ کر تعلیم کے زیور سے آراستہ ہوا کریں گے اور اساتذہ کالج کی جامع مسجد کے لاؤڈ سپیکر سے لیکچر دیا کریں گے۔

گجرات شہر کے پرانے جغرافیائی نقشوں سے اندازہ لگایا جاسکتا کہ زمیندار کالج اپنے ابتدائی زمانے میں گجرات کے مرکزی شہر سے باہر واقع تھا۔ آج بھی ایسا ہی ہے، لیکن اب ایک شہر اس کے اندر بھی آباد ہو چکا ہے جو باہر کے شہر سے متصادم ہے۔ اب ان دو شہروں کی باہمی کشاکش کے باعث عموماً تشنگانِ علم اس عظیم درسگاہ سے سیرابیِ علم کے بعد رزق کی فراوانی کے لیے مجبوراً سمندر پار جاتے ہیں اور اکثر وہیں کے ہو رہتے ہیں۔ اور جو واپس آجاتے ہیں، وہ باقی ماندہ زندگی پلازے، ہوٹل اور تعلقات بنانے میں گزار دیتے ہیں۔ بھئی! انھوں نے اپنے گاؤں یا محلے میں یہ بھی تو بتانا ہے : ہم بھی ہیں پانچ سواروں میں۔

بہر حال یہ ساری باتیں اپنی جگہ لیکن یہ سچ ہے کہ زمیندار کالج تاریخی ہونے کے باوجود قدیم نہیں ہوا۔ کیوں کہ صاحبانِ علم و دانش کا کہنا ہے کہ ضلع گجرات میں آج بھی جہاں جہاں علم کے چراغ روشن ہیں، وہاں وہاں زمیندار کالج جگمگا رہا ہے اور جن مقامات پر ایسا نہیں وہاں یونان کا پیسہ دندنا رہا ہے۔

☆☆☆☆

میرے اساتذہ

ثروت فاطمہ

ایم اے اُردو سالِ دوم

حقیقی اساتذہ وہی ہوتے ہیں جو طلبہ کو ان کی صلاحیتوں اور قابلیت سے آگاہ کرتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ استاد شمع کی مانند ہوتا ہے جو خود کو جلا کر دوسروں کے لیے راستہ روشن کرتا ہے۔ زمیندار کالج کے شعبہء اردو کے تمام اساتذہ علم کا سمندر ہیں۔ میں اپنے مضمون کا آغاز ایک ایسی شخصیت سے کروں گی جو ہر شعبہ میں ماہر ہیں۔ تو جی آپ پہچان تو گئے ہوں گے یہ ہیں شعبہء اردو کے قابلِ قدر معلّم جناب **پروفیسر حافظ محمود اختر**۔ سر حافظ کی شخصیت رعب دار بھی ہے اور خوش مزاج بھی۔ ان کی مزاح کی حس بڑی تیز ہے باتوں ہی باتوں میں مزاح کی کیفیت پیدا کر دیتے ہیں۔ اور مزاح بھی ایسے انداز میں کرتے ہیں کہ طلبہ قہقہے لگانے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ ان کے چہرے پر ہمیشہ ہلکی سی مسکراہٹ ہوتی ہے۔ سر جب پہلے دن کلاس میں آئے تو آ کر طلبہ سے پوچھا کہ آپ میں سے کوئی حافظ یا حافظہ ہے کہ ساریاں دا اللہ ہی حافظ اے۔ سر کے بات کرنے کا انداز ایسا منفرد ہے کہ ان کی ڈانٹ میں بھی باپ کی شفقت نظر آتی ہے۔

اتنا مانوس ہوں سناٹے سے
کوئی بولے تو برا لگتا ہے

لڑکیاں اپنی عادت سے مجبور ہوتی ہیں بولے بغیر ان سے رہا نہیں جاتا اور اگر کلاس سر حافظ کی ہو تو پھر کسی نہ کسی کو کوئی نہ کوئی بات ضرور یاد آ جاتی ہے۔ سر کے پڑھانے کا طریقہ یہ ہے کہ جب وہ پڑھا رہے ہوں تو کلاس میں مکمل خاموشی ہو، ذرا سی سرسراہٹ ہو تو آواز سر تک پہنچ جاتی ہے۔ ہر دومنٹ کے بعد سر نے یہ جملہ دوہرانا ہوتا ہے ''او چپ وی کر جاؤ''۔ تھوڑی دیر کے لیے خاموشی ہوتی ہے لیکن فیر کسی نوں ڈاہڈی گل یاد آ جاندی اے۔ سر کے پڑھانے کا انداز مجھے بہت اچھا لگتا ہے وہ ہمیں عربی، فارسی اور اقبالیات پڑھا رہے ہوتے تھے لیکن ساتھ دوسرے شعبوں کے بارے میں بھی بتاتے ہیں جس سے ہمارے علم میں اضافہ ہوتا ہے۔ ایک دفعہ سر ہم سے ناراض ہو گئے پھر جب سر کا غصہ دیکھا تو اللہ۔۔۔۔۔۔ توبہ۔۔۔۔۔۔ اتنا غصہ۔۔۔۔۔۔ جیسے کہ میں نے پہلے ذکر کیا کہ ڈانٹ میں باپ کی شفقت نظر آتی ہے ویسے ہی غصے کا اظہار بھی بالکل باپ جیسا کیا۔ لیکن جلد ہی مان بھی گئے۔ آج کے دور میں اگر اشفاق صاحب کے بابوں کی تلاش کی جائے تو سر حافظ بھی ان میں سے ایک ہیں۔ ''کچھ تو کرونا'' ''بچے پڑھا کریں'' ''قسم سے کوئی حال نہیں آپ کا'' ''بہت سے بچے تو ڈھنگ ٹپاؤ مہم کے تحت آئے ہوئے ہیں''۔ سر حافظ عموماً ہمیں ان الفاظ کے ساتھ خراجِ تحسین پیش کرتے **پروفیسر حسن نوشاہی صاحب** جو ہمیں اقبالیات پڑھاتے ہیں۔ سر کا لہجہ گرج دار، انداز خطیبانہ، اور آواز بہت پُرسوز ہے۔ اور جب سر اقبال کا کلام پڑھتے ہیں تو وہی سوز و گداز اور تڑپ جو اقبال کی شاعری میں ہے سر کے لہجہ میں بھی اتر آتی ہے۔ بہت ہی پُرخلوص انداز میں پڑھاتے ہیں لیکن ہم بھی ان کے احسان کا بدلہ اسی لمحے چکا دیتے ہیں۔ جتنے خلوص اور ایمانداری سے وہ پڑھاتے ہیں اتنے ہی خلوص اور ایمانداری سے ہم ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے نکال دیتے ہیں کہ کہیں ہم پر اقبال کے افکار کا اثر نہ ہو جائے۔ کیونکہ اگر اقبال کے افکار کو سمجھ لیا تو پھر تو ہم سدھر جائیں گے اور اگر ہم سدھر گئے تو معاشرے کا کیا ہوگا اسے کون سنبھالے گا۔

اُٹھ کر تو آگئے ہیں وہ تیری کلاس سے مگر
کچھ دل ہی جانتا ہے کہ کس دل سے آئے ہیں

پہلے ہمیں اقبالیات سر حافظ پڑھاتے تھے لیکن جیسے ہی سردیوں کا موسم آیا تو سر نوشاہی نے پڑھانا شروع کر دیا۔ جیسا کے سب جانتے ہیں کہ سردیوں میں چیزیں سکڑ جاتی ہیں ایسے ہی ہماری کلاس بھی سکڑ گئی۔ ۶۰ کی تعداد سر کی کلاس تک پہنچتے پہنچتے صرف ۳۰ رہ جاتی۔ لیکن اس میں بچوں کو موردِ الزام نہیں ٹھہرانا چاہیئے کیونکہ یہ تو موسم کی تبدیلیوں کے عین مطابق تھا۔ کلاس چاہے ۶۰ کی ہو یا ۱۰ کی سر کی آواز کا آہنگ ہمیشہ بلند رہتا ہے۔ اکثر ایسا لگتا ہے سر ساتھ والی کلاس کو بھی ہمارے ساتھ پڑھا رہے ہیں۔ اس لیے ان کی آواز کانوں میں سے گزر جاتی ہے سر کی ایک بات مجھے بہت اچھی لگتی ہے وہ یہ ہے کہ سر ہمارے تلفظ کی طرف بڑا دھیان دیتے ہیں اور ہماری غلطیوں کو درست کرتے ہیں۔ ان کی کلاس میں بیٹھ کر لگتا ہے کہ واقعی ہم ایم اے کے طالب علم ہیں۔ سر جو بات کرتے ہیں دلائل کے ساتھ کرتے ہیں۔ جو کہ ہمارے لیے بہت فائدہ مند ہے۔ اور ''اب جس کے جی میں آئے وہی پائے روشنی''۔ اگر ان دو شخصیات کے ساتھ پروفیسر خالد فیاض صاحب کا ذکر نہ کیا جائے تو ناانصافی ہوگی۔ جب یہ تینوں اساتذہ اکٹھے آ رہے ہوں تو ہم کہتے ہیں کہ زمیندار کالج کے شعبہء اردو کا ایک دبستان آ رہا ہے۔ حالانکہ تینوں اساتذہ الگ الگ مکتبہء فکر سے تعلق رکھتے ہیں۔ اول الذکر کا تعلق روحانیت پسند اور موخر الذکر کا تعلق پوچھ کر بتاؤں گی۔۔۔۔۔

میرے کمرے میں کتابوں کے سوا کچھ بھی نہیں

سر خالد فیاض بہت سادہ مزاج ہیں۔ اور بہت سے طلبہ کے آئیڈیل بھی۔ جب میں نے ان کے بارے میں لکھنا شروع کیا تو سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا لکھوں تو ایک دم دھیان سامنے پڑی کتابوں پر گیا۔ سر کتابیں پڑھنے اور خریدنے کے بڑے شوقین ہیں۔ میرے خیال میں اگر ان کا بس چلے تو کتابوں کے عوض اپنا گھر بھی گروی رکھوا دیں۔ ان سے متاثر ہو کر ہم نے بھی کتابیں خریدنی تو شروع کر دی ہیں لیکن پڑھنے کا شوق ابھی تک پروان نہیں چڑھا۔ ''بس بھئی، بس بھی کر دیں''، ''کیا ہو گیا ہے آپ کو'' ''ایک تو یہ خواتین بولتی بہت زیادہ ہیں'' ''اب جو بولا اس کو فائن کیا جائے گا اور اس فائن سے کلاس کے لیے کتابیں منگوائی جائیں گی''۔ لو جی اب بولنے پر بھی کتابیں پڑھنی پڑیں گی۔ اس کے بعد کلاس میں خاموشی۔۔۔ اس طرح تو عورتیں بھی سیل پر بھاگ بھاگ کر نہیں جاتیں جس طرح سر کتابوں کے سیل میلے پر بھاگ کر جاتے ہیں۔

ان کتابوں نے بڑا ظلم کیا ہے مجھ پر	ان میں اک رمز ہے جس رمز کا مارا ہوا ذہن
زندگی میں کبھی آرام نہیں پا سکتا	مژدہء عشرتِ انجام نہیں پا سکتا

(جون ایلیا)

''ہاں جی'' اب ذرا ان کے پڑھانے کے انداز پر بات کر لیتے ہیں۔ سر کا سبجیکٹ چونکہ تنقید ہے اس لیے وہ ہر چیز کا جائزہ بھی ناقدانہ انداز میں لیتے ہیں۔ اور نقاد کا کام تخلیق اور معاشرے پر تنقید کرنا ہے اس لیے سر ہمیں ادبیات کے ساتھ ساتھ سماجیات بھی پڑھا دیتے ہیں۔ تو جناب، گرمیوں کا موسم آ گیا ہے۔ اور گرمیاں لیموں کے پانی کے بغیر ادھوری سی لگتی ہیں۔ لیموں سے مجھے ایک نہایت ہی قابلِ قدر شخصیت یاد آ گئی۔

نئیں خاور اج وی آون والا آیا
میرے لیموں نچوڑے رہ گئے نے (خاور)

پروفیسر خاور مہدی صاحب ہمیں میرؔ کم اور غالبؔ زیادہ پڑھاتے ہیں۔ غالبؔ سے تو ان کی دلی وابستگی ہے لیکن میرؔ سے کیا دشمنی ہے اس کا ہمیں نہیں پتہ۔ "یوں ہی کرلیں وہ یوں اگر خوش ہیں"۔ شاید سر ہمیں یہ سکھانا چاہ رہے ہوں گے کہ اگر اس معاشرے میں زندہ رہنا ہے تو غالب کی طرح رہو ورنہ میر تقی میر جیسے لوگ تو ساری زندگی" رو" کر گزار دیتے ہیں۔ سر کے سمجھانے کا انداز بہت اچھا ہے۔ غالب جو کہ مشکل پسند شاعر ہے، سر غالب کے اشعار کی تشریح اس انداز سے کرواتے ہیں کہ شعر کی سمجھ آجاتی ہے اور وہ بآسانی یاد ہو جاتا ہے۔ غالب کو پڑھاتے پڑھاتے انہیں اکثر اپنے اشعار بھی یاد آجاتے ہیں۔ اس دوران میں سر کہتے ہیں کہ غالب کی زمین پر میرا ایک شعر ہے۔ کبھی کبھار ایسا لگتا کہ انہوں نے غالب کی زمین پر اپنی عمارت تو نہیں تعمیر کر لی۔ خیر یہ تو مزاح تھا سر بہت "عظیم شاعر" ہیں۔ غالب کی زمین پر ان کی ایک غزل کا شعر ملاحظہ ہو؛

حقیقت میں آنا نہ جانا کسی کا
خیالوں میں نقشِ قدم دیکھتے ہیں (خاور)

سر کے بیٹھنے کا انداز کچھ اس طرح کا ہے کہ جیسے ابھی اٹھ کھڑے ہوں گے۔ ہم بھی سارا پیریڈ اسی انتظار میں گزار دیتے ہیں۔ پڑھاتے بڑے دھیمے لہجے میں ہیں کہ کبھی کبھار تو غالب بھی نہایت مسکین نظر آنے لگتا ہے۔

رات بھر جاگتا رہتا ہوں اساطیر کے ساتھ
صبح دم رقص ہے اور رقص بھی زنجیر کے ساتھ (وقار)

تعلیم کے ابتدائی مراحل سے لیکر اختتام تک اللہ نے مجھے ایسے اساتذہ سے نوازا ہے جنہوں نے ہر مرحلے پر میری رہنمائی اور حوصلہ افزائی کی اور آج میں جو بھی ہوں انھی اساتذہ کی وجہ سے ہوں جنہوں نے مجھے اعتماد دیا۔ کیونکہ میرے خیال میں اگر کوئی استاد طالب علم سے یہ کہے کہ " آپ کر سکتے ہو" اور اگر وہ طالب علم اس قابل نہ بھی ہو تب بھی اسے اس بات کا احساس ہو جاتا ہے کہ میرے اندر قابلیت موجود ہے۔ انہی اساتذہ میں **پروفیسر سید وقار افضل** صاحب شامل ہیں۔ سر کو دیکھ کر ولی دکنی کا شعر یاد آجاتا ہے

تعریف ترے قد کی الف وار سریجن
جا سرو گلستاں کوں خوش الحاں سوں کہوں گا

سر اپنی کلاس کا ماحول نہایت خوشگوار رکھتے ہیں بچوں کے ذہن میں امتحان کا جو خوف ہوتا ہے اس کو ختم کر کے اس انداز سے پڑھاتے ہیں کہ بوجھ محسوس نہیں ہوتا اور لیکچر بآسانی سمجھ میں آجاتا ہے۔ کیونکہ اچھے اساتذہ کتابوں سے نہیں دل سے پڑھاتے ہیں۔ سر وقار افضل کا نام ہی ان کی شخصیت کو بیان کر دیتا ہے۔ آپ واقعی "وقار افضل" ہیں۔ سر کا لہجہ ادیبوں والا ہے۔ انہیں اگر میں زمیندار کالج کا "ضیا محی الدین" کہوں تو بے جا نہ ہوگا۔ کالج کی تقریبات کے دوران میں جب سر اسٹیج پر بول رہے ہوتے ہیں تو ایسا لگتا ہے کہ ضیا محی الدین صاحب زمیندار کالج آگئے ہیں۔

ایک پہچان کے حیرت میں چلی جاتی ہے
میرے جیسے تو کئی لوگ بلائے گئے تھے (عامر)

ان جیسے تو بہت ہوں گے لیکن ان کے برابر کم ہی ہوں گے۔ میں بات کر رہی ہوں **پروفیسر سید عامر علی صاحب** کی۔ ان کے بارے میں کیا لکھوں یہ تو چلتا پھرتا ''ادب'' ہیں۔ بقول سر عامر:

''ادب ایسے نہیں آتا۔ یہ بس آتا ہے، تو آتا ہے''

سر نے ہمیں پڑھایا تو سالِ اول میں تھا لیکن ان کی باتیں سال دوم میں بھی کام آئیں۔ سر کی باتیں بھی بڑی ادبی ہوتی ہیں اور بڑی کمال کی، یہ الگ بات ہے کہ ہماری کھوپڑیاں خالی ہیں۔ سر کی باتیں دور کی نہیں ہوتیں بلکہ بڑی قریب قریب کی ہوتی ہیں۔ سر اکثر کلاس میں کھیر پکاتے تھے اور وہ کھیر بڑی ادیبانہ ہوتی تھی اس میں بڑی کمال کی باتیں ہوتیں۔ لیکن چونکہ وہ باتیں ہماری سمجھ سے باہر تھیں اس لیے ہمیں وہ ''لذیذہ کھیر مکس'' ہی لگتی تھی۔ سر نے ہمیں اتنا لکھوایا۔ اتنا لکھوایا۔ کہ اگر ہم روڈ پر اس رفتار سے چلتے تو ہم پیدل چلتے چلتے واہگہ بارڈر کراس کر جاتے۔ لیکن اس میں ہمارا ہی فائدہ تھا ہماری لکھنے کی سپیڈ کافی بہتر ہو گئی تھی۔ سر کی آنکھیں دیکھ کر اکثر ڈر لگتا ہے، موٹی موٹی اور اوپر سے اتنی سرخ۔ منیر نیازی کا ایک شعر یاد آ گیا:

نیند کا ہلکا گلابی سا خمار آنکھوں میں تھا
یوں لگا جیسے وہ شب کو دیر تک سویا نہیں (منیر نیازی)

اصولوں کے پکے آدمی جناب **پروفیسر محمد ریاض نوید وڑائچ**۔ ان کے بارے میں لکھتے ہوئے ڈر لگ رہا ہے کہ کہیں سر کو غصہ نہ آ جائے۔ سر کی کلاس میں بیٹھنے سے پہلے چند اصولوں سے آگاہ ہونا بہت ضروری ہے۔ ۱: حاضری کھڑے ہو کر بولنی ہے۔ ۲: اور ''یس سر'' نہیں بولنا بلکہ ''پریذنٹ'' بولنا ہے۔ ۳: تیسری اور اہم بات سر کو دلائل پیش نہیں کرنا۔ آئے روز کسی نہ کسی کی شامت آئی ہوتی ہے۔ اگر کسی نے بیٹھ کر حاضری لگوائی تو پھر اسے پانچ منٹ تک کھڑا رہنا پڑتا ہے۔ شادی ہو یا مرگ، پارٹی ہو یا مذہبی تقریب سر ہمیشہ سفید کپڑے پہنتے ہیں۔ جیسے سفید رنگ بہت سادہ اور پرسکون ہوتا ہے ویسے ہی سر کی شخصیت بھی ہے۔ حالی کی طرح شریف النفس اور اکبر کی طرح جدید تہذیب کے خلاف۔ سر ہمیں اردو اسلامیات اور پنجابی میں پڑھاتے ہیں۔ پارٹ ون میں تو سر نے ٹیسٹ لے لے کر ہماری مت مار دی۔ لیکن تیاری بہت اچھی ہو گئی تھی۔ سر وقت کے بڑے پابند ہیں۔ نہایت ہی مخلصانہ انداز میں پڑھاتے ہیں۔ اور اپنے پیشے سے بھی مخلص ہیں۔

پاکستان کے شاہ رخ خان، زمیندار کالج کی شان، عزت مآب جناب **پروفیسر غلام ربانی** شعبہء اردو کے شیر دل جوان ہیں۔ ذخیرہء الفاظ کی کمی کے باعث یہ ان کا مختصر تعارف ہے۔ اب ذرا اُن کے مزاج پر بات کر لیتے ہیں۔ سر بہت خوش مزاج ہیں۔ ہنس مکھ ایسے کہ اکثر اپنی پریشانیوں کو اپنی مسکراہٹ میں چھپا لیتے ہیں۔ کلاس کا ماحول ہلکا پھلکا رکھتے ہیں۔ اور پُرلطف انداز میں موضوع کو اس طرح ختم کرتے ہیں کہ پوچھنا پڑتا ہے۔ سر بس۔۔۔۔۔ تو سر کہتے ہیں جی ٹاپک مکمل ہو گیا ہے۔ سر ربانی سے میں نے جتنا پڑھا ان کی مجھے یہ بات بہت اچھی لگی کہ سر موضوع کو سمجھانے کے لیے جو مثالیں دیتے ہیں وہ ہماری روزمرہ زندگی سے ہوتی ہیں لیکن ہم ان کو اکثر نظر انداز کر دیتے ہیں۔

سر کی ناراضی سے ہمیں بڑا ڈر لگتا ہے۔ اگر کبھی ان کا موڈ خراب ہو تو کلاس میں آ کر ایسے تند و تیز الفاظ میں حوصلہ افزائی کرتے ہیں کہ ہر ایک کو یہی محسوس ہوتا ہے جیسے ساری باتیں مجھے سنا رہے ہوں۔ لیکن ایک بات ہے سر بہت اچھے ''موٹیویشنل سپیکر'' ہیں۔ سر کو میں مشورہ دوں گی کہ ''یوٹیوب'' پر اپنا چینل کھول لیں۔ جمعہ والے دن تو ہماری کلاس میں جناب مولانا غلام ربانی خصوصی خطاب فرماتے ہیں اور ایمان افروز

باتوں سے ہمارے ایمان کو تازہ کرتے ہیں۔ سر جی بولیا، چالیا، معاف کرئیو۔ سر بہت اچھے استاد ہونے کے ساتھ ساتھ بہت اچھے انسان اور بہت ہی حساس طبیعت کے مالک ہیں۔

میڈم بشریٰ آرزو ایسا لگتا ہے کہ جیسے ان کا نام رکھتے ہی ان کے گھر والوں نے سوچ لیا تھا کہ انہیں ایم اے اردو ہی کروانا ہے کیوں کہ ہماری اردو شاعری آرزوؤں اور حسرتوں کا ہی نام ہے۔ میڈم بشریٰ زمیندار کالج میں ہم طالبات کے لیے رول ماڈل ہیں کیوں کہ پورے اردو ڈیپارٹمنٹ کے ٹیچنگ سٹاف میں وہ خواتین کی نمائندگی کر رہی ہیں۔ ان کی قابلیت اس بات کا ثبوت ہے کہ خواتین علم وفن کے ہر شعبہ میں نمایاں کردار ادا کرسکتی ہیں۔

وجودِ زن سے ہے تصویر کائنات کا رنگ
اسی کے ساز سے ہے زندگی کا سوزِ دروں

سر جناب **پروفیسر احمد عطاؔ** ہماری یہ خواہش تھی کہ ہمیں ان سے پڑھنے کا موقع ملتا لیکن یہ ہماری بدقسمتی رہی کہ ہم سر کے خیالات سے مستفیض نہ ہو سکے۔ سر کو دیکھ کر عموماً یہ شعر یاد آتا ہے

دھکیلتا ہوں بدن سے دھوئیں کے ساتھ ملال
میں کش نہیں، رگ و پے میں سکون کھینچتا ہوں

آپ نہ صرف ایک اچھے استاد ہیں بلکہ اچھے شاعر بھی ہیں۔ آپ ایک قیمتی نگینہ ہیں لیکن ہم چونکہ جوہری نہ تھے اس لیے پہچان نہ کر پائے آپ بہت حساس انسان ہیں اور انسانی رویوں کو بہت جلد محسوس کر لیتے ہیں اور یہی حساسیت ان کی شاعری کی نمایاں خوبی ہے۔

پھسل گیا تھا کسی شاہ کی انگوٹھی سے
کہوں میں کیسے کوئی قیمتی نگیں ہوں میں (عطاؔ)

جناب **پروفیسر سر عمران** جب ہم سال اول میں تھے تو یہ طے پایا کہ اسالیب نثر تین دن سر نوید پڑھایا کریں گے اور تین دن سر عمران، میرے خیال میں انہوں نے ہمیں دو لیکچر دیئے۔ دوسرے لیکچر میں جب کلاس میں آئے تو یہ میری پہلی کلاس تھی جس میں مجھے سر سے پڑھنے کا موقع ملا سر نے بتایا کہ ان کے گاؤں میں ہائی سکول نہیں پھر بھی انہوں نے ایم اے اردو کیا میں بہت متاثر ہوں واقعی میں آپ کی علم سے جو محبت ہے اس کا اعتراف نہ کرنا بہت بڑی ناانصافی تھی۔ ان کی اردو بول چال میں ان کے گاؤں کے لہجے کی مٹھاس موجود تھی۔ انہوں نے مختار مسعود کی کتاب ''آواز دوست'' کے بارے میں ہمیں لیکچر دیا اور کہنے لگے کہ اگلی کلاس میں مَیں ''مینارِ پاکستان'' لے کر آؤں گا۔ ہمیں کیا پتہ تھا کہ ''مینار پاکستان'' مختار مسعود کا مضمون ہے ہم تو اس دن سے انتظار کرنے لگے کہ کب مینار پاکستان زمیندار کالج میں آئے گا لیکن وہ دن کبھی نہ آیا اس کی کئی وجوہات ہو سکتی ہیں شائد حکومت وقت نے اجازت نہ دی ہو کیوں کہ مینار پاکستان کو لاہور سے گجرات لانا کوئی آسان کام نہیں۔ چلیں سر وہ والا مینار پاکستان نہ سہی کم از کم جیل چوک گجرات میں لگا مینار پاکستان ہی اٹھا لاتے۔ بہر حال یہ نہ تھی ہماری قسمت۔

آخر میں صرف اتنا کہوں گی اللہ ہمارے اساتذہ کو سلامت رکھے اور ان کے عزت و مرتبے میں اضافہ فرمائے آمین!

☆☆☆☆

متفرق مضامین

سالانہ مشاعرہ 2019

ریٹائرمنٹ کے موقع پر الوداعی تقریر

پروفیسر امداد حسین (سابق صدر شعبہ ریاضی)

محترم پرنسپل جناب غلام عباس، وائس پرنسپل جناب اقبال بٹ اور معزز اساتذہ، السلام علیکم!

اس پروقار تقریب کی خوبصورتی اور دلکشی مجھے یہ شعر سنانے پر مجبور کر رہی ہے:

میرے یوسف تیری بھرپور زیارت کے لیے
مانگ لایا ہوں زلیخا سے ادھاری آنکھیں

ذکر خدا اور رسول کے علاوہ کثرت کلام آفتِ قلب ہوتا ہے۔ اس لیے میں بغیر کسی تمہید کے اپنی بات کو مختصر کرتے ہوئے صرف اتنا کہوں گا کہ زمیندار کالج میں قیام کے دوران میں میرے تمام سٹاف ممبران کا تعاون اور محبت ہر قدم پر میرے ساتھ رہی، خصوصاً شعبہ ریاضی کے پروفیسر صاحبان ہمیشہ میرے ہم قدم رہے۔ اور شعبہ کا ہر معاملہ باہمی مشاورت اور تعاون سے حل ہوتا رہا۔ ریٹائرمنٹ سے پہلے پینشن پیپرز تیار کروانے کے لیے تمام سٹاف، برسر محمد اسلم اور جناب پرنسپل غلام عباس نے ہر ممکن تعاون کیا۔ اس کے علاوہ پروفیسر شہزاد منور (ڈی ڈی سی گجرات) نے بھی اپنی پہلی فرصت میں میری پینشن کے معاملات کو تیز تر کرنے کے لیے ہر ممکن کوشش کی۔ پرنسپل صاحب کے حوالے سے میں یہ کہنا چاہوں گا کہ وہ طلبہ کی علمی تشنگی کو دور کرنے کے لیے ہمہ وقت کوشاں ہیں۔ اور مجھے امید ہے کہ عباس صاحب زمیندار کالج میں نظم و ضبط کے قیام کے لیے جو کوششیں کر رہے ہیں وہ آیندہ زمیندار کالج کی انتظامیہ کے لیے مشعلِ راہ ہوں گی۔

اپریل ۲۰۱۹ میں میرے ساتھ، نامعلوم افراد کی فائرنگ کی وجہ سے ایک حادثہ پیش آیا اور میں عزیز بھٹی شہید ہاسپٹل میں زیرِ علاج رہا۔ ان پریشان کن حالات میں تمام سٹاف، پرنسپل صاحب اور طلبہ کی محبت میرے لیے حوصلے کا باعث بنی۔ میں اس فورم پر ان تمام دوستوں کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ جن کی محبتوں اور دعاؤں کی وجہ سے میں صحت یاب ہو کر آپ سب سے مخاطب ہونے کے قابل ہو سکا۔ بلاشبہ زمیندار کالج کا جنت نظیر کیمپس اہلیان گجرات کے لیے ایک بہت بڑی نعمت ہے۔ اور اس کالج میں جتنا وقت، میں نے گزارا، وہ میرے لیے یادگار ہے۔ اور آخر میں تمام اساتذہ کا شکریہ جنھوں نے میری ریٹائرمنٹ پر اتنی شاندار تقریب کا انعقاد کیا اور پرخلوص الفاظ اور تحائف کے ساتھ مجھے مدت ملازمت مکمل ہونے پر الوداع کہہ رہے ہیں۔

اپنی اس گفتگو کے اختتام پر میں چند اشعار، زمیندار کالج اور آپ تمام مہربان دوستوں کی نذر کرتا ہوں:

تیری دوستی سے پہلے مجھے کون جانتا تھا — تیرے عشق نے بنائی میری زندگی فسانہ

بھرا رہے تیری خوشبو سے تیرا صحن چمن — بس ایک موسمِ عنبر فشاں گزرتا رہے

سماعتیں تیرے لہجے سے پھول چنتی رہیں — دلوں کے ساز پہ تو نغمہ خواں گزرتا رہے

میں مانگتا ہوں تیری زندگی قیامت تک — ہوا کی طرح سے تو جاوداں گزرتا رہے

میں تجھ کو دیکھ سکوں آخری بصارت تک — نظر کے سامنے بس اک سماں گزرتا رہے

میں تیرا ساتھ نہ دے پاؤں پھر بھی تیرا سفر — گلاب و خواب کے ہی درمیاں گزرتا رہے

لوگ

بینش ارجمند

شعبہ اُردو سال دوم

میں جانتی ہوں یہ موضوع پرانا ہو چکا ہے۔لیکن اس میں بیان کیے گئے مسائل ہمیشہ نئے رہیں گے اور ان کا حل ہونا ناگزیر ہو چکا ہے۔ورنہ ہمارے معاشرے میں ترقی کبھی نہیں ہو سکے گی اور یہ مسائل ہم سب نے ایک دوسرے کے لئے خود پیدا کر رکھے ہیں ہم لوگ اپنی زندگیوں سے زیادہ دوسروں کی زندگیوں میں دلچسپی کیوں لیتے ہیں شاید ہم لوگ دوسرے ممالک کے لوگوں کی طرح اتنے محنتی نہیں اور ہمیں بہت سا فارغ وقت مل جاتا ہے جس کو ہم دوسروں کے کاموں میں مداخلت کر کے قیمتی بنانا چاہتے ہیں اگر ہم کسی چیز میں ناکام ہو جائیں تو اتنا اس ناکامی کا افسوس نہیں ہوگا جتنا اس بات کا افسوس کہ لوگ کیا کہیں گے۔ہم اپنے ہر کام کیلئے لوگوں کو جواب دہ کیوں ہیں اور یہ لوگ تو اس قدر پست ہیں کہ ان کی کوئی ایک رائے ہی نہیں۔ان کی رائے میں اس قدر تضاد پایا جاتا ہے کہ انہوں نے ایک دوسرے کے دکھ پر افسوس کرنے کے بھی پیرامیٹر بنا رکھے ہیں۔اور ہر بات کا حساب شاید خدا بھی ایسے نہ لے جیسے یہ لیتے ہیں۔اگر کسی کی جوان لڑکی خودکشی کرے تو 99% مسائل چھوڑ کر یہی بات کیوں گمان کی جاتی ہے کہ اس نے یہ خودکشی محبت نہ ملنے پر کی ہوگی۔یہ نہیں سوچتے کہ کیا پتہ اس دنیا کے جابر حالات میں اسے کسی کی محبوبہ بننے کا موقع ہی نہ ملا ہو۔

اور اگر کوئی ماں چھوٹے چھوٹے بچے چھوڑ کر مر جائے تو اسکے بچوں کی قسمت خراب ہے جبکہ اس لڑکی کا کردار خراب ہے قسمت خراب نہیں ہے اور ان بچوں کا دکھ تو چند دنوں میں بھول جائیں گے جبکہ اس لڑکی کا دکھ کسی جرم کی طرح آنے والی نسلوں تک یاد کروایا جاتا ہے اور جو بات ان لوگوں نے خود سے رائج کر رکھی ہے پھر وہی ان کے لئے فتوی اور وہی آئین۔اور یہ لوگ نہ کسی کے دکھ کو بڑا دکھ مانتے ہیں نہ کسی کی خوشی پہ خوش ہوتے ہیں تو آخر یہ خوش کیسے ہوتے ہیں ہمارے معاشرے میں شادی شدہ بیٹے کو اپنی پراپرٹی کیوں سمجھا جاتا ہے اور اس کی ہر غلطی کا الزام اس کی بیوی کو کیوں دیا جاتا ہے کیا وہ شادی سے پہلے کوئی فرشتہ تھا جو کوئی غلطی نہیں تھا کرتا سچ تو یہ ہے کہ ہمارے معاشرے کی اکثریت کو نہ رائے دینی آتی ہے نہ فیصلہ کرنا۔ہمارے معاشرے میں اگر پڑھا لکھا انسان کسی سے بدتمیزی کر دے تو اس کی تعلیم کو یوں الزام دیا جاتا ہے جیسے تعلیم نے کہا تھا مجھے حاصل کر لینے کے بعد کوئی پریشانی نہیں رہے گی یا تعلیم یافتہ انسان غصہ کرنے کا حق کھو دیتا ہے۔ہم اخلاقیات کا سبق تو دیتے ہیں لیکن ہر اس بے ایمانی کو جائز سمجھتے ہیں جو ہماری رسائی میں ہو ہمارے لوگوں نے مل کر اپنا معاشرتی نظام خراب سے خراب تر کر رکھا ہے ہم ہر ناکامی کا الزام ناکام ہونے والے کو دیں گے اور ہر کامیابی کا کریڈٹ اور ہر کامیاب انسان کی کامیابی کا کریڈٹ اس کی قسمت کو دیں گے تب ہم اس کو محنتی تسلیم نہیں کریں گے ہم سب نے مل کر ایک دوسرے کی شناخت ختم کر دی ہے۔

ہم سب ایک دوسرے سے اتنے خوف زدہ ہیں کہ سب مختلف روپ اپنائے ہوئے ہیں اور ہم سب یہ نظام بدلنے کی کوشش بھی نہیں کر رہے ہیں اور بہت سے غلط کام صرف اس وجہ سے جاری ہیں کہ ہر کوئی غلط کر رہا ہے میرے نہ کرنے سے کیا فرق پڑ جائے گا یہ زندگی پھولوں کا بستر بن سکتی ہے اگر لوگوں کے خوف سے ہٹ کر گزاری جائے۔زندگی دل کے سبز باغوں جیسی ہو سکتی ہے اگر لوگ اسے اجاڑ جنگل بنانے کے مشن سے باز آ جائیں تو پتہ نہیں کب ہم اپنا احتساب کریں گے کب ایک دوسرے کا پیچھا چھوڑیں گے اور کسی کے بارے میں نہیں

بلکہ اپنے بارے میں بات کریں گے ہماری زندگی بہت پر سکون ہو جائے گی جب ہمیں لوگوں کی وہ وجہ سے فارمل نہیں ہونا پڑے گا اور ہم لبرل کے معنی کو بے حیائی کی نہیں ترقی کی نظر سے دیکھیں گے۔

اور ہر کامیاب انسان کی کامیابی کا کریڈٹ اس کی قسمت کو دیں گے۔تب ہم اس کو محنتی تسلیم نہیں کریں گے ہمارے ہاں اگر کوئی اپنی مرضی کی زندگی گزارنا چاہے تو اس کو ہم باغی کہیں گے تو مطلب ترقی یافتہ ممالک کے سب لوگ پھر باغی ہیں۔ہمارے ملک کے لوگوں کے مطابق ہر بے ایمانی اس وقت تک بے ایمانی کہلاتی ہے جب تک وہ ان کی رسائی میں نہیں ہے ہم سب ایک دوسرے سے اکتا چکے ہیں لیکن ایک دوسرے کی ذات میں مداخلت کیے بغیر نہیں رہ سکتے۔ہم بیرونی طور پر جتنے بھی جدید بن جائیں لیکن اندرونی طور پر پسماندہ ہی رہیں گے وہ اس لئے کہ ہم جدید ہو گئے ہیں لیکن صرف اپنی ذات کی حد تک دوسروں کیلئے ہم ہمیشہ پسماندہ ہی رہیں گے اور یہ لوگ دانشوروں کے پڑھائے سبق صرف اس لئے پڑھتے ہیں کہ دوسروں کو نصیحت کر سکیں۔ہم سب نے مل کر ایک دوسرے کی شناخت ختم کر دی ہے۔

ہم ایک دوسرے سے اتنے خوف زدہ ہیں کہ سب مختلف روپ اپنائے ہوئے ہیں اور ہم یہ نظام بدلنے کی کوشش اس لئے نہیں کر رہے کہ کسی ایک کے بدل جانے سے کوئی تبدیلی نہیں آئے گی، یہ زندگی پھولوں کا بستر بن سکتی ہے اگر لوگ اس کو اجاڑ جنگل بنانے کے مشن سے باز آ جائیں۔پتہ نہیں کب ہم سب اپنا احتساب کریں گے، کب ایک دوسرے کا پیچھا چھوڑیں گے۔اور کسی کے بارے میں نہیں بلکہ اپنے بارے میں بات کریں گے۔

ہماری زندگی اس دن پر سکون ہو جائے گی جب ہمیں لوگوں کی وجہ سے فارمل نہیں ہونا پڑے گا اور ہم لبرل کے معنی کو بے حیائی کی نظر سے نہیں بلکہ شعور اور ترقی کی نظر سے دیکھیں گے تب ہمارا سارا معاشرہ ایک خوبصورت زندگی گزارنے کا اہل ہو جائے گا اور وہ دن بھی 14 اگست کے دن کی طرح حسین ہوگا جب ہم سب لوگ ایک دوسرے کو آزاد کر دیں گے اور سب کو خود مختار ہونے کا حق حاصل ہو جائے گا۔

یومِ نسواں

حاجرہ گل

ایم اے انگلش ۲۰۱۲ تا ۲۰۱۴

نانی اماں کہا کرتی تھیں کہ، قرب قیامت معاشرے میں سماجی نظام بکھر کر رہ جائے گا اور بندہ بندے کو کھائے گا طوائفیں گھر گھر ناچیں گی، بچپن اور لڑکپن میں یہ بات بہت عجیب وغریب لگتی تھی کہ ایسا کیسے ہوگا اور کیوں ہوگا؟ ایک گھمبیر سی سوچ مسلسل میرے ذہن کو تنگ کیا کرتی تھی. عمر عزیز کے مدارج جوں جوں طے پا رہے ہیں سب ممکن نظر آ رہا ہے جو باتیں ہمارے بچپن میں ناممکن سی معلوم ہوتی تھیں اب وہ ٹرینڈز کے نام پر ہمارے اندر داخل کی جا چکی ہیں

مارچ کے دوسرے ہفتے کو یوم نسواں کے موقع پر کراچی میں کیے گئے مظاہرے کچھ عجب ہی منظر پیش کر رہے تھے یوں لگتا تھا جیسے چند افراد اپنے ذاتی نقطہ نظر کو پوری قوم پر مسلط کرنے کی کوشش کر رہے ہیں گویا سوچی سمجھی سازش کے تحت پاکستان کی نظریاتی اساس اور معاشرتی نظام کو نقصان پہنچانے کی کوشش کی گئی جب بھی کسی قوم کو تباہ و برباد کرنا مقصود ہو تو اس کے معاشرتی نظام کو کھوکھلا کر دیا جائے نام نہاد ماڈرن ابن ماڈرن کٹھ پتلوں اور پتلیوں نے پلے کارڈز اٹھا رکھے تھے جن پر کچھ ایسے جملے درج تھے

،کھانا خود گرم کرو، ،

،میں آوارہ میں بدچلن،

Divorced and happy,

،تمہارے باپ کی سڑک نہیں ہے،

عورت بچہ پیدا کرنے کی مشین نہیں ہے،

یوں لگ رہا تھا کہ وہ خواتین اپنے مرتبے کی عظمت سے آگاہ نہیں اور وہ دورِ جاہلیت میں واپس جانا چاہ رہی ہوں

حق مانگنا، حق کی بات کرنا اور رائے کا اظہار ہر آزاد انسان کی فطرت کا تقاضا ہے مگر حق کے نام پر بے ہودگی اور فحاشی کے فروغ کیلئے کوشاں رہنے والی یہ خواتین کیسی نسل کو جنم دیتی ہیں جو کہ جسمانی طور پر آزاد مگر گلے سڑے دماغ کے مالک ہوں گے ایک گلی سڑی نسل ہمارا معاشرہ اور مستقبل کیا سنوارے گی؟

ہم یورپ کی طرح ایک بند گلی کی طرف جا رہے ہیں جس میں انسانی رشتوں کی کوئی قدر و قیمت نہ ہوگی لوگ وحشی درندے بن جائیں گے اور چاروں طرف ضرورت کا راج ہوگا عورت کی حیثیت ٹشو پیپر سے بدترین ہو جائے گی آزادی اظہار کے نام پر دھڑلے سے جس طرح ہمارے معاشرے میں بے چینی اور بدلحاظی کا بیج بونے کی کوشش کی گئی ہے یہ آنے والے دور کے ہولناک خطرات کی طرف اشارہ کر رہی ہے third generation جنگ کا گویا آغاز کر دیا گیا ہے

یورپ کا حال دیکھا جائے تو یونائیٹڈ نیشن کی رپورٹ کے مطابق سالانہ زیادتی کے 2.5 لاکھ کیس رپورٹ ہوتے ہیں جبکہ غیر رجسٹرڈ کیسز کی تعداد 91 فی صد ہے جدید ترین معاشرے کا یہ تاریک ترین پہلو ہے جدید معاشرے میں ایسے واقعات اس کے کمزور

معاشرتی نظام اورعورت کوتحفظ فراہم نہ کرنااس بات کی واضح دلیل ہے کہ برابری کے نام پر یورپ میں عورت کے نازک کندھوں پر معاشی زمہ داری کا اضافی بوجھ ڈال دیا ہے گویا بچے پیدا کرنے، ان کی پرورش اور تمام ضروریاتِ زندگی کی فراہمی، ایک عورت کے کاندھوں پر ڈال دی گئی ہے اگر زمینی حقائق کو سامنے رکھ کر دیکھا جائے تو یورپی مما لک میں 20فی صدلڑکیاں 18 سال کی عمر سے قبل ہی زیادتی کا نشانہ بن جاتی ہیں کیا یہ صورت حال ہولناک نہیں ہے؟

اسلامی مما لک میں صورتحال بدر جہا بہتر ہے کیونکہ وہاں سنگساری کی سزا کا نفاذ کیا جا تا ہے بہت سے جانوراس کی سزا کے خوف سے باز رہتے ہیں اسلام میں عورت کو ہر درجے میں تحفظ فراہم کرنے کا حکم موجود ہے اوراس کے ولی کیلیے مختلف درجات کا اعلان کر کے اللہ تعالیٰ نے اس کے درجے کا تعین کیا ہے تا کہ دلوں میں نرمی رہے جب بیٹی پیدا ہوتی ہے تو باپ کیلیے جنت الفردوس کی خوشخبری لے کرآتی ہے ہمارے پیارے نبی اکرم صلعم نے 3 بیٹیوں کی اچھے طریقے سے پرورش پر جنت کی نوید سنائی ہے غالباً بیٹی ہی جنت کی ضمانت ہے۔اس سے قبل زمانہء جاہلیت میں بیٹیوں کوزندہ در گور کرنے کا چلن عام تھا آج بھی کئی لبرلز میں یہ روایت بدرجہء اتم موجود ہے کہ بیٹی کے آنے کی خبر سنتے ہی اسقاطِ حمل کا فیصلہ کرلیا جا تا ہے۔گویا گھر میں اولادنہیں بیٹی کی شکل میں قیامت بر پا ہونے جارہی ہے۔اسلام نے نہ صرف عورت کو زندہ رہنے کا حق دیا ہے بلکہ اسے ایک بیٹی، ماں، بہن اور بیوی کے روپ میں اعلیٰ اقدار پر مبنی رشتوں کی شکل میں تمام تر حقوق کے ساتھ مردوں کی لڑی میں پرویا۔

یہ نام نہادلبرلز اگر واقعی عورت کے حقوق کی بات کرتے تو وراثتی حق کی بات کرتے،عورت کا جوحق اس معاشرے میں سب سے زیادہ سلب کیا جارہا ہے۔لیکن ان حقوق سے وہ بھی نظریں چراتے نظر آتے ہیں کیونکہ یہ اصل حقوق تو اُن کے منشور میں شامل ہی نہیں کیونکہ انھیں بس اتنا سبق یاد کرایا گیا ہے کہ۔۔۔۔۔یہ لوگ ہمارے معاشرتی نظام کوتوڑ کر ہمیں اندر سے کمزور کرنے کی بھر پور کوششوں میں ہیں اور ان کے بیشتر تیر درست نشانے پر لگ رہے ہیں ہماری لبرل بہنیں اور کاروباری عورتیں مہروں کا کردار بھر پور انداز میں نبھانے کی کوششوں میں اُن کے ساتھ صفِ اول میں کھڑی ہیں۔ان بہنوں کے ہاتھوں میں ایسے پلے کارڈ ز دیکھ کر تو مجھ پہ اقبال کے اس مصرعہ کے معانی کا نیا باب کُھلا

یہ مسلماں ہیں جنھیں دیکھ کے شرمائیں یہود

اپنی چادر کو بوجھ سمجھنے والی خود دعوتِ نظارہ بن کر دوسرے کی نظر پر سوال اُٹھانے کی اہل نہیں ہوسکتی۔یہ ایک دجالی فتنہ ہے۔ خدائے بزرگ وبرتر سے دعا ہے کہ وطنِ عزیز کوایسی بیماریوں اورفتنوں سے محفوظ رکھے۔تا کہ ایک پاک دامن اورصاف ستھرا معاشرہ پروان چڑھے۔کیونکہ یہ حقیقت ہے کہ

تم مجھے اچھی مائیں دو میں تمھیں اچھی قوم دوں گا

نپولین

☆☆☆☆

''جھوٹ کی عادت نہیں مجھے''

جیامرزا

ایم۔اے،انگلش سال اول

آپ نے اکثر ٹرکوں، ویگنوں، بسوں کے پیچھے دلچسپ اور عجیب وغریب شعروشاعری اور فقرات دیکھے ہوں گے۔ان کا ایک منفرد اور جداگانہ انداز ہوتا ہے۔ویسے تو مابدولت قافیہ ردیف کی بڑی حد تک دلدادہ ہیں مگر اس قسم کی شعروشاعری میں قافیہ ردیف کی کوئی قید نہیں ہوتی۔بس مطلب سمجھ میں آنا چاہیے۔اسی طرح اردو بھی بڑی عجیب وغریب ہوتی ہے۔مثلاً ''ماں کی دعا جنت کی ہوا''۔''ہارن دیں راستہ لیں''۔ایک ویگن کے پیچھے لکھا تھا ''میں بھر کے چلا جاؤں گا، تو دیکھتا رہ جائے گا''۔تو بتاؤ ہم کیا کریں؟؟۔بھائی کے ساتھ کالج کے لیے بائیک پر نکلی کہ ایک بس نے ہمیں تیز رفتاری سے اوورٹیک کیا۔پیچھے لکھا تھا ''غصہ نہ کریار، ٹیم ساڈی مجبوری اے''۔ایک پچھلی بس انجن سے ایسی دردناک آوازیں نکال رہی تھی کہ مانو الہ دین کا جن بوتل میں قید ہو۔پیچھے الفاظ درج تھے ''پپو مستری کی دہشت''۔جو میرا منہ چڑا رہے تھے۔ایک کھٹارا سی بس کی حالت ایسی تھی کہ یقین نہیں ہوتا کہ مسافر منزل مقصود پر پہنچیں گے بھی یا نہیں۔اور اس پر رقم تھا ''نہ انجن کی خوبی نہ کمال ڈرائیور چلی جارہی ہے خدا کے سہارے''۔

دوزبوں حال رکشے ساتھ ساتھ جارہے تھے۔اتنا دھواں کہ اللہ کی پناہ۔رکشے کے پیچھے تحریر تھا ''روپ کا راجہ''۔دوسرے ڈرائیور نے لکھوا رکھا تھا ''پاکستانی دلیپ کمار''۔

ایک دفعہ ایک رکشے والے سے ایکسیڈنٹ ہو گیا۔نظر ڈالی تو اس کے پیچھے رقم تھا ''بہت یاد آؤں گا''۔واقعی پندرہ دن تک یاد آتا رہا۔اکثر ٹریکٹر والے Full Volume میں ٹیپ ریکارڈر لگا کر گزر جاتے ہیں۔اور پیچھے لکھا ہوتا ہے ''گونگا سا ہیوال دا''۔

آج کل نمبر ایک کی دوڑ ہے۔ہر کوئی کہتا ہے کہ میں نمبر ایک ہوں۔پہلے ورن دھون نمبر ایک ہے آج کل بلال عباس کا راج ہے۔اکثر گاڑیوں کے عقب میں درج ہوتا ہے ''ابھی تو میں جوان ہوں'' یا ''پردیسی بالم'' یا ''بے وفا صنم''۔ایک خوبصورت بس کا حادثہ ہو گیا اس کے پیچھے لکھا تھا ''سجیلی جوانی''۔

جس ٹرک سے ٹکر ہوئی وہ بھی پاس ہی کھڑا تھا اس پر لکھا تھا ''مے درد زمانہ کیا جانے''۔

ایک ٹھیلے والے نے چھوٹے سے ٹھیلے پر پوری دکان سجا رکھی تھی۔بڑی خوبصورت دکان تھی۔گول گپے کھانے میں بہت مزیدار تھے۔مرچیں بہت تیز تھیں۔میرا منہ جلنے لگا۔لیکن دل اور کھانے کو چاہ رہا تھا۔اچانک سامنے جاتے ہوئے ایک رکشے پر نظر پڑی لکھا تھا ''دل تو پاگل ہے''۔اب تک تو بسوں اور دیگر گاڑیوں کے ادب سے مستفید ہونے کے بعد میں اتنی تجربہ کار ہو گئی ہوں کہ اب تو UOG کی بسوں میں پھنسی عوام دیکھ کر میں یہ سوچتی ہوں کہ اس کے پیچھے لکھا ہونا چاہیے تھا۔

''دھوبی کا کتا گھر کا نہ گھاٹ کا''

☆☆☆☆

دنیاایک تماشا...

حسیبہ الرحمن (ایم،اے اردو سال دوم)

آج کل کے دور میں لوگ ایک دوسرے کو سمجھتے ہی کہاں ہیں۔کیوں کہ لوگوں نے بھی دو دو روپ دھارے ہوئے ہیں۔آخر لوگ بھی کیا کریں اس دور میں انسان ہی انسان کا جان کی دشمن بن گیا ہے۔کوئی بھی اس دنیا میں کسی کا دکھ بانٹنے والا رہا ہی نہیں۔ان کاغذوں اور قلموں کے علاوہ۔۔۔عہد وفا کو جاننے والے اس دنیا میں کم ہی لوگ ہیں۔کسی کے لیے کوئی روتا ہے یا کسی کی خاطر خلوص دل سے جان دے دینا۔اوہوں بہت کم لوگ ہوتے ہیں لیکن آنسو وہی مقدس ہوتے ہیں جو دوسروں کے دکھ پر نکلتے ہیں۔اس باغ وخزاں میں لوگ ایسے ہی سوکھے پتوں پر سے آرام سے گزر جاتے ہیں لیکن اس بات کا ذرا بھی احساس نہیں رکھتے کہ ان پتوں کو کتنی تکلیف ہوتی ہے جب خزاں رسید پتا کسی کے پاؤں سے چر چراتا ہے تو وہ اصل میں یہ ہی کہہ رہا ہوتا ہے کہ خزاں ہم پر بھی آتی! کسی نے اس دنیا کو دکھوں کا گھر کہا اور کسی ایک لمحہ مسکراتی ہوئی بجلی کہا اور کسی نے اسے مختلف رنگوں کا حسین امتزاج کہا۔اصل میں یہ دنیا بھی ایک تماشا ہے ہر وقت ہر آن ایک نیا رقص سامنے آتا ہے اور کئی لوگ اس سے مسرور ہوتے ہیں اور کئی بیزار۔۔۔

اس دنیا سے ایک بات سیکھی ہے کہ جب آپ کو ٹھوکریں لگتی ہیں کبھی کبھی اندھیروں کی اتھاہ گہرائیوں میں جا گرتے ہیں تو ہی آپ کچھ سیکھتے ہیں۔آپ پھر آہستہ آہستہ گھٹنوں کے بل اٹھتے ہیں اور یہ میرا ذاتی خیال ہے کہ شاید پھر آپ قلم تھامتے ہیں اور لکھنا بھی سیکھتے ہیں۔یہ ٹھوکریں جہاں بے اداسیاں پھیلاتی ہیں وہاں کچھ روشنیاں بھی اجا گر کرتے ہیں۔اور ایسی روشنیاں کہ آنے والوں کے لیے راہیں روشن ہو جائیں۔یہاں کچھ متفرقات بھی ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔آزمائشیں:۔اللہ انسان کو ہر رنگ میں آزماتے ہیں کیوں کہ حیات انسانی آزمائش کا ایک طویل سلسلہ ہے۔دکھ،غم اور کئی آزمائش ہیں جو کفر تک بھی لے جاتی ہیں ناشکری کی لذتوں سے آشنا کر دیتی ہیں۔حقیقت یہ ہے کہ جب غم کی ٹھوکر دل کو چور کرتی ہے تو دل کے انھیں ٹوٹے ہوئے ٹکڑوں کے کرب سے خدا کی یاد ابھرتی ہے۔غم:۔غم اس لیے نہیں ہوتے کہ ہم انھیں چہرے پر سجالیں غم تو سب کو ملتے ہیں کس کی زندگی میں نہیں آتے۔اپنے غم کو دوسرے لوگوں کے سامنے بیان کرو گے تو لوگ دوست اکتا جاتے ہیں بلکہ ایسا کرو کہ دوسروں کے غموں کا شریک بن جاؤ۔اور لوگوں کے ساتھ یوں خوش رہو کہ تمھیں کوئی غم نہیں۔خوشیاں بکھیرو۔۔۔ زندگی میں ایک لائحہ عمل ضرور اپناؤ محبت کرو اور خود سے بھی جو ہمارے پاس چیز نہیں ہوگی وہ ہم دوسروں کو کیسے دے سکتے ہیں۔اس لیے محبت خود سے ضروری ہے محبت ایک انمول موتی ہے جس کی کوئی قیمت نہیں اس دنیا میں لوگوں سے بھی محبت کرو اور خود سے بھی۔ یہ دنیا ایک تماشا ہے اس میں میں بھی گم اور آپ بھی لیکن ہمیں اس تماشا کو دیکھنے کے لیے اور کچھ کرنے کے لیے پاس بھی کچھ ہونا ضروری ہے اور وہ ہے محبت جو کہ ایک انمول جذبہ ہے اسے محسوس بھی کرو اور بانٹو بھی۔۔۔

کچھ الفاظ آپ کے پیش نظر۔۔۔

1۔محبت کے پرچم کو پورے خلوص کے ساتھ فضا میں بلند رکھو گے تو نفرت کی تیز آندھی بھی اسے ڈولنے نہیں دے گی۔2۔جھوٹ ایک دفعہ اونچا اڑتا ہے اور ہمیشہ گرتا ہے جب کہ سچ کی اڑان کبھی انسان کو بے سمت نہیں ہونے دیتی۔3۔ایک پل کا غرور ستر سال کی عبادت کو ختم کر دیتا ہے۔4۔خاموشی اور صبر سے بڑا کوئی ہتھیار نہیں۔5۔کسی کے عیب تلاش کرنے سے پہلے اپنے عیب تلاش کرو۔6۔استاد سے ڈرنا نہیں چاہیے عزت کرنی چاہیے۔انھیں محسوس نہیں کروانا چاہیے کہ آپ ان سے ڈرتے ہیں بلکہ ان کی دل سے عزت کرنی چاہیے۔7۔شک کرنے والا انسان دوسروں کی زندگی اور سیرت کو برباد کر سکتا ہے۔8۔کچھ شکوے ایسے ہوتے ہیں جن کے لیے الفاظ نہیں ہوتے۔9۔تکلیفیں انسان کو ایسے روند ڈالتی ہیں جیسے انسان کسی راستے پر مٹی کے ذرات کو۔10۔یقین اور دعا نظر نہیں آتے لیکن ناممکن کو ممکن ضرور بنا دیتے ہیں۔

کالج کے دن

ثناء مہدی

ایم اے اردو سال دوم

کالج میں بیتے دنوں کی یادیں ہر انسان کے ساتھ ہمیشہ وابستہ رہتی ہیں۔ زندگی بھر کانوں میں سرگوشیاں کرتی رہتی ہیں۔ اس کی ایک وجہ شاید یہ بھی ہوتی ہے کہ بطور طالب علم یہ شباب کا دور ابتدائی ہوتا ہے۔ یوں تو طالب علمی کا پورا زمانہ کسی بھی انسان کی زندگی کا ایک مسرت بخش اور یادگار دور ہوتا ہے۔ لیکن زمیندار کالج میں طالب علم کی حیثیت سے گزرے ہوئے دنوں کا کوئی نعم البدل نہیں۔ زمیندار کالج میں اپنے تعلیمی دورانیے کا ذکر کروں تو اس کا آغاز 3 اکتوبر 2018ء میں ہوا۔ اپنے گھر سے کالج تک کا سفر میرے لیے خاصا مسرت بخش اور خوش گوار تھا۔ جس وین میں بیٹھنے کا اتفاق ہوا اس میں مجھے اپنی پچھلی کلاس فیلو مل گئی میری خوشی کی انتہا نہ رہی کہ چلو جان پہچان کی لڑکیوں سے ملاقات ہوئی۔ لہٰذا جب وین ایک طویل سفر کے بعد ایک گیٹ کے سامنے آ کر رکی اور بتایا گیا کہ یہ ہی آپ کا کالج ہے (حالانکہ گیٹ کے اوپر بڑے الفاظ میں زمیندار کالج کا نام سبز رنگ کے بورڈ پر لکھا ہوا تھا جو کہ میں نے پڑھنے کی زحمت نہیں کی تھی)۔ وین سے اترنے کے بعد دوسری لڑکیوں کے ہمراہ میں نے بھی چلنا شروع کر دیا۔ گیٹ کے سامنے موٹا چشمہ لگائے ہوئے اور ہاتھ میں بندوق پکڑے انکل بیٹھے تھے پہلے تو مجھے ڈر لگا کہ نہ جانے کچھ پوچھ نہ بیٹھیں لیکن ایسا کچھ نہ ہوا اور میں کالج میں داخل ہو گئی۔

اب کالج میں آنے کے بعد میری کلاس کیسی ہوگی یا پھر یوں کہوں کہ میں شاید نروس ہو رہی تھی مگر ایسا بھی نہیں کہ میں اصل میں اپنا مقام بنانا چاہتی تھی کہ اپنے ٹیچرز کو کیسے متاثر کروں گی زیادہ نہ سہی لیکن اچھے طلباء میں اپنا نام بنا سکوں شاید یہی ایک ہم پاکستانیوں کا قومی سرمایہ ہے کہ ہم اندر سے چاہے جتنے بھی کھوکھلے کیوں نہ ہوں مگر باہر سے ہم مہذب اور شائستہ ہی دکھائی دیتے ہیں۔ خیر میرا ذہن بھی مجھے یہی سوچنے پر مجبور کر رہا تھا کہ میں پروفیسرز کی ہر بات کو دھیان کے ساتھ سننے اور جاننے کی کوشش کروں گی مگر میرا یہ ارادہ بالکل نہیں تھا کہ میں اوورا یکٹنگ کروں بلکہ یہ چاہتی تھی کہ پروفیسرز کی ہر بات پر عمل کروں گی اور یوں میں اپنی کلاس کی ایک اچھی طالبہ بن پاؤں گی۔ کیونکہ تمام طلباء وطالبات ہر سال کے آغاز میں یہی عزم کرتے ہیں مگر افسوس کہ اس پر پورا نہیں اترتے۔ کیوں کہ نیا تعلیمی سال امنگوں اور حوصلوں کو جلا بخشنے والا ہوتا ہے۔ طلباء اپنے پچھلے تعلیمی ریکارڈ سے کچھ بہتر کرنے کے جذبے سے سرشار ہوتے ہیں۔ اپنے کیریئر کی طرف پیش قدمی اور نئے دوست بنانے کا تصور ان میں ایک نئی جان ڈال دیتا ہے لہٰذا میں بھی کچھ ایسا سوچ رہی تھی۔ اتنے میں میرے کانوں نے دماغ کی سوچوں کو روکنے پر مجبور کیا اور اپنی طرف متوجہ کیا یا پھر یوں کہوں کہ کالے لباس میں ملبوس درختوں پر لپٹتی ہوئی چمکادڑوں نے حیرت میں مبتلا کیا۔

ایک دفعہ میں نے ان کو دیکھا اور پھر اپنی طرف نگاہ دوڑائی کیوں کہ وہ بھی میری طرح ہی کالے (چولے) یعنی برقعہ میں تھی۔ مجھے تو یوں محسوس ہو شاید یہ بھی یہاں میری طرح پڑھائی کی غرض سے آئی ہیں۔ خیر اس کے بعد میں نے ایم۔اے بلاک تک رسائی حاصل کی اور بغیر الوبنے مجھے اپنا کمرہ مل گیا کیوں کہ میری ایک دوست بھی میرے ساتھ رابطے میں تھی مگر جاتے ہی ایک بری خبر بھی مل گئی چوں کہ میں شعبہ نفسیات میں ایڈمشن لے کر پختہ عزم کے ساتھ آئی تھی مگر ٹیچرز کے نہ ہونے کے باعث مجھے خاصی پریشانی اٹھانی پڑی اس کے بعد نفسیات کے ایچ اوڈی سے بھی ملی مگر انھوں نے پرموٹ کرنے کے بجائے شعبہ نفسیات کو چھوڑنے کا مشورہ دیا۔ خیر جو کچھ دیر پہلے ارادے باندھے تھے وہ اب ٹوٹتے دکھائی دے رہے تھے۔ اور کشمکش

میں مبتلا ہوگئی۔ لہٰذا اب میرے لیے کسی اور شعبہ کا انتخاب کرنے میں مشکل ہو رہی تھی سارا دن کامن روم میں بیٹھ کر گزارا گیا۔ اگلے دن اردو کے ڈیپارٹمنٹ کے سینئرز سے بات کی اور وہ ہمیں ایک پروفیسر کے پاس لے کے گئے جن کا نام پروفیسر نوشاہی تھا انھوں نے اردو کو ترجیح دی اور یوں شعبہء اردو کا انتخاب ہوا۔ لہٰذا ان تمام باتوں کے باوجود دل کو اطمینان حاصل ہوا کہ اردو شعبہ کے پروفیسرز بہت اچھے اور ملنسار تھے اور خوشی اس بات کی بھی تھی کہ ہمارے جو نئے کلاس فیلوز میرا مطلب کہ شعبہ اردو کے کلاس فیلوز اپنے سینئرز کے ہاتھوں بے وقوف بن چکے تھے مگر حیرت کی بات تو یہ تھی کہ جو سینئر آپی ان کو (کلاس فیلوز) کو چونا لگا کر گئی تھی انھوں نے ہی مجھے گائیڈ کیا تھا۔

☆☆☆☆

ورق در ورق ایک زندہ کتاب
زمیندار کالج کا روشن نصاب
یہ ہنستے ہوئے، مسکراتے ہوئے
یہ چہرے سبھی موسمِ گل کا خواب
اسی سر زمینِ نمو کے طفیل
ہواؤں میں اڑنے لگے ہیں گلاب
(وقار)

یقین کی طاقت

فاطمہ زہرہ

جب بھی زندگی میں مشکلات نے خوشیوں کا راستہ روکا ہے، جب بھی مایوسی نے امید کے چراغ بجھائے ہیں، جب کبھی بظاہر بہتری کے تمام دروازے بند نظر آئے ہیں تب سماعتوں سے ایک ہی آواز ٹکرائی ہے اور وہ آواز تھی یقین کی آواز اور ہم بھی بنا کسی بحث وتکرار کے اس آواز کی سمت میں چل پڑتے تھے اور منزل تک رسائی یقینی ہوجاتی تھی۔خوشیاں، مشکلات کا دم توڑ کر اپنا راستہ بنالیتی تھیں۔امید کے چراغ پھر سے جل اٹھتے تھے ، بند دروازے کھل جاتے تھے ۔ واقعی یقین بہت بڑی طاقت ہے اور جس کے پاس یہ طاقت ہے وہ ہر مشکل کو مات دے دیتا ہے ۔ پریشانی کا بلند وبالا پہاڑ بھی اسے ریت کے ذرے کے برابر لگتا ہے ۔لیکن ہر کوئی اس طاقت کا حامل نہیں ہوتا اور کچھ تو ایسے بدنصیب بھی ہیں جو اس طاقت کا استعمال ہی نہیں جانتے ۔ان کی مثال اس حکمران کی سی ہے جس کے ہاتھ میں پورے ملک کا نظام دے دیا جائے لیکن وہ اپنی کم عقلی کی وجہ سے ملک میں امن وامان قائم نہ کرسکے ۔اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر یقین کس پر کیا جائے ؟ اپنی ذات پر؟ اپنی قابلیت پر؟ اپنی صلاحیتوں پر؟ یا پھر اس پر جو ان سب کا پیدا کرنے والا ہے، جو خالق ومالک ہے اس کائنات کا، جو مالک ہے ہماری ذات کا، ہماری قابلیت کا، ہمارے دل کا، ہمارے دل میں آنے والے ہر خیال کا، ہاں وہ اللہ، وہ اللہ ہی حقیقی حقدار ہے اس یقین کا اور یہ یقین ہمیں اس ذات مقدسہ پر ہر پل ہونا چاہیے ہر مشکل میں، ہر آسانی میں، ہر خوشی میں، ہر غم میں، ہماری ہر بات میں، ہمارے لہجے میں، ہماری آتی جاتی سانس میں یقین ہونا چاہیے ۔جی ہاں! مشکل میں اس بات کا یقین ہو کہ ہر مشکل کے ساتھ آسانی ہے، آسانی میں اس بات کا یقین ہو کہ یہ آسانی صرف اس رب حقیقی کی طرف سے ہے، خوشی میں اس بات کا یقین ہو کہ خوشیاں زندگی کا حصہ ہیں، زندگی نہیں، غم میں اس بات کا یقین ہو کہ یہ وقت بھی گزر جائے گا، ہماری ہر بات میں یقین سے مراد ہے کہ ہماری بات حق اور سچ پر مبنی ہو، لہجے میں یقین سے مراد ہے نرمی اور خلوص اور ہماری آتی جاتی سانس میں یقین سے مراد ہے کہ ہم اس زندگی کی سب سے تلخ حقیقت یعنی موت پر یقین رکھیں۔یعنی ہمیں اس بات کا یقین ہو کہ یہ دنیا فانی ہے، یہاں کی آسائشیں، یہاں کی چاہتیں، یہاں کی محبتیں سب فانی ہیں۔لیکن ہم اس فانی دنیا کی خاطر اس ابدی دنیا کو بھلا دیتے ہیں۔ پھر یقین ہمارے الفاظ میں تو زندہ رہتا ہے لیکن ہمارے اعمال میں کہیں نظر نہیں آتا، حقیقت میں دم توڑ دیتا ہے ۔اور ہم اپنے معاملات میں خود مختار ہوجاتے ہیں۔میرے خیال سے جنھیں اپنے رب پر یقین ہوتا ہے وہ اپنے اوپر اٹھنے والے ہر سوال کے جواب کا حق اپنے رب کو دے دیتے ہیں اور ان کا رب سب سے بہترین جواب دیتا ہے ۔ یہاں مجھے حضرت بہلول دانا رحمۃ اللہ علیہ کا وہ واقعہ یاد آ گیا ہے جب وہ ایک شادی شدہ جوڑے کے پاس سے گزرے تو ان کی وجہ سے راستے کا کیچڑ اچھل کر لڑکی کے کپڑوں پہ لگ گیا تو اس کے شوہر نے بنا کچھ سوچے سمجھے حضرت بہلولؒ کے چہرے پر تھپڑ دے مارا۔لیکن حضرت بہلولؒ نے جواب میں کچھ نہ کہا۔تھوڑی ہی دور جانے کے بعد اس شادی شدہ جوڑے کے ساتھ حادثہ پیش آیا اور شوہر کا انتقال ہوگیا۔اب اس کی بیوی کے دل میں خیال آیا کہ شاید یہ حضرت بہلولؒ کی بددعا سے ہوا ہے کیوں کہ میرے شوہر نے انھیں تھپڑ مارا اور انھوں نے کچھ بھی نہیں کہا۔اس خیال کے آتے ہی وہ عورت حضرت بہلولؒ کو ڈھونڈتی ہوئی ان کے پاس پہنچی اور ان سے کہا کہ آپ بھی میرے شوہر کو تھپڑ مار لیتے آپ نے اسے بددعا دی اور اس کا انتقال ہوگیا۔تو حضرت بہلولؒ دانا نے بہت خوبصورت جواب دیا انھوں نے کہا کہ ساری بات محبت کی ہے تمھارے شوہر کو تم سے محبت تھی لیکن اس کے اختیار میں صرف تھپڑ مارنا تھا جو اس نے مار لیا لیکن جس کو مجھ سے محبت تھی اس کے اختیار میں جان تھی اس نے لے لی۔اس واقعے سے ہمیں صرف اللہ کے بندے سے محبت کا درس ہی نہیں ملا بلکہ بندے کا اللہ پر یقین کا سبق بھی ملتا ہے ۔واقعی ''جب انسان خاموش ہوجاتا ہے تو اس کی جگہ اس کا رب بولتا ہے''۔

قومی اتحاد

اورنگ زیب اعوان۔ایم اے۔ بی ایڈ۔
سابق سٹوڈنٹ زمیندار کالج 1956-58

ضلعی علاقائی اور صوبائی تعصب کو ہٹا کر صرف اسلام کا نعرہ لگا کر اتحاد کی فضا قائم ہوسکتی ہے۔قوم ایک ایسا لفظ ہے جس کے معنوں کو جاننا ضروری ہے۔زمانہء دراز سے جس کی ابتدا تاریخی زمانہ سے بھی بالاتر ہے۔قوموں کا شمار کسی بزرگ کی نسل میں ہونے یا کسی ملک کا باشندہ ہونے تک ہوتا تھا۔محمد ﷺ نے اس نظریہ قومی کو جو صرف دنیاوی اعتبار سے تھا، مٹا دیا اور ایک روحانی قومی رشتہ قائم کیا جو ایک جبل لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ سے مضبوط ہے۔تمام قومی سلسلے، تمام قومی رشتے سب کے سب اس روحانی رشتے کے سامنے نیست و نابود ہوگئے۔دوسری قوموں نے قوم کے لفظ کو طرح طرح کے الفاظ سے نوازا۔کسی نے جغرافیائی حدود تک محدود کر دیا تو کسی نے اس کی تعریف مادہ پرستوں تک محدود کی۔لیکن اسلام نے کسی سے نہیں پوچھا کہ وہ ترک ہے یا تاجیک، افریقہ کا رہنے والا ہے یا عرب کا، پنجاب میں پیدا ہوا ہے یا انگلستان میں، کالے رنگ کا ہے یا گورے رنگ کا، بلکہ جس کسی نے کلمہ توحید کو مستحکم کیا وہ ایک قوم ہوگیا بلکہ ایک روحانی باپ کا بیٹا۔ مسلمانوں کے نزدیک جغرافیائی حدود بھی لازم نہیں۔کسی نے کیا خوب کہا ہے:

ہر ملک مُلکِ ما است
کہ ملک خدائے ما است

یہاں تک کہ مسلمانوں کے مشہور مجاہد طارق بن زیاد کا قول ہے کہ ہم مسلمان ہیں۔اللہ کی تمام زمین ہمارا گھر ہے۔ایسا کون شخص ہے جو دو بھائیوں کو ایک باپ کا بیٹا نہیں سمجھتا جبکہ خود خدا نے تمام قوموں کو ایک دوسرے کا بھائی فرمایا ہے تو ہم سب کا ایک روحانی باپ کی اولاد ہونے میں کیا شک رہا؟ اس بات کو محسوس کرنے سے نہایت افسوس ہے کہ ہم آپس میں بھائی بھائی تو ہیں مگر مثل برادران یوسفؑ کے ہیں۔آپس میں دوستی، محبت اور یکجہتی کم ہے۔حسد و بغض کا ہر جگہ اثر پایا جاتا ہے جس کا نتیجہ آپس میں نااتفاقی کا باعث بنتا ہے۔

جب سے مسلمان قومیت کے چکر میں پھنسے ہیں اُس وقت سے ہزاروں تکلیفیں انہیں برداشت کرنا پڑ رہی ہیں۔تاریخ کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ جنگ عظیم اول سے پہلے جب سلطنتِ عثمانیہ ریزہ ریزہ ہوئی تو اِس کی صرف اور صرف ایک ہی وجہ قومیت کا چکر تھی۔یعنی انہوں نے قوم کے تصور کو محدود کیا۔کسی دردِ دل نے کیا خوب کہا ہے:

اگر عثمانیوں پہ کوہِ غم ٹوٹا تو کیا غم ہے
کہ خونِ صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا

پھر بھی فروغ مسائل میں اختلاف ہونے کے سبب کسی جبل المتین کی بندش کو توڑا ہے اور اس رشتہ اخوت کو جسے خود خدا نے قائم کیا ہے، جوڑا ہے۔جس مسجد اور امام باڑے سے گزرو، جس قصبے اور شہر میں جاؤ، باہم مسلمانوں کے شیعہ وسُنی۔وہابی و بدعتی، لامذہب و معلد ہونے کی بناء پر آپس میں نفاق و عداوت پاؤ گے۔علامہ اقبال فرماتے ہیں:

فرقہ بندی ہے کہیں اور کہیں ذاتیں ہیں

کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں

قوم ٹکڑے ٹکڑے اور ضعیف ہو گئی ہے۔ ملک کا ایک بڑا حصہ بھی اسی وجہ سے 1970ء میں الگ ہو چکا ہے۔ پس ہماری قوم کی ترقی کا سب سے اول مرحلہ یہ ہے کہ ہم سب آپس کی محبت سے اس عداوت ونفاق کو یکتائی ویکجہتی کے سانچے میں ڈھال دیں۔

اسلام کا عروج بھی بڑی حد تک ربط وضبط، اتحاد اور تنظیم کی مرہون منت ہے۔ شروع شروع میں مسلمان تعداد کے لحاظ سے انگلیوں پر گنے جاتے تھے لیکن قومی اتحاد کی بدولت وہ بہت جلد اوجِ کمال تک پہنچے۔ زمانہ جالیت کے عربوں میں اعلیٰ قسم کی صلاحیتیں تو موجود تھیں لیکن انہیں کسی اعلیٰ مقصد کے لئے تربیت دینے والا کوئی نہ تھا۔ آفتاب اسلام کوہِ فاران کی چوٹیوں سے طلوع ہوا عرب کے افق پر ظلمت کی گھنگور گھٹائیں چھار ہی تھیں لیکن رسول اللہ ﷺ کی اعلیٰ تعلیم وتربیت سے بہت جلد عربوں جیسی اور جاہل قوم تہذیب کی بلندیوں تک جا پہنچی۔

قائداعظمؒ نے 21 مارچ 1948ء کوڈھاکہ کے جلسہ عام سے خطاب کیا اور اتحاد ملی پر زور دیتے ہوئے فرمایا:

''میں جانتا ہوں کہ آپ بنگالی، پنجابی، سندھی اور پٹھانی وغیرہ کی اصطلاحوں میں باتیں کرتے ہیں۔

میں جانتا ہوں کہ سب اپنی اپنی جگہ پر وحدتیں ہیں لیکن میں یہ پوچھتا ہوں کہ کیا آپ وہ سبق بھول گئے ہیں جو 1400 سال پہلے آپ کو سکھائے گئے تھے۔ پس یہ کہنے کا آخر کیا فائدہ؟''

ہم بنگالی ہیں۔ ہم سندھی ہیں ہم پٹھان ہیں، ہم پنجابی ہیں لیکن ہم مسلمان ہیں۔ اسلام نے ہمیں یہی سبق دیا ہے۔ اور آپ مجھ سے اتفاق کریں گے کہ آپ خواہ کچھ بھی ہوں آپ اول وآخر مسلمان ہیں۔

اگر خود کو ایک قوم، ایک عظیم قوم کے سانچے میں ڈھالنا ہے تو خدا کے لئے اس صوبائی عصبیت کو ترک کر دیجئے۔

وہ زمانے میں معزز تھے مسلماں ہو کر

اور ہم خوار ہوئے تارکِ قرآں ہو کر

ہمیں چاہئے کہ ہم ملت کو اپنے آپ میں پیدا کرنے کی انتہائی کوشش کریں کیونکہ ملت ایک ایسی حقیقت ہے جس کے بغیر اتحاد ناممکن ہے۔

علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں:

بتانِ رنگ و بو کو توڑ کر ملت میں گُم ہو جا

نہ تو رانی رہے باقی نہ ایرانی نہ افغانی

اتحاد کی فضا کو قائم کرنے کی جس کی ہم کو ضرورت ہے ایک اور عقلی راہ ہے۔ جس کی پیروی قومی اتحاد کے ذریعے ہو سکتی ہے۔ ہم کو کسی شخص سے اس خیال پر کہ وہ شیعہ ہے یا سُنی، وہابی ہے یا بدعتی، میانوالی کا رہنے والا ہے یا گجرات کا، اس کے ساتھ کسی قسم کی عداوت و مخالفت نہیں رکھنی چاہئے۔ بلکہ اُن کو بھی بھائی اور کلمہ کا شریک سمجھنا چاہئے۔
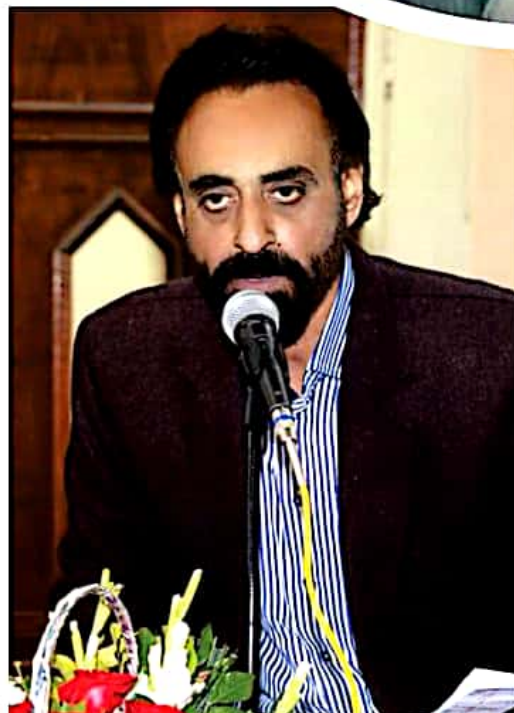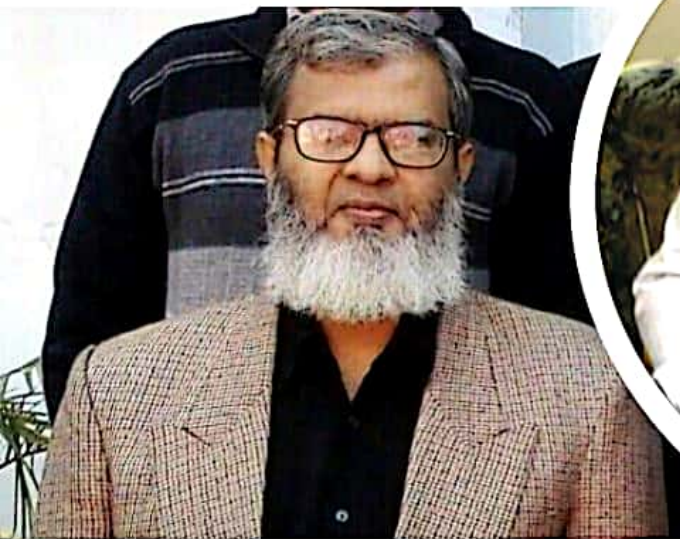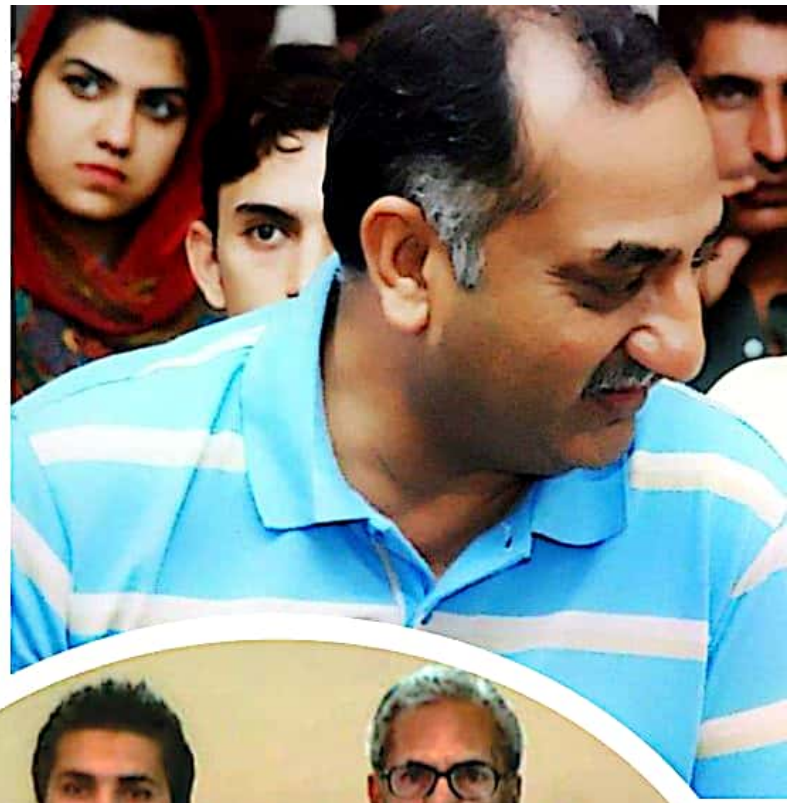
جن سے مل کر زندگی سے عشق ہو جائے وہ لوگ

پروفیسر کلیم احسان بٹ

(پرنسپل گورنمنٹ عبدالحق اسلامیہ کالج جلالپور جٹاں گجرات)

میانہ قد؛ سفیدی مائل گندمی رنگ؛ پچکے گال؛ نزار بدن؛ جسے دیکھتے ہی شوگر کا یقین ہو جائے ؛ان کی بے تعلق آنکھوں پر نظر کی عینک ،سفید بال۔جن میں ابھی کچھ کچھ سیاہی جھانکتی تھی؛ سیدھا سینہ۔ جسے قصداً ذرا اور اکڑا لیتے ؛عموماً پینٹ شرٹ اور کبھی شلوار قمیض میں ملبوس؛ یہ تھے شعبہ اردو کے طارق محمود طارق۔

میری ان سے پہلی ملاقات 1985ء میں ہوئی ہوگی۔ہم سال سوم اردو ادب کے طالبعلم واحد صاحب سے کالج کے اندر موجود ان کی رہائش گاہ پر پڑھنے کے لیے جایا کرتے تھے۔وہیں ان سے ملنے والوں میں جہاں دیگر اساتذہ کثرت سے آتے ان میں طارق صاحب بھی تھے۔ واحد صاحب ان کے بہت بڑے مداح تھے۔طارق صاحب واحد صاحب کے شاگردوں میں سے تھے۔ صاحب مطالعہ شخص تھے۔انہوں نے اردو کے ساتھ ساتھ فلسفہ،تنقید اور انگریزی ادب پر ڈھیروں کتابیں پڑھ رکھی۔درس وتدریس سے منسلک ہونے سے قبل وہ نیشنل سنٹر گجرات میں ملازم رہ چکے تھے اور وہاں انہوں نے اپنی دلچسپی کی کوئی کتاب ایسی نہ چھوڑی تھی جس کا انہوں نے مطالعہ نہ کیا ہو۔ان ابتدائی ملاقاتوں میں؛ سوائے اس کے کہ وہ انتہائی متین اور خاموش طبع انسان ہیں؛ وہ کوئی گہرا تاثر ہمارے ذہنوں پر نہیں چھوڑ سکے۔زمیندار کالج میں ایم اے اردو کے دوران میں ان سے شاگردی؛ دوستی؛ محبت اور عقیدت کا سفر تھوڑی ہی مدت میں طے ہو گیا۔ان کے جوہر ابھی مجھ پر کھلنا شروع ہوئے بڑے عجیب انسان۔تضادات کا مرقع۔ان کا شعر یاد آ گیا۔

کسی کی کیا خود اپنی سمجھ نہیں آتی
میں خود عجیب ہوں طارق عجیب کس کو کہوں

بظاہر وہ جتنے سنجیدہ اور متین تھے دراصل اس سے کہیں زیادہ شرارتی اور ذہین تھے جملہ کسنا ان کی عادت نہیں تھا لیکن ایسے ایسے جامع اور کٹیلے جملے تخلیق کرتے کہ مدتوں چبھتے رہتے۔واحد صاحب کے بارے میں ان کا قول تھا"پورے کالج میں پروفیسر کے شوپیس کے طور پر صرف واحد صاحب کو پیش کیا جا سکتا ہے" پروفیسر مظہر اکبر انتہائی خشک مگران سے بھی چھیڑ میں چوکتے نہیں تھے۔انہیں ملا وجودی کہا کرتے۔وہ جتنے خاموش طبع تھے اس سے کہیں بڑھ کر قہقہہ باز۔ان کا قہقہہ پورے سینے سے نکلتا اور پورے ماحول پر چھا جاتا۔خالی غباروں میں ہوا بھرنے اور پھولے ہوئے غباروں سے ہوا نکالنے کا فن انہیں خوب آتا تھا۔جی میں آیا تو ذرے کو آفتاب کر دیا اور جب جی چاہا نام نہاد عظمت کو منٹوں میں زمیں بوس کر دیا۔طارق صاحب بڑے اور بدنام شخص میں تحسین اور داد کا کوئی نہ کوئی پہلو ڈھونڈ لیتے تھے،اسی طرح عظیم اشخاص کے کمزور پہلو بھی ان کی نظر سے اوجھل نہیں رہ پاتے تھے۔کہ طارق صاحب کو ناصر کاظمی کی طرح آوارگی کی لت تھی۔مبارک احمد اور ایک آدھ اور دوست جس کا نام اب میرے ذہن سے اتر چکا ہے۔کے ساتھ مل کر انہوں نے سڑکوں سڑکوں گلیوں گلیوں آوارگی کی۔میں نے ابھی ایم اے کے دوران میں ان کے ساتھ مل کر گجرات کی گلیوں کی خاک چھانی۔وہ کالج میں ہی میرے ساتھ پروگرام بنا لیتے کہ آج گجرات کے تاریخی مقامات دیکھیں گے اور کچھ کھائیں پئیں گے۔کالج سے نکل کر مرغزار کی گلیوں میں گھومتے گھومتے جیل چوک جا نکلتے۔وہاں سے کابلی

دروازہ سے شہر میں داخل ہو کر قلعہ۔ اکبری حمام اور دیگر عمارات کا نظارا کرتے ۔ یہاں سے شاہدولہ دروازہ اور پھر شاہدولہ دربار کے پیچھے پیچدار گلیوں میں گھوم گھوم کر ان کے گھر کے قریب ایک دکان سے کباب وغیرہ کھاتے ۔ دوستی محبت کے حلقے میں داخل ہوئی تو اس سے اگلے قدم پر اصرار کرنے لگا کہ گھر چلتے ہیں اور بھابی کے ہاتھ کا پکا کھانا کھاتے ہیں بہت دیر ٹالتے رہے لیکن آخر کار مجھے کامیابی ملی اور پھر یہ سفر ان کے گھر جا کر ختم ہوتا۔ اپنے والد صاحب سے وہ بہت ڈرتے تھے اور ان کی سخت گیری سے خائف ۔ گھر میں بیٹھک نما کمرے میں ان کے والد کا بستر تھا اور وہ وہیں لیٹے رہتے تھے میرے آنے جانے سے ایک مانوسیت کا رشتہ پیدا ہو گیا۔ میں نے انہیں کبھی سخت لہجے میں بات کرتے نہیں دیکھا لیکن لہجہ میں تحکم کا احساس ضرور ہوتا تھا۔ ان کا بھائی ساجد بھی میرا دوست بن گیا۔ طارق صاحب کے شخصی تضاد ہر جگہ کار فرما تھے ۔ اس قدر دوستی اور محبت کے باوجود کبھی کبھار وہ بالکل لاتعلقی کا اظہار کرتے ۔ کالج سے اکٹھے نکلتے لیکن وہ اکیلے تانگے پر بیٹھ جاتے ۔ گھر حاضر ہوتا تو کہلوا بھجتے کہ گھر پر نہیں ۔ اب میں ان کے ساتھ تکلف کا رشتہ نہیں رکھتا تھا۔ ایک دن دروازہ کھٹکھٹایا تو ساجد باہر آیا اور کہا کہ وہ سسرال گئے ہیں ۔ میں نے کہا کوئی بات نہیں آپ دروازہ کھولو میں آپ کے والد صاحب کے پاس بیٹھتا ہوں وہ جب آئیں گے ان سے مل لوں گا۔ وہ اندر گیا اور ایک مرتبہ پھر پیغام دیا کہ وہ شام تک آئیں گے میں نے کہا کوئی بات نہیں تم کھانے کا انتظام کرو میں ان کا انتظار کروں گا ۔ طارق صاحب دوسرے دروازے سے نکل کر بھاگ رہے تھے کہ پکڑے گئے ۔ اس کے بعد انہوں نے میرے ساتھ کبھی ایسا نہیں کیا اسی طرح کے متضاد عناصر ان کی گفتگو میں بھی پائے جاتے ہیں ۔ وہ فلسفے کے پیچدہ مسائل کو انتہائی سلیس انداز میں بیان کر لیتے تھے اور ایک عام سی بات کو بھی ایسا پیچیدہ بنا دیتے کہ ہم اس میں فلسفہ ڈھونڈ ڈھونڈ ہلکان ہو جاتے ۔ ان کی نظم و نثر بھی اس تضاد سے خالی نہیں ۔ شاعری میں وہ غالب سے متاثر تھے اور غالب کو سمجھنے میں ان سے بہتر کوئی شخص میری ملاقات میں نہیں رہا۔ وہ غالب کے ادق سے ادق مضامین کو آسانی سے بیان کر دیتے اور اس کے بظاہر سادہ مضامین میں خیالات کے تہ در تہ ایسے سلسلوں تک لے جاتے کہ غالب کی سادگی اس کی پرکاری سے جا ملتی ۔ لیکن خود شعر کہتے ہوئے وہ افراط و تفریط کا شکار ہو جاتے ہیں ۔ ان کے بہت سے مصرعے بھاری بھرکم ۔ عربی و فارسی الفاظ و تراکیب سے سجے ہیں ۔ متشخص مستلزم ۔ مستضعفین ۔ منہزم جیسے الفاظ غرابت پیدا کرتے ہیں اکثر جگہ اخافتوں کا سلسلہ تین تین چار چار الفاظ تک جا پہنچتا ہے لیکن ان کے ساتھ دوسرے مصرع انتہائی سادہ اور رواں ہوتا ہے لیکن جہاں سادگی دونوں مصرعوں میں موجود ہے وہاں وہ غالب کی سی سادگی و پرکاری پیدا کرنے میں کامیاب ہیں

تمہارے قرب نے بکھرا دیا تھا
تمہارے ہجر نے یکجا کیا ہے

☆☆☆

غمِ زمانہ سے فرصت اگرچہ کم ہی ملی
میں تیری یاد کے لمحوں میں بار ہا رویا

☆☆☆

ہوائے تیز ہر اک سمت سے مزاحم تھی
شکستہ پر تھا مگر دیکھ لو کہ اڑتا رہا

☆☆☆

ہزار کام تھے اس عشق میں مگر طارق
کچھ اور کر نہ سکا صرف شعر کہتا رہا

ان کا مجموعہ ''شہر ہجر'' کے نام سے چھپا تھا لیکن طباعت کا معیار ناقص تھا۔ اس لیے یہ مجموعہ انتہائی قریبی دوستوں کے سوا کسی کو نہیں دیا۔ میں نے زبردستی ان سے اس مجموعہ کی آٹھ دس کاپیاں نکلوالیں۔ آخر عمر تک وہ اس مجموعے کی مکرر اشاعت کی خواہش و کاوش کرتے رہے مگر یہ مجموعہ بار دگر چھپ نہیں سکا۔ طارق صاحب کی عادت تھی کہ فلسفہ تنقید کی جو بھی انگریزی کتاب پڑھتے اس کے مطالب کی تلخیص اردو میں لکھتے رہتے۔ یہ تحریریں ترجمہ نہیں بلکہ کتاب کے جوہر خاص کا احاطہ کرتی ہیں اور بہت اہم ہیں لیکن ان تحریروں کی اشاعت بھی ممکن نہ ہو سکی۔ وفات سے کچھ ماہ قبل طارق صاحب نے مجھے فون کر کے کہا کہ انہوں نے کچھ علامتی کہانیاں لکھی ہیں اور مجھے سنانا چاہتے ہیں۔ میں نے وعدہ کر لیا کہ پنڈی سے جب گھر آوں گا۔ آپ کی طرف حاضری دوں گا۔ اور پھر جب ایک دن میں نے فون کر کے حاضر ہونے کی اجازت طلب کی تو انہوں نے اصرار کیا کہ میں بیوی بچوں کو ہمراہ ضرور لاؤں۔ ان کے اصرار پر میں نے مشروط وعدہ کر لیا کہ آپ تکلف نہیں کریں گے اور کھانا گھر سے کھا کر نکلیں گے۔ حسب وعدہ جب دوپہر کے کھانے سے فارغ ہو کر ان کے ہاں پہنچے تو بہت دیر ان کے پاس بیٹھنا نصیب ہوا وہ بہت کمزور ہو چکے تھے۔ دنیاں جہاں کی باتیں ہوئیں۔ مگر علامتی کہانیوں کی نوبت نہ آئی اور پر تکلف کھانا چننے کا اہتمام ہونے لگا۔ میں نے کہا کہ ہم کھانا کھا کر آئے ہیں اور میں نے آپ سے کہا تھا کہ تکلف نہیں فرمائیں گے۔ کہنے لگے یہ تکلف نہیں مری خواہش ہے۔ میں نے خفا ہونے کی اداکاری کی اور ہنستے ہوئے کہا کہ اگر ایسا پر تکلف کھانا ملنے کی امید پہلے دلا دیتے ہم گھر سے کھا کر تو نہ آتے اور زیادہ سے زیادہ آپ کی دعوت کے مزے اڑاتے۔ کھانے کے بعد چائے کا دور چلا اور پھر مجھے خیال آیا کہ اب گھر چلنا چاہیے لیکن وہ علامتی کہانیاں تو طارق صاحب نے سنائی ہی نہیں۔ میں نے فرمائش کی تو پہلے ٹالا کہ یہ تو آپ کو بلانے کا بہانہ تھا۔ لیکن اصرار پر کچھ کاغذات اٹھالائے۔ ایک کہانی سنائی میرے سر سے گزر گئی، پھر دوسری سنائی کچھ پلے نہ پڑی۔ پھر ان دونوں کہانیوں میں جو کہا گیا تھا سمجھانے کی کوشش کی۔ اگر کوئی کہانی رہ گئی تھی تو اسے سنانے کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ اس کے بعد نہ ان سے ملاقات ہوئی۔ نہ فون پر بات کہ اچانک وقار صاحب کا فون آیا کہ طارق صاحب وفات پا گئے ہیں۔ اور ان کا جنازہ فلاں جگہ فلاں وقت ہوگا۔ میں اڑ کر پہنچنا چاہتا تھا مگر اس دن ان اوقات میں کچھ ایسی سرکاری مصروفیات تھیں کہ میں حاضر نہیں ہو سکتا تھا۔ میں نے گھر بیوی کو فون کیا اور کہا کہ آپ لوگ پہنچیں۔ منیب کو فون کیا کہ وہ جا کر جنازے میں شریک ہو۔ بہت دیر ان پر کچھ لکھنے کی کوشش کرتا رہا۔ مگر کوئی تحریر میرے جذبات کا احاطہ کرنے سے قاصر تھی۔ وقار صاحب نے شاہین میں ان کے گوشے کے لیے کہا تو جلدی میں جو بن پایا لکھ دیا۔

جن سے مل کر زندگی سے عشق ہو جائے وہ لوگ
آپ نے شاید نہ دیکھے ہوں مگر ایسے بھی ہیں

سو یا وہ زیرِ خاک تو اِک عہد سو گیا

شیخ عبدالرشید
(میڈیا اینڈ پبلی کیشنز ڈائریکٹر UOG)

ارنسٹ ہیمنگوے نے کہا تھا کہ ہر آدمی کی زندگی کا انت ایک جیسا ہوتا ہے، صرف ایک چیز اسے دوسروں سے منفرد بناتی ہے اور وہ یہ کہ اس نے زندگی کیسے گذاری اور اسے موت کیسے آئی؟ یہ بات اتوار کی دوپہر مجھے اس وقت یاد آئی جب خاموش طبع دانشور، استاد پروفیسر طارق محمود طارق کی وفات کی اطلاع بذریعہ وٹس ایپ برادرم پروفیسر کلیم احسان بٹ نے دی۔ موت انسان کا مقدر ہے۔ موت کی فاتحانہ یلغار ہر چھوٹے، بڑے آدمی کو اَن جانے ماضی سے اس مستقبل تک لے جاتی ہے، جس کے بارے میں کوئی پیش گوئی نہیں کی جا سکتی۔ ان کے انتقال پُر ملال کی خبر سنتے ہی ان کی یادوں نے ارد گرد ڈیرا آ لگایا۔ معصوم شکل، سنجیدہ مزاج اور دبلے جسم کے طارق محمود طارق دھیمے مزاج کے پورے آدمی تھے۔ نزاکت ان کی شخصیت کا حصہ تھی۔ وہ چلتے بھی اتنی آہستگی سے تھے کہ کہیں زمین پر پاؤں رکھنے سے زمین کو درد نہ ہو۔
درحقیقت وہ اتنے نفیس انسان تھے کہ کسی قسم کی سختی ان کے مزاج کا حصہ ہی نہیں تھی۔ زمیندار کالج کے اساتذہ کی کثیر تعداد کے باوجود وہ اپنے نرم مزاج اور پُر وقار انداز کی بنا پر الگ ہی نظر آتے تھے۔ جس متانت و وقار سے زندہ رہے تھے اسی خاموشی اور باوقار انداز میں داعی اجل کو لبیک کہہ گئے۔

کاروانِ زندگی پیہم رواں ہے صبح و شام
اس فنا کے دیس میں، حاصل ہوا کس کو قیام
پھول جو کھلتا ہے، وہ اک دن یہاں مرجھائے گا
یہ سرائے فانی ہے، جو آئے گا، وہ جائے گا

پروفیسر طارق محمود طارق 15 جولائی 1950ء کو گجرات شہر میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم کے بعد پبلک ہائی سکول سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ حالات نے مزید تعلیم سے بہت روکا لیکن انہوں نے انٹرمیڈیٹ سے ایم اے تک تعلیم کے تمام درجات لگن اور محنت سے پرائیویٹ امیدوار کے طور پر پاس کیے۔ وہ اپنے علمی و ادبی ذوق کی بدولت شعر و ادب سے وابستہ ہوئے اور گجرات کی علمی و ادبی محفلوں کا حصہ بنے۔ گجرات میں مبارک احمد کے متحرک حلقے اور حلقہ ارباب ذوق کی ادبی بیٹھکوں کے فعال ممبر رہے۔ انہیں ذوق مطالعہ کی تسکین کے لیے اس زمانے کے نیشنل سنٹر کی لائبریری میں ملازمت کا موقع ملا تو انہوں نے گجرات کے نیشنل سنٹر کو ادبی تقریبات کا مرکز بنانے میں بھر پور حصہ لیا۔ وہ نیشنل سنٹر کی کتابوں کے محافظ بھی تھے، انہوں نے لائبریری میں بیٹھ کر کتب بینی کو ہی اپنا مشغلہ بنالیا۔ ہر وقت کتاب پڑھنا ان کی عادت بن گئی۔ اپنے مطالعے اور ادب دوستی کی بدولت وہ 1987ء میں گورنمنٹ زمیندار کالج کے شعبہ اُردو سے وابستہ ہو گئے۔ وہ شریف النفس انسان، کتاب دوست استاد اور صاحب مطالعہ دانشور تھے، اس لیے صرف طالبعلموں کے پسندیدہ استاد ہی نہیں تھے بلکہ اساتذہ بھی ان کی علمی وجاہت اور تنقیدی فکر کے دلدادہ تھے۔ وہ مزاجاً محفل باز نہیں تھے، تفکر و تدبر کی عادت کے حامل ہونے کے ناتے اکیلے بیٹھ کر غور و فکر کو ترجیح دیتے تھے۔ لیکن کیا کیجئے جہاں روشنی ہو گی پروانے تو جمع ہو ہی جاتے ہیں۔ لہذا طارق صاحب جہاں بیٹھتے ان کے چاہنے والے وہیں علمی

مکالمے کی محفل جما لیتے تھے۔علی گڑھ کی روحانی میراث کا حامل زمیندار کالج اس زمانے میں حقیقی معنوں میں علم وادب کا گہوارہ تھا اس کا تدریسی ماحول علمی شناخت کا حامل تھا۔طارق محمود طارق اس کالج کے شعبہ اردو کا مان تھے۔فرض شناس تدریسی مہارتوں کے حامل ہونے کے ساتھ ساتھ وہ پختہ تنقیدی وفکری دانش کے علمبردار تھے۔وہ ادب شناس ہی نہیں سراپائے ادب وتہذیب بھی تھے،کسی بھی علمی محفل میں انکی موجودگی بڑی با برکت سمجھی جاتی تھی۔وہ کم گو تھے اور اکثر ہلکی اور میٹھی مسکراہٹ سے ہی کام چلالیا کرتے تھے لیکن جب کسی بھی موضوع پر بولتے تو سامعین کے پاس ہمہ تن گوش ہونے کے علاوہ چارہ نہ ہوتا تھا۔دانش وتفکر سے لبریز گفتگو ادبی اسلوب اور فلفسیانہ پیرائے میں شروع کرتے تو سننے والے سر دھنتے رہ جاتے تھے۔شعبہ اردو کے نوجوان اساتذہ اپنی کلاسیں پڑھانے کے لیے لیکچر کی تیاری کے لیے ان کے گھٹنے پکڑ کر بیٹھ جاتے تھے اور کئی تو ان سے سنی باتوں کو بیان کر کے دانشوری ظاہر کرتے تھے۔وہ بھی بڑے انہماک سے جواں عزم اساتذہ کی راہنمائی کرتے اور انہیں کتاب دوستی کا درس بھی دیتے۔برادرم پروفیسر کلیم احسان بٹ کی دوستی کی بدولت شعبہ اردو کے اساتذہ سے میرا محبت اور احترام کا خاص رشتہ تھا۔کلیم صاحب محفل باز آدمی تھے اور حاضر جوابی سے محفلوں کو کشت زعفران بنانے کا گُر خوب جانتے تھے۔وہ طارق صاحب کے شاگرد بھی تھے اور اب ان کے ساتھی تھے۔وہ طارق صاحب کو اکثر لے کر کنٹین پر آجاتے اور پھر محفل جم جاتی۔زمیندار کالج کی کنٹین ان دنوں کالج کا ”پاک ٹی ہاؤس“ ہوا کرتی تھی۔اساتذہ وہیں بیٹھ کر دل کی بھڑاس نکالتے تھے۔پروفیسر عبدالواحد،سیف الرحمان سیفی،بہاء الحق عارف،سید مظہر علی شاہ،سید محفوظ علی شاہ،محمد اسلم اعوان،منیر الحق کعبی،حکیم سید صابر علی،ظفر اقبال ہاشمی ایک سے بڑھ کر ایک نگینہ وہاں اپنی اپنی محفل جما کر بیٹھا ہوتا تھا۔نوجوان اساتذہ میں سے میاں انعام الرحمان،راشد اللہ بٹ،کلیم احسان بٹ،سید وقار افضل،ڈاکٹر وسیم گردیزی،سید فیاض حسین شاہ،راجہ خالد،ملک شفیق،ناصر وڑائچ سمیت بہت سے دوست محفل جماتے اور وہاں ہلکی پھلکی گفتگو کے ساتھ دنیا بھر کے ادبی نظریوں،فکری زاویوں،حالات حاضرہ اور شعر ونقد کا محاکمہ کرتے۔طارق صاحب ان محفلوں کا حصہ ہی نہیں جانِ محفل ہوا کرتے تھے۔

میں نے ان سے بہت کچھ سیکھا۔ایک روز عرض کیا کہ طارق صاحب تمام تر سخنوری کے باوجود ہم اعلیٰ ادب کیوں تخلیق نہیں کر پا رہے؟ طارق صاحب کے الفاظ اب بھی میرے کانوں میں گونج رہے ہیں کہ ”دولت کی زیادتی،اخلاقی وسیاسی زوال اعلیٰ خیالات کی موت ہے۔جب اعلیٰ فکر نہ ہو تو اعلیٰ ادب کیسے پیدا ہو سکتا ہے“۔میں چھٹی کے بعد اکثر ان کے ہمراہ کچہری چوک تک پیدل جاتا تھا تاکہ راستے میں گفتگو کے ذریعے ان سے استفادہ کرتا رہوں۔مجھے لکھنے کا شوق تھا میں نے اس حوالے سے بات کی تو کہنے لگے شیخ صاحب! ”بڑی کتاب لکھنے کے لیے موضوع بڑا ہونا چاہیے“۔زمیندار کالج کی کینٹین کی علمی مباحثوں اور فکری مکالموں کی روایت بڑی شاندار تھی۔طارق محمود طارق ان میں باقاعدگی سے شریک ہوتے اور اکثر اس متانت وسنجیدگی کے ساتھ شریک ہوتے کہ انکی خاموشی بھی کلام کرتی تھی،ان کی سادگی،نفاست اور احترام انسانیت کے جذبے کی وجہ سے ہر کوئی ان کا بہت احترام کرتا تھا۔

تہذیب و آگہی کے سبق اس کے نطق میں
دل کی صداقتوں سے منور تھی اس کی ذات

طارق محمود طارق فطرتاً شاعر تھے۔ان کی اردو شاعری کا اکلوتا مجموعہ 1984ء میں ”شہر ہجر“ کے نام سے شائع ہوا۔شاعری سے حقیقی معنوں میں لطف اندوزی ایک ایسی استغراقی کیفیت کا تقاضا کرتی ہے جس میں حس،فکر اور جذبے کے عناصر باہم آمیز ہو کر ایک طبعی سکون پیدا

کرتے ہیں۔ شاعری اپنی تخلیق سے پہلے اور بعد بھی، انسان کے تمام و کمال تجربے سے تعلق رکھتی ہے۔ انسانی تجربے کے سارے عناصر، فکر اور جذبے کی ہر کاروائی اس پر اثر انداز بھی ہوتی ہے اور اس سے اثر اندوز بھی ہوتی ہے۔ طارق صاحب شعر پسندی میں استغراق شعر کے درجے پر فائز تھے یعنی شعر فہمی میں بھی انہیں کمال حاصل تھا۔ شعر کے مرکزی تجربے میں داخل ہونا، عقلی و عملی سیاق و سباق سے جداگانہ چیز ہے۔ اپنی خالص ترین صورت میں شاعری کو فکر سے کوئی تعلق نہیں ہوتا، کیونکہ فکر و عمل دونوں اس کے استغراق کے موضوع بن جاتے ہیں۔ طارق صاحب شاعرانہ تجربے کے اس درجے کی بنیاد پر ہی نقد و نظر کے رموز سے آشنا ہوتے تھے اور انہوں نے میر اور مجید امجد جیسے شعراء پر لکھتے ہوئے اسی تجربے سے رس کشید کیا۔ ان کے نثری و تنقیدی مضامین ''ماہِ نو''، ''اوراق'' اور زمیندار کالج کے مجلّے ''شاہین'' کی زینت بنتے رہے ہیں۔ موصوف تنقیدی نثر میں بھی منفرد اسلوب کے مالک تھے۔ نفسیاتی اور فلسفیانہ حوالوں سے فن پاروں کا ماہرانہ تجزیہ کرتے تھے۔ شعروں کا تنقیدی جائزہ لیتے اور فن پاروں میں خوبصورتیوں کے متلاشی رہتے تھے۔ ان کی تحریریں خاص خوشبو کی حامل ہیں۔

برادرم طارق محمود طارق جیسے فہم و ادراک والے افراد کی محفلوں کا ہی اثر ہے کہ محبت نے میرے آنسوؤں کو اُداس کیفیت میں بہنے کا ہنر سکھایا ہے اور میرے دل کو ماتمی گیتوں سے روشناس کرایا ہے۔ طارق صاحب کی وفات کی خبر ملی تو ان کے چاہنے والے سید وقار افضل کو فون کیا کہ تدفین کہاں ہوگی؟ معلوم ہوا کہ انہوں نے گڑھی کے علاقے سے رہائش قمر سیالوی روڈ پر منتقل کر لی تھی، تاہم تدفین آبائی علاقے میں ہی ہوگی۔ میں نے اپنی ساری مصروفیات ترک کیں اور سخن شناس دوست ڈاکٹر غلام علی سربراہ شعبہ علوم ترجمہ جامعہ گجرات کو ساتھ لیا اور شاہدولہ روڈ پر چاہ بیری والا قبرستان میں حقیقی دانشور استاد کی تدفین میں شرکت کے لیے نمناک آنکھوں اور بوجھل دل سے پہنچا۔ طارق محمود طارق کافی عرصے سے شوگر جیسے مرض اور اسکے اثرات کا شکار تھے اور چند دنوں سے لاہور میں زیر علاج تھے۔ 18 نومبر کی رات راہِ حق کے مسافر ہو گئے، تاہم ان کے بیٹے کی امریکہ سے آمد پر 19 نومبر بروز اتوار دن دو بجے ان کی نماز جنازہ مولوی امین مدنی نے پڑھائی، اور پھر اہل خانہ اور دوست احباب کی سسکیوں و آہوں کے سایے تلے، نمناک آنکھوں اور ڈھیروں دعاؤں کے ساتھ مسجد حاجی حسن سے ملحق قبرستان چاہ بیری والا میں اس علمی چراغ کو سپرد خاک کر دیا گیا تاکہ زیر زمین بھی روشنی ہو۔ وہ اتنے شریف النفس اور پاکباز تھے کہ ان کے لیے مغفرت کی دعا اور جنازہ میں شرکت مجھ سمیت حاضرین کے لیے باعث بخشش ثابت ہوگی۔ بلاشبہ وہ گجرات کے ان اساتذہ میں شامل تھے جنھیں اسلاف کی عظمت کی نشانی قرار دیا جاسکتا ہے اور مطالعہ و کتب بینی جن کی آخری سانسوں تک جاری رہی۔ طارق صاحب مطمئن آدمی تھے لیکن یہ سچ ہے کہ آدمی اس وقت تک خوش نہیں ہوتا جب تک اس کا آخری دن نہ آجائے اور وہ سرحد پار نہ کر جائے جو زندگی کو موت سے الگ کرتی ہے۔ اللہ کریم انہیں جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔ آمین

کس منہ سے کہیں کہ وہ ہم میں نہیں رہا
کیسے کہیں کہ ہم کو میسر تھی اس کی ذات

☆☆☆☆

بہ نذرِ طارق محمود طارقؔ

(خاور بوسالوی)

(اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ اردو، زمیندار کالج گجرات)

اے مرے دوست خوئے سادہ مزاج زندگی پر ہے اختیار کسے
کم ہے، لفظوں کا جتنا بھی ہو خراج راس آئی ہے یہ بہار کسے
تو جو بچھڑا، ہوا ہے غم کا رواج دوستوں میں کروں شمار کسے
دلِ مضطر کو چین کل تھا نہ آج اب پکاروں گا باربار کسے

مطمئن میں جو زندگی سے ہوا تُو بسا "شہرِ ہجر" میں جا کر
آشنا جذب و آگہی سے ہوا زندگی پوچھتی ہے آ آ کر
ربط میرا جو روشنی سے ہوا تھک گیا ہوں اُسے یہ سمجھا کر
جو ہوا، تیری دوستی سے ہوا لوٹتا کون ہے وہاں جا کر

تُو نہیں پھر بھی مجھ کو راس ہے تُو ہائے وہ دور وہ ملاقاتیں
ایسے لگتا ہے آس پاس ہے تُو رمز و ایمائیت کی وہ باتیں
تُو یقیں بھی، مرا قیاس ہے تُو وہ ترا سحر، وہ کراماتیں
زندگی پھول، اُس کی باس ہے تُو اب نہ وہ دن ہیں اور نہ وہ راتیں

زیرِ لب وہ تری ہنسی توبہ تُو نہیں پر ترا خیال تو ہے
قہقہہ بھی کبھی کبھی توبہ رونقِ یاد ماہ وسال تو ہے
چلتی پھرتی سی سادگی توبہ زیست خاورؔ سدا وبال تو ہے
یوں بھی ہوتا ہے آدمی توبہ مطمئن ہوں، تری مثال تو ہے

ہر یوسف کی اپنی تقدیر ہے

میاں انعام الرحمن

اسسٹنٹ پروفیسر شعبہء سیاسیات   گورنمنٹ پوسٹ گریجویٹ اسلامیہ کالج گوجرانوالہ

ابھی کل کی بات ہے ۱۹۹۶ میں سروس کی پہلی جائننگ کے فوری بعد، پروفیسر طارق محمود طارق کے ساتھ زمیندار کالج بھمبر روڈ گجرات کی سرسبز و شاداب اوپن ائیر کنٹین میں ملاقاتوں کا آغاز ہوا۔ پروفیسر شیخ عبدالرشید اور پروفیسر کلیم احسان بٹ نے بزرگ دانشور اساتذہ کی سرپرستی میں اس کنٹین کو گجرات کا پاک ٹی ہاوس بنا رکھا تھا۔ خوب محفلیں جمتی تھیں۔ شعبہ فارسی کے پروفیسر سیف الرحمن سیفی شعبہ اردو کے پروفیسر منیر الحق کعبی شعبہ انگلش کے ظفر ہاشمی اور شاہ صاحب (نام یاد نہیں آرہا) شعبہ شماریات کے پروفیسر عبدالستار نیز دیگر احباب اپنے اپنے مخصوص انداز میں ان مجالس کی رونق بڑھایا کرتے تھے۔ اس اوپن ائیر ٹی ہاوس کی پیشہ وارانہ ذمہ داری اشفاق کے سپرد تھی جو بہت خلوص اور لگن سے اپنے فرائض سرانجام دیتا تھا۔ پروفیسر خادم حسین پرنسپل تھے۔ ان کے کیا کہنے، کہ انہی کے دم سے کالج کی روایتی ادبی فضا قائم تھی۔ اس پورے ماحول میں ستاروں کے اس جگمگاتے جھرمٹ میں شعبہ اردو کے پروفیسر طارق محمود طارق، تبحرِ علمی اور دھیمے عاجزانہ مزاج کی وجہ سے الگ منفرد شناخت رکھتے تھے۔ وہ ستارۂ سحری تھے۔

طارق صاحب اچھے نہیں، بہت اچھے سامع تھے۔ میرے جیسے نئے پڑھنے لکھنے والے کو بھی بہت توجہ سے سنتے۔ حوصلہ افزائی ان پر ختم تھی۔ مجھے یاد ہے انہیں بہت سی بے تکی نظمیں اور وزن و بحر سے مکمل آزاد غزلیں سنائیں۔۔۔۔ انہوں نے کمال ضبط اور خندہ پیشانی سے نہ صرف سنیں بلکہ داد و تحسین کے ایسے ایسے ڈونگرے برسائے کہ میں بیاض یافتہ ہو گیا۔ طارق صاحب ادب کے فنی اسرار و رموز سے بخوبی آگاہ تھے لیکن انہوں نے کبھی بھی فنی مداخلت کے ذریعے تخلیقی اپج اور خیال کی ندرت پامال کرنے کی کوشش نہیں کی۔ دِکھنے میں بہت کلاسیکی اپنی ذات میں بند بند تھے لیکن کھلے کواڑ اور کشادہ دریچوں کے حامی تھے۔ وہ اَن دیکھے موسموں کے طرف دار تھے۔ صباحت روشنی اور خوشبو کے جتنے رنگ ہیں جتنے شیڈز ہیں، طارق صاحب کی شخصیت میں دیکھے جا سکتے تھے۔ بہت وسیع المطالعہ ہونے کے باوجود قنوطی نہیں تھے، لیکن ایسا بھی نہیں کہ سادہ لوح رجائی ہوں۔ کسی جہاں دیدہ داستاں گو کے مانند دانا تھے، بسیار گو شیخی خور نہ تھے۔ ان کی گفتگو موسلا دھار بارش نہیں تھی، رم جھم رم جھم پھوار تھی۔۔۔۔ سننے والے کی محض سماعتوں کو نہیں چھوتی تھی۔ فلسفہ نفسیات ادب اور ادب کی جملہ اصناف پر ان کی گہری ناقدانہ نظر تھی۔ اس ناقدانہ نظر نے ان کی فکری شعریات کی خوب آرائش کی تھی اور اس آرائش میں طلسمی رچاوء حیرت افزا جمال تھا۔ طارق کئی اعتبار سے کمال تھا بے مثال تھا۔ پروفیسر طارق محمود طارق کی شخصیت، جو تھی سو تھی بلاشبہ شاندار تھی، لیکن ان کی پہچان ان کا کام بنے گا۔ ان کو شخصی حوالے سے جاننے والے آج ہیں تو کل نہیں رہیں گے۔ اس لیے ان کے دوستوں ان کے چاہنے والوں پر قرض ہے کہ ان کا جس قدر کام منظرِ عام پر لایا جا سکتا ہے، جیتے جی لے آئیں۔ شہرِ ہجر سمیت ان کا غیر مطبوعہ کلام، کلیات کی صورت میں اہتمام کے ساتھ شائع کیا جائے۔ تنقیدی مضامین اور تراجم کو سلیقے سے مدون کیا جائے۔ اگر ایسا ہو جائے تو طارق صاحب، آنے والے برسوں میں ادبی افق پر گجرات کا فخر بن سکتے ہیں۔ خطہء گجرات کو جگمگا سکتے ہیں۔۔۔۔۔ کیا ایسا ہو سکے گا؟ ان کے واحد مطبوعہ مجموعہ کلام ”شہرِ ہجر“ کی ایک نظم کی آخری سطریں کچھ کہہ رہی ہیں:

ہر یوسف کی اپنی تقدیر ہے

اور   ہر   ایک   کے   لیے

سوداگروں   کا   قافلہ   نہیں   گزرتا

تمھارے ہجر نے "بکھرا دیا ہے"

سید وقار افضل

(اسسٹنٹ پروفیسر شعبہء اردو، زمیندار کالج گجرات)

غالباً 1999 کے اوائل کی بات ہے جب کچہری چوک گجرات کے قریب میری پہلی ملاقات طارق محمود طارق صاحب سے ہوئی۔ وہ شاید اُس وقت کلیم احسان بٹ کے ہمراہ زمیندار کالج سے گھر واپس آ رہے تھے۔ کلیم صاحب سے میری شناسائی پہلے سے تھی۔ یہ اس زمانہ کا ذکر ہے جب میں عبدالحق کالج جلال پور جٹاں سے زمیندار کالج، تبادلے کی کوشش کر رہا تھا۔ طارق صاحب سے اِس پہلی ملاقات کے بعد، میرا پہلا تاثر یہی تھا کہ شاید بہت زیادہ حساسیت یا پھر مطالعے نے اِن صاحب کو وقت سے پہلے بوڑھا کر دیا ہے۔ اُس وقت وہ بظاہر کلیم صاحب کے ساتھ تھے لیکن مجھے یوں لگ رہا تھا کہ جیسے وہ اپنے ساتھ بھی نہیں، بس اپنے اندر کہیں گم ہیں۔ کلین شیو اور صاف رنگ کے پس منظر میں اُن کے چہرے کے خدوخال دیکھ کر یوں محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے مصور نے ان کی ناک اور ہونٹوں پر خوب محنت کی ہے لیکن آنکھوں میں سنجیدگی قدرے زیادہ رکھ دی ہے۔ ہلکے آسمانی رنگ کی سادہ شرٹ اور غالباً گرے کلر کی پتلون میں ملبوس طارق صاحب مجھے اُس وقت سنجیدگی کی مجسم تصویر دکھائی دیے۔

ستمبر 1999 میں میرا تبادلہ عبدالحق کالج سے زمیندار کالج ہوا تو اس وقت زمیندار کالج میں ہمارے صدرِ شعبہ، پروفیسر انعام الحق راشد مرحوم تھے۔ انھوں نے مجھے جب ٹائم ٹیبل دیا تو اس میں میرا ایک پیریڈ ایم۔ اے اردو پارٹ ٹو کی کلاس کا بھی تھا۔ ایم اے اردو پارٹ ٹو کی اُس کلاس کے طلبہ کو میں کالج کینٹین میں شعبہء اردو کے اساتذہ کے ساتھ چائے پیتے، نصابی موضوعات پر گفتگو اور خوش گپیاں کرتے دیکھ چکا تھا، وہ کلاس مجھے کچھ زیادہ پُر اعتماد اور تیز لگی۔ میں گھبرا گیا کہ اِس کلاس کو پڑھانا، میرے جیسے نو وارد کے لیے مشکل ہوگا۔ میں نے اپنی اس گھبراہٹ کا اظہار طارق صاحب سے کیا۔ انھوں نے بس یہی کہا کہ آپ جیسے نوجوان دانش ور کے لیے ایم۔ اے کی کلاس کو پڑھانا کون سا مسئلہ ہے۔ میں حیرت زدہ تھا کہ ابھی دو تین ملاقاتیں ہوئی ہیں اور اِنھیں میری اُس خوبی کا بھی پتا ہے، جس کی مجھے آج تک خبر نہیں ہوئی۔ طارق صاحب نے یہ بات کچھ اس انداز سے کہی کہ میں نے نہ چاہتے ہوئے بھی ان کی عطا کردہ دانشوری کو قبول کر لیا اور آج تک حقیقت جانتے ہوئے، اس سے نباہ کر رہا ہوں۔ بہر حال طارق صاحب کی دریافت شدہ دانش وری کا بھرم رکھتے ہوئے، میں نے انعام صاحب سے کہا کہ میں ایم۔ اے کی کلاس لوں گا لیکن پارٹ ٹو کی نہیں پارٹ ون کی۔ اس طرح بالآخر ٹائم ٹیبل کا مسئلہ حل ہو گیا اور جب پارٹ ون کی کلاس کا داخلہ مکمل ہوا تو میں نے بڑے اعتماد کے ساتھ پڑھانا شروع کر دیا اور یوں ایم۔ اے کی کلاس کو پڑھاتے ہوئے مجھے سچ مچ یہ احساس ہونے لگا کہ جیسے میں واقعتاً ایک دانش ور ہوں۔ دن گزرتے گئے اور پھر ایک دن کالج کینٹین پر چائے پیتے ہوئے، میں نے دیکھا کہ طارق صاحب ہمارے ایک کولیگ کو دانش ور، ذہین اور نجانے کیسے کیسے عمدہ القابات سے نواز رہے ہیں۔ اور وہ صاحب، ان کی طرف سے عطا کیے گئے القابات کو اپنے لیے کسی میڈل سے کم نہیں سمجھ رہے۔ میں خاموشی سے طارق صاحب کی باتیں سننے لگا اور ساتھ ہی کن اکھیوں سے اُن صاحب کی طرف بھی دیکھنے لگا۔ اسی دوران میں، میں نے یکا یک اک نگاہ اپنے آپ پر ڈالی تو مجھے ایک دم خیال آیا کہ اگر یہ حضرت دانش ور ہیں اور بقول طارق صاحب، میں بھی دانش ور ہوں تو مطلب ہے کہ ہم دونوں احمق ہیں۔۔۔۔۔ نہیں، ہرگز نہیں۔۔۔ دراصل مجھے اس بات کا

آہستہ آہستہ ادراک ہوا کہ طارق صاحب کے پاس ہر کسی کو اُس کے مسائل اور مزاج کے مطابق ،خوش اور باحوصلہ رکھنے کا ایک تعویذ ہے۔۔۔وہ تعویذ کیا تھا؟ بس یہی کہ اپنے احباب کے مسائل کو غور سے سننا اور پھر اپنی موہنی اور علمی گفتگو سے ان کی تشفی کرنا اور واپسی پر ان کی جھولی میں اپنی ذہانت سے وہ خزانہ ڈال دینا جن کے وہ ان کی طرف سے متمنی ہوتے۔

طارق صاحب ایک صاحبِ اسلوب شاعر تھے۔وہ ''شہر ہجر'' (شعری مجموعہ) کے آشوب سے کیسے گزرے یہ وہی جانتے ہیں لیکن ایک بات ہے کہ اُن میں ایک ادائے محبوبی ضرور تھی۔ وہ عموماً اپنے عشاق کو چھب دکھا کر خود چھپ جاتے۔ڈھونڈنے والے ڈھونڈتے ڈھونڈتے اُن کے گھر تک جا پہنچتے لیکن دروازہ بند دیکھ کر مایوس واپس لوٹ آتے۔مگر جو سچے عشاق ہوتے وہ دروازے پر دھرنا دے دیتے لیکن دھرنا دینے والوں کی کامیابی کا انحصار کلیم صاحب کی موجودگی اور ذہانت سے مشروط تھا کیونکہ وہی ایک تھے جو محبوب کی ہر رمز سے آشنا تھے۔کلیم صاحب ان کے گھر کی بیٹھک کے دروازے کھلوا لیتے اور محبوب کو ناچار دیدار کروانا پڑتا۔میں اپنا کیا کہوں، میں اِس چھپا چھپی سے بچا رہا۔میں نے جب بھی ان کے دروازے پر دستک دی، بیٹھک کا دروازہ کھلا، دیدار ہوا اور فیض بھی ملا۔

طارق صاحب 2010 میں بحیثیت صدرِ شعبہ اردو گورنمنٹ زمیندار کالج گجرات سے اپنی سروس مکمل کرنے کے بعد ریٹائر ہوئے۔وہ ریٹائرمنٹ کے بعد کالج صرف ایک دو مرتبہ آئے۔ان کی ریٹائرمنٹ کے بعد، میں جب بھی ان کے گھر ان سے ملنے جاتا، وہ خصوصاً ان تمام احباب کا حال احوال ضرور پوچھتے جو کالج کینٹین اور سٹاف روم میں ان کے ساتھ بیٹھتے رہے۔میری ان سے، اِن ملاقاتوں کے دوران میں پروفیسر محمد جاوید ساغر عموماً میرے ساتھ ہوتے۔ مجھے یاد ہے کہ جب ساغر صاحب کے ہاں بیٹی کی پیدائش ہوئی تو وہ خصوصاً مجھے طارق صاحب کے ہاں لے کر گئے۔ان کی بیٹی کا نام طارق صاحب نے رکھا۔

نومبر (2016) میں جب وہ بیمار ہونے کے بعد کچھ سنبھلے تو مجھے کہنے لگے کہ زمیندار کالج گئے کافی عرصہ ہو گیا ہے۔اس لیے میں چاہتا ہوں کہ تمام دوستوں سے ملوں اور عبید اللہ صاحب پرنسپل بنے ہیں، انھیں مبارک باد بھی دے آؤں۔اس طرح وہ ایک دن اپنی بیٹی لبنیٰ کے ساتھ کالج آئے، ہم کافی دیر ایم۔اے بلاک کی کینٹین پر بیٹھے، تصاویر بنائیں، سموسے کھائے، اس دوران میں بہت سے پروفیسر صاحبان ان سے ملنے آتے رہے۔ریٹائرمنٹ کے بعد یہ ان کی زمیندار کالج میں پہلی اور آخری باقاعدہ آمد تھی۔

انھی دنوں، جب وہ ایک مرتبہ پھر بیمار ہوئے تو میں اور ساغر صاحب عیادت کے لیے ان کے گھر گئے۔طارق صاحب اصرار کرنے لگے کہ شاہ صاحب آج آپ اپنا کوئی تازہ کلام سنائیے۔ میں نے کہا نہیں سر جب اگلی دفعہ آوں گا تب سناوں گا۔مسکراتے ہوئے کہنے لگے، نہیں، آپ سنائیے، پھر میں نے بھی اپنا کلام سنانا ہے اور چونکہ میں سینئر شاعر ہوں اس لیے پہلے آپ کو اپنا کلام سنانا پڑے گا۔ان کی یہ بات سن کر مجھے خوشی ہوئی کہ آج سر کا کلام ان کی زبانی سننے کو ملے گا۔میں فوراً راضی ہو گیا اور اشعار سنانے شروع کر دیے۔ مجھے ایک دم روک کر کہنے لگے، ٹھہریے ، میں ذرا کاپی پنسل لے آؤں۔ میں نے کہا رہنے دیجیے، مجھے پتا ہے میں جتنا شاعر ہوں۔ انھوں نے میری ایک نہ سنی، مسکراتے ہوئے دوسرے کمرے میں چلے گئے اور کاپی پنسل لے آئے۔اور بیڈ پر بیٹھتے ہوئے کہنے لگے، اب سنائیے اور جو شعر میں کہوں مجھے لکھواتے جائیے۔ میں شعر پڑھتا رہا اور وہ اپنی پسند کے اشعار لکھتے رہے۔یہ ان کا حوصلہ افزائی کا ایک ایسا موہنا انداز تھا کہ مجھ جیسے بہت سے اپنے آپ کو بڑا شاعر سمجھنے لگتے۔طارق صاحب نے اُس دن بھی حسبِ عادت اپنا کوئی کلام نہیں سنایا۔لیکن اُس دن انھوں نے اپنے وہ سارے رجسٹر ہمیں

دکھائے جوان کے کیے ہوئے نایاب انگریزی مضامین کے تراجم سے بھرے ہوئے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ وہ مضامین زیادہ تر ادبیات اورعلمِ فلسفہ سے متعلق تھے۔حیرت انگیز کام تھا۔اور شاید ان کے اِس کام کا بہت کم احباب کو علم ہو۔ دراصل طارق صاحب اپنے متعلق بہت کم گفتگو کرتے، دوسروں کو سنتے یا کوئی علمی وادبی موضوع چھیڑ دیتے۔ 2016اور 2017 کے درمیان میری طارق صاحب سے جتنی بھی ملاقاتیں ہوئیں، وہ اپنی دوخواہشات کا بڑی شدت سے اظہار کیا کرتے۔ ایک تو اپنے شعری مجموعہ (شہرِ ہجر) کے دوسرے ایڈیشن کی شاندار اشاعت کا اور دوسرا اپنے بیٹے عثمان کے پاس امریکہ جانے کا لیکن قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔

طارق صاحب بنیادی طور پر کم گو اور کم آمیز انسان تھے۔مجلسی زندگی اور اجتماعی ملاقاتوں سے گریز، ان کے مزاج کا بنیادی عنصر تھا۔ اصل میں وہ مرضی کے بندے تھے اور مرضی کے لوگوں سے ملتے لیکن جس سے ملتے، وہ ان کی موجودگی میں علمی، ادبی، حتیٰ کہ زاعفرانی محافل کے مزے بھی بھول جاتا۔ ان کا ہر ایک سے، ایک الگ تعلق تھا جو انھیں اور ان کے ہر تعلق دار کو قبول تھا اور عزیز بھی۔ مجھے یاد ہے جب میں اپنے آبائی گھر فتو پورہ میں مقیم تھا تب وہ کبھی کبھار مجھے ملنے گھر تشریف لایا کرتے۔گھنٹوں گفتگو ہوتی اور مجھے بہت کچھ سیکھنے کو ملتا۔عموماً جب وہ آتے ، ان کے ہاتھ میں کوئی نہ کوئی کتاب ضرور ہوتی اور کہتے کہ آپ کو پڑھنے کا شوق ہے اس لیے یہ کتاب آپ کے لیے لایا ہوں۔ ایک دن جب آئے تو ان کے ہاتھ میں ایک اچھی خاصی ضخیم کتاب تھی۔ میں نے پوچھا، سر آپ نے آج بڑی وزنی کتاب اٹھائی ہوئی ہے۔مسکراتے ہوئے کہنے لگے نہیں ہلکی ہے۔ یہ ٹالسٹائی کے ناول war and peace کا انگریزی ترجمہ ہے۔آپ کے لیے لایا ہوں۔ میں نے بخوشی قبول کرتے ہوئے ،ان کی موجودگی میں دو چار صفحوں کی ورق گردانی کی اور شکریے کے ساتھ اُسے شیلف میں رکھ دیا۔انھی دنوں، میں جی۔سی۔ یو لاہور سے ایم۔فل کر رہا تھا۔میری ایک کلاس فیلو تراجم کے حوالے سے اپنا ایم۔فل کا مقالہ لکھ رہی تھی۔ پتا نہیں اسے کیا خیال آیا، مجھے کہنے لگی، آپ نے ٹالسٹائی کا ناول war and peace پڑھا ہوگا؟ آپ اگر اس کا خلاصہ فراہم کردیں تو نوازش ہوگی۔ انکار ممکن نہیں تھا کہ خواتین کی خدمت گزاری کو ہم فرضِ عین سمجھتے ہیں۔ اِس لیے، اُسی شام میں نے بس پکڑی اور گجرات پہنچ گیا۔اگلے دن صبح سویرے طارق صاحب کو ملنے ان کے گھر پہنچا اور ان سے دست بستہ عرض کی کہ صورتِ احوال یہ ہے۔۔۔۔ اس لیے، ناول کا خلاصہ درکار ہے۔ للٰہ کچھ کیجیے۔ اُنھوں نے اپنی بھاری بھر کم آواز میں ایک زوردار قہقہہ لگایا اور مسکراتے ہوئے کہنے لگے کہ شاہ جی! میں نے بمشکل اِس ناول کے سوسوا سو صفحے پڑھے ہونگے۔ اس ناول میں کردار اتنے زیادہ ہیں کہ مجھے پڑھتے ہوئے الجھن ہونے لگی۔ اس لیے، میں نے اِسے مزید پڑھنا چھوڑ دیا اور الماری میں رکھ دیا۔ کافی عرصہ بعد، اب خیال آیا کہ آپ کو دے دیا جائے کہ شاید آپ اتنے کرداروں سے نباہ کرسکیں۔

طارق صاحب اپنی پسند اور ناپسند کے معاملے میں ہٹ کے پکے تھے۔غالب ان کا پسندیدہ شاعر تھا اور وہ غالب پر کسی اور شاعر کو فوقیت دینا ادبی گناہ سمجھتے تھے۔ غالب انھیں اس قدر پسند تھا کہ ہم کہیں سے بھی، غالب کا کوئی مصرع پڑھتے، وہ اسے مکمل کر دیتے۔ میرے اس دعوی کے باوجود، یقین کیجیے کہ وہ دیوانِ غالب کے کم از کم حافظ نہیں تھے۔ وہ تو اشعارِ غالب کی چلتی پھرتی شرح تھے۔ غالب کے روایتی شارحین سے کوسوں دور۔ غالب کے حوالے سے، جب بھی میری ان سے گفتگو ہوئی، میں نے غالب کے شعری تمثالوں کو گرد و پیش کی صورتِ حال کے مطابق، بالکل ایک نئے معنوی منظر نامے میں سمجھا۔ دراصل وہ اشعارِ غالب کی زمانے کے ساتھ بدلتی ہوئی نئی تشریحات کے قائل تھے۔ طارق صاحب نے غالب پسندی کے باوجود (جہاں تک مجھے علم ہے) اس کے فکر وفن پر کوئی مضمون نہیں لکھا لیکن ہم تمام احباب ان

کے پاس بیٹھ کر، ہر بار غالب فہمی کے ایک تازہ شعور سے آگاہ ہوتے۔ غالب کے اشعار کی طرح طارق صاحب کی شخصیت بھی پہلودار تھی۔ اس حوالے سے اگر طارق صاحب کو غالب کی غزل کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر کلیم صاحب، ایک شارح کی حیثیت سے ہمارے درمیان موجود نہ ہوتے تو ہمیں طارق صاحب کبھی سمجھ نہ آتے۔ زمیندار کالج میں عملی طور پر طارق صاحب کی علمی و ادبی روشنی کے فروغ اور احباب کو اِس خزانے کی طرف مائل کرنے میں جو کردار کلیم صاحب نے ادا کیا، وہ شاید مولانا الطاف حسین حالی بھی غالب کے لیے نہ کر سکے۔ ہاں مولانا حالی کو یہ برتری ضرور حاصل ہے کہ اُنھوں نے جتنا غالب کو سمجھا اتنا لکھ دیا۔ لیکن غالب کے طرف دار کو جتنا ہم نے سمجھا اتنا لکھ نہیں سکے کہ تمھارے ہجر نے ”بکھرا دیا ہے“۔

☆☆☆☆

ہجر کا خار بھی رہنے دیا دل میں پیوست
لمحۂ قرب سے اس طور گزرنا چاہا

ٹھہرنا بھی وصالِ یار طارق
نواحِ ہجر میں پھرنا بھی ہو گا

تمھارے قرب نے بکھرا دیا تھا
تمھارے ہجر نے یکجا کیا ہے

(طارق محمود طارق)

شہر ہجر کے حوالے سے کچھ باتیں

طارق محمود طارق

(سابق صدر شعبہء اردو وانچارج مجلہ شاہین، گورنمنٹ زمیندار کالج گجرات)

ہجر ایک ایسا تجربہ ہے جو پوری انسانی زندگی اور انسانی احوال پر محیط و بسیط ہے اور اس کے بے شمار معنوی... اور اطراف ہیں ۔اس سے مراد خواب اور حقیقت کا فاصلہ ہے ۔شخصی اور نفسیاتی سطح پر خود شخصیت کا وہ افتراق... جو شخصی وحدت کے درہم ہونے سے رونما ہوتا ہے اور ایک ہی وقت میں شخصی نظام کی متعارض اور متضاد سطحوں کو (خواہ وہ واضح ہوں یا دور دراز ہوں) سامنے لاتا ہے ۔اس ہجر کی نوعیت بیک وقت شخصی اور معاشرتی اور اخلاقی اور نفسیاتی ہے ۔یعنی اپنے اس تشخص سے اور اُن اقدار سے بچھڑنا جو خوب صورت ہیں اور ایک خوبصورت زندگی اور صورتِ احوال کی داخلی اور معروضی سطح پر تشکیل و تحصیل کے لیے ناگزیر ہیں ۔انسانی زندگی میں ہجر کا مظہر اس طور پر بھی موجود ہے کہ انسانی تقدیر اور انسانی احوال کی تشکیل میں unknown عوامل بھی، انسانی عمل کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں اور اس تاریخی اور کائناتی جبر میں ہجر شکست اور پسپائی کا عنصر بھی، انسان کی دسترس سے باہر، انسان اور اس کی ممکن و متوقع تحصیلات کے درمیان ایک ایک نادیدہ و برتر قوت اور ایک دائمی ہیر اس کی طرح موجود ہوتا ہے ۔مجموعی انسانی احوال ہمیشہ... اور... رہا ہے اور ایک ہی صورت حال میں اس کے متضاد و متناقص عناصر بھی موجود ہوتے ہیں ۔استکمال ایک ایسی چیز ہے جو انسانی دسترس سے باہر ہے ۔ایک ہی صورت حال بیک وقت ہجر بھی ہوتی ہے اور وصال بھی اور نہ یہ تمام تر ہجر ہوتی ہے اور نہ تمام تر وصال ۔فنی تجربے میں ہجر یا وصال کے تجربے کی بہت سطحیں اور اطراف گرفت میں نہیں آتیں اور بہت سی معنوی... لفظوں کی گرفت سے باہر رہ جاتی ہیں چنانچہ فنی تجربے اور دید وا دید کا علاقہ ہجر و وصال کے بیچ کا برزخ ہے ۔زندگی کی، اس کی بلند تر معنویت کی سطح پر آ گہی وصال ہے ۔اور اس آ گہی کا انتفا ہجر ۔اگر معروضی معاشرتی سطح پر اس معنویت کی realization ہوتی ہے تو یہ وصال ہے اور اگر معروضی احوال اس بلند تر معنویت سے خالی ہے تو یہ ہجر ہے ۔شاعر کو جو کچھ میسر ہے اسے غالب کے الفاظ میں ''وصلِ نظر'' کہہ سکتے ہیں اور بقول میر دردؔ

دید وا ہوئی دُور سے میری اُن کی
ایک بھی ان سے ملاقات نہ ہونے پائی

یا

اور تو یاں کچھ نہ تھا ایک مگر دیکھنا

چنانچہ یہ صرف دید ہے ۔اقدار کے تناظر میں زندگی کے باطنی اور معنوی احوال کی آ گہی کی ایک سطح ہے ۔وصل صرف دیکھنا ہے ، مقابل آنا ہے، باقی جو کچھ ہے وہ ہجر ہے ۔کیونکہ وہ حسن جو مقابل ہے صرف ایک خواہشمند خواب ہے، ایک بر پا حقیقت نہیں ۔حسن کیا ہے ارفع انسانی اقدار (جمالیاتی + اخلاقی) اپنی کسی نہ کسی معروضی اور موضوعی شکل میں، اور ان اقدار سے وابستگی اور ان کا قرب و وصال ۔

ہجر کا اظہار صرف عمل کی سطح پر ہی کائناتی جبر، غیر معلوم شخصی عوامل کے جبر اور انسانی زندگی کے unknown factor کے جبر کی صورت ہی میں نہیں ہوتا ۔بلکہ فنی عمل میں بھی قبل لفظ احساسات سے لے کر لفظ تک کے پراسس میں کوئی نہ کوئی شے ایسی ضرور رہ جاتی ہے

، جیسے آدمی طے نہیں کر پاتا اور گرفت میں نہیں لے سکتا۔ یوں ادراک اور تشکیلِ معانی کی سطح پر بھی وصال میں ہجر کا عنصر شامل رہ جاتا ہے ۔ادراکِ حقیقت بنیادی طور پر شخصی، انفرادی اور اضافی ہوتا ہے اور جب تک ہمیں زندگی کے بارے میں ایک مکمل کائناتی اور غیر اضافی view حاصل نہیں ہو جاتا، عین الیقین کی منزل نہیں آجاتی، اس وقت تک یہ ہجر کا علاقہ درمیان میں ہے اور اس سے مفر نہیں۔ فلسفہ، شاعری اور مذہب کائنات میں فرد کے وجود کے حوالے سے اور زندگی کے تفہیم کے ضمن میں ایک اپنا اپنا توضیحی نظام اور اپروچ رکھتے ہیں اور وصالِ معنی کی ایک بلند تر سطح رکھتے ہیں کیونکہ یہ ارفع انسانی contentاور زندگی کی بطور مجموعی understandingپر مشتمل ہے۔

شعر گوئی کے عمل میں ہجر و وصل کی ثنویت ایک اور طرح بھی شامل ہوتی ہے شاعر کی اپنی شخصی اور نفسیاتی ساخت میں ہجر کا ایک واضح عنصر شامل ہوتا ہے۔ وہ اپنے شخصی نظام میں کوئی نہ کوئی چیز، کہیں نہ کہیں lack کرتا ہے اور اس کمی (ہجر) کو اپنی تصوراتی اور شاعرانہ ذات کو develop کر کے پورا کرتا ہے۔ اور شخصی نظام میں توازن پیدا کرتا ہے ۔یوں شاعری بیش تلافی - over compensation کی ایک شکل ہے۔ ایک ہجر کے مقابل ایک وصل کی فضا برپا کرنے کا عمل۔ ذات میں اور زندگی میں ایک جگہ ناکافی ہونے کی صورت حال اور اس جگہ کے مقابل ایک اور جگہ اپنے کافی ہونے کا اظہار۔

شخص اور ہجوم کی سطح پر، اس عہد کے آدمی کا ہجر وہ ہے جس کی طرف غالبؔ کا یہ خوب صورت شعر بہت خوبی سے اشارہ کرتا ہے

وفا مقابل و دعوائے عشق بے بنیاد
جنونِ ساختہ و فصلِ گُل قیامت ہے

خوبصورت اقدار اور حسن کی طرف ہمارے رویے palseاور مصنوعی ہیں۔ ہمارا دعوائے عشق بے بنیاد ہے۔ اپنی حقیقی ذات کے سامنے اور اپنی حقیقی ذات، باطنی حسن اور داخلی سچائیوں سے دور رہتا ہوا آدمی self-alianated آدمی۔ اپنے انسانی اور معنوی تشخص سے مہجور فرد۔

بعض اوقات ہجر ایک خود عاید کردہ صورت حال بھی ہوتی ہے۔ ایک masochistic میلان۔ اوک میں دریا بھر کر اپنی پیاس کو برپا رکھنے کا عمل۔ ہجر طلبی کی ایک خُو۔

محبت اور دید کے تجربے میں ایک سطح وہ بھی ہے، جب آدمی اس تجربے سے گذرتے ہوئے اس کی ثنویت اور استبعاد سے بھی آگاہ ہوتا ہے۔ فاصلے اور قرب کا استبعاد۔ بعض اوقات وہ سامنے کی چیزوں کو بھی ایک amkinguity اور فاصلے کے حوالے سے دیکھتا ہے۔ کبھی اس تجربے کے اس پہلو سے دو چار ہوتا ہے۔ جو تمام تر قرب ہے اور کبھی یہی قرب ایک ہجومِ تصور میں کھو کر یا ہجر طلبی کے ایک masochistic میلان کے زیر اثر ہجر لگنے لگتا ہے۔ پھر یوں بھی ہے کہ حسن کبھی ہماری گرفت میں نہیں آتا، بس یہ ہے کہ ہمیں دور و قریب کی ایک طلسمات میں سرگرداں رہنا پڑتا ہے۔

بعض اوقات آدمی مقابل ہوتا ہے مگر مقابل آنے کے باوجود دید و وادید میں تصوراتی تامل کا پہلو زیادہ نمایاں ہوتا ہے یوں آدمی ایک سطح پر جمالیاتی معروض سے کٹ جاتا ہے۔ اور ہجر میں مبتلا ہوتا ہے اور ایک سطح پر وصالِ معنی سے ہمکنار ہوتا ہے۔

ہر بد صورتی، زندگی کی خوب صورت اقدار سے ہجر، اور خود اپنی انسانی معنویت سے ہجر کی صورت حال ہے۔ جنگ، بھوک، غربت

اور جبر واستحصال کا حال خود ہماری اپنی دہشت زدہ بدصورتی کا احوال ہے ایک سچا شاعر بنیادی طور پر lover ہوتا ہے۔مثبت اور خوب صورت اقدار کا lover انسانی احوال میں ان اقدار کی پیش قدمی اور فتح اس کی ذاتی فتح ہے اور ان اقدار کی پسپائی اور شکست اس کا ذاتی رنج ہے۔شعر کہنا زندگی کے منفی اور anti-poetic عوامل کے خلاف صف آرا ہوتا ہے اور اس لحاظ سے یہ بہت بامعنی اور ذمہ دارانہ انسانی عمل ہے آج زندگی کے غیر انسانی عوامل کی جارحانہ پیش قدمی کے سامنے، اپنی خالص انسانی شناخت کو بچائے رکھنے کے جو وسائل ہمیں میسر ہیں اور جن کے توسط سے ہم اس ''ہجوم دشمناں'' کے سامنے ٹھہرے ہوئے ہیں اور صف آراء ہیں، ان میں شاعری کی contribution بہت بڑی ہے۔ایک سچے شاعر کا منصب ایک جنگجو کا منصب بھی ہے جو زندگی کی بدصورتیوں سے لڑتا ہے۔

تہذیب کے ارتقا اور علوم کی روز افزوں پیش رفت کے توسط سے اب انسانی تفہیم کی مجموعی صورت حال بھی زیادہ وقیع ہے۔اس تفہیم کی ایک جہت کا تعلق نفسی علوم اور جمالیاتی اور اخلاقی حقائق سے ہے کیا یہ بھی ایک بڑا ہجر اور پسپائی نہیں کہ ہمارے مجموعی عمرانی احوال کی اساس انسان کی حقیقی ذات اور اس کی حقیقی ذات پر مبنی اخلاقی اقدار نہیں بلکہ ہجوم کے جبر سے پیدا شدہ اقدار ہیں فرد self-oriented نہیں بلکہ اپنے رویوں اور کردار میں other-oriented ہے۔بالآخر اپنے ماحول سے تطابق کی خاطر، ماحول کی اقدار اور ترجیحات کو بنیادی اہمیت دیتے ہوئے، یہ ذات پر اوڑھی ہوئی مصنوعی ذات، حقیقی ذات اور حقیقی تشخص کی جگہ لے لیتی ہے۔فرد، شخصیت کے استحصال کی اس سطح کو قبول کر لیتا ہے جو ہجوم کا جبر اس پر عائد کرتا ہے۔فرد اپنی صحیح شناخت کو ہجوم میں کھو دیتا ہے اور ہجوم کی اقدار کو خواہ وہ سطحی اور غلط ہوں اپنا لیتا ہے۔سچی شاعری کا بنیادی حوالہ وہ فرد ہے جس کی اقدار ہجوم کی اقدار سے مختلف ہیں۔یہ ایسے تمام افراد کی روداد ہے جو داخلی زندگی اور اس کے مقتضیات سے true رہتے ہیں۔اپنی بلند ترسطح پر سچی شاعری انسانی زندگی کے ارفع جمالیاتی اور اخلاقی content پر مبنی ہوتی ہے۔اور غلط رویوں اور منفی احوال کے مقابلے میں مثبت احوال کا ایک نظام پیش کرتی ہے۔

تصوّف اور مذاہب کے تمام نظام ہجر کی ایک موجود صورت حال اور وصال کی ایک آیندہ صورت حال کی نشاندہی کرتے ہیں۔زندگی کی بنیادی معنویت کا وصال جو تصوّف اور مذاہب کی رُو سے ارفع رُوحانی زندگی کا انتہائی مرحلہ ہے اور جس تک پہنچنے سے پہلے خود اپنی ذات میں ہجر کا ایک دشت عبور کرنا ہوتا ہے۔ایک مثالی انسانی احوال کی خواہش مذاہب اور شاعری میں مشترک قدر کی حیثیت رکھتی ہے۔

اگر ہجر کے لفظ اور ہجر کے تجربے کے معنوی مشتملات پیش نظر رہیں۔تو یہ بتانا غیر ضروری نہ ہوگا کہ میرا بنیادی تجربہ ہجر کا تجربہ ہے شخصی سطح پر محبت کے حوالے سے ہجر کا تجربہ اور ہجوم سے متعلق فرد کی حیثیت سے انسانی صورت حال میں خوب صورت اقدار کی شکست یا پسپائی کا عمرانی مظہر اور اس احوال کا اندوہ۔شہر ہجر کی شاعری کے اس اندوہ کو محسوس کرنا ادب میں سنجیدگی سے دلچسپی رکھنے والے قارئین کے لیے آسان ہوگا جن سے یہ توقع بے جا نہ ہوگی کہ وہ ان اوراق سے سرسری نہیں گذریں گے۔

کتاب کی ترتیب واشاعت کے سلسلے میں مفید رہنمائی پر والد محترم محمد یعقوب صاحب کا تہ دل سے شکر گذار ہوں۔
مبارک احمد اور ڈاکٹر غلام حسین اظہرؔ، اس کتاب کے سلسلے میں دلچسپی اور معاونت کے لیے ان کا بہت ممنون ہوں۔
اس مجموعے میں شامل غزلوں کے انتخاب میں زاہد یعقوب، ساجد یعقوب اور خورشید یوسف نے بے حد قابل قدر اعانت کی۔

شہر ہجر ایک تجزیہ

سید وقار افضل
(اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ اردو)
گورنمنٹ زمیندار کالج گجرات

طارق محمود طارق اپنا کلام بہت کم سناتا ہے۔ وہ مشاعروں کا شاعر نہیں۔ شعر کہنا اس کی تخلیقی شخصیت کی مجبوری ہے اور یہی مجبوری اس سے اب تک شاعری کروا رہی ہے۔

ہزار کام تھے اس عشق میں مگر طارق
کچھ اور کر نہ سکا صرف شعر کہتا رہا

طارق کے شعری مجموعہ ''شہر ہجر'' کو پڑھتے ہوئے ایسا لگتا ہے جیسے زندگی کی غیر معتدل روایات کے زیر اثر اس کے تخلیقی کردار کی تشکیل ہوئی ور پھر اس دوران میں اس کی شخصیت کے اندر جس داخلی عنصر کی سب سے زیادہ نشوونما ہوئی، وہ اس کا سپر ایگو(Super Ego) ہے۔ شاید اسی لیے ہمہ وقت اخلاقی ضابطوں کی پاسداری نے اس کی تخلیقی شخصیت کے اندر ڈر اور خوف جیسی کیفیات کو فروغ دیا جو بعد میں لمحہ تخلیق کے دوران میں اس کی شاعری کے بنیادی موضوع کی شکل میں سامنے آئیں۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ طارق کی شاعری اس کی ذاتی، اجتماعی اور معاشرتی نفسیات کی عکاسی کرتی ہے۔ جس میں ہر شخص تشویش اور ڈر جیسی کیفیات کے غیر متوازن اثرات کی وجہ سے اپنی داخلی شخصیت کو ٹوٹتا اور بکھرتا ہوا محسوس کرتا ہے اور پھر مجبوراً صورتحال کی غیر تغیر پذیر سنگینی اسے اذیت میں لطف اور دہشت میں کشش تلاش کرنے میں مجبور کرتی ہے۔

بکھرنے میں ہے بہت لطف بھی اذیت بھی
ہوا کے شور میں ہے اک کشش بھی دہشت بھی

شکستگی، خستگی اور بکھرنا جیسے الفاظ طارق کی شاعری میں بار بار استعمال ہوتے ہیں۔ جن سے ہمیں اس کی باطنی دنیا میں بسنے والی ان بنیادی جبلتوں کی تباہ حالی کا پتہ چلتا ہے۔ جن کی نشوونما سپر ایگو(Super Ego) کی چہار جانب بلند دیوار سیہ کی وجہ سے نہ ہوسکی۔ اس محرومی کی صدائے بازگشت اس کی تمام شاعری میں ایک منہزم شخصیت کی خبر دیتی ہے۔ طارق کی شاعری الفاظ کی تخلیق و ترتیب اور انتخاب کے مراحل سے لے کر زندگی کی معنویت کے ادراک تک، اس کی شخصیت کا ایک ایسا وسیع استعارہ بن جاتی ہے جس میں فکر و احساس کی تمام انفرادی اکائیاں، ہماری زندگی کے بہت سے اجتماعی رویوں کا اشاریہ دکھائی دیتی ہیں۔

چار جانب ہے وہی حلقۂ دیوار سیہ
بھاگ کر جائے کہاں نرغے میں آیا ہوا دل
ہر وقت جیسے کوئی بکھرنے کا وقت ہے
جائے کہاں یہ عرصۂ محشر کا آدمی

طارق کی شاعری میں تشویش اور ڈر کی کیفیت محض نفسیاتی نہیں بلکہ اس میں ان تمام سماجی، معاشی، معاشرتی اور تہذیبی تغیرات کے عکس بھی نظر آتے ہیں جو آج کے انسان کو ذاتی مفادات کے حصول کے لیے دوستی کے بھیس میں دشمنی کی ترغیب دے رہے ہیں۔ یہی وہ مقام ہے جہاں سے طارق کی شاعری نفسیات کے دائرے سے نکل کر سماجیات کو اپنا موضوع بنا لیتی ہے۔۔۔موجودہ بگڑے ہوئے سماجی تناظر میں کوئی رشتہ اپنی اصل شکل میں موجود نہیں۔۔۔انسان ہر لمحہ خطرات کے درمیان سہما کھڑا ہے۔۔۔نہ جانے کب اور کون اپنے مفادات کے حصول کے لیے دوستی کے دائرے سے نکل کر دشمنوں کی صف میں کھڑا ہو جائے۔۔۔اور جب شہرِ دوستاں میں دشمن کی تلاش کی جائے تو سارا شہر دشمن نکلے۔۔۔یہی وہ اندوختہ ہے جو طارق کی شاعری کو نہ صرف بدلتے ہوئے انسانی رویوں کا شعور عطا کرتا ہے بلکہ اسے خوابوں کی غیر حقیقی پناہ گاہ تلاش کرنے پر بھی مجبور کرتا ہے۔

اس قتل دل میں کیا کہوں کس کس کا ہاتھ ہے
بے رحم سارا شہر ہے، قاتل تمام شہر
میرے دشمن کے ہیں ہم شکل ہزاروں طارق
کس پہ میں وار کروں وار اگر کرنا ہے

تخلیقی ادب تخلیق کار کے خوابوں کا ایک ایسا منظر نامہ ہوتا ہے جس کے پس منظر سے اس خیالی دنیا کا سراغ ملتا ہے جسے ایک تخلیق کار تمام عمر حقیقت میں تبدیل کرنے کی کوشش میں لگا رہتا ہے۔ ایک تخلیق کار کے خواب عام انسان کے خوابوں سے زیادہ پیچیدہ اور گہرے ہوتے ہیں۔ ان کے اندر نہ صرف اس کی اپنی انفرادی تمناؤں کی جھلک ہوتی ہے بلکہ پوری کائنات کے احساس کی صدا بھی ان میں گونجتی ہے۔ جس معاشرے میں ہر چیز شکست وریخت کے بھنور کی زد میں آ کر شکستگی سے دوچار ہو وہاں کے باسی اپنی بقاء کے لیے ''شہرِ خواب'' میں پناہ لیتے ہیں۔ طارق کی شاعری میں خواب کی امیجری اس کی پوری شعری فضا سے منسلک ہے جو شکستگی اور انتشار وہ زندگی میں دیکھتا ہے اسی شکستگی اور انتشار کا ڈر اسے اپنے خوابوں میں بھی لاحق ہے۔ اس تشویشناک صورت حال کی وجہ سے وہ اپنے سنہرے خواب کو سب کی نظروں سے چھپاتے ہوئے اس کی بقاء کے لیے اپنی ذات کے حصار میں پناہ تلاش کرتا ہوا نظر آتا ہے۔

ان چمکتے ہوئے خوابوں کو کہاں لے جاؤں
عمر کٹنے کو تو کٹ جائے شب تار کے ساتھ

چمکتے ہوئے خوابوں کے دھندلانے کا اندیشہ۔۔۔دوستوں کے درمیان دشمنوں کا ڈر۔۔۔سماجی زندگی کا انتشار۔۔۔یہ اور ایسے کئی اور خدشات طارق کو اپنی ذات کے حصار کے اندر پناہ لینے پر مجبور کرتے ہیں۔ لیکن وہاں پر تنہائی کا دیو اسے اپنی گرفت میں لے لیتا ہے طارق کی شاعری میں تنہائی ایک مستقل کیفیت کی صورت میں نظر آتی ہے۔ اس تنہائی کا تعلق نہ صرف اس کی شخصیت کے ان بنیادی رجحانات سے ہے جن کی نشوونما سپرا ایغو (Supra Ego) کی ابنارمل گروہ کی وجہ سے رک گئی ہے بلکہ خارجی زندگی کی تباہی سے جنم لینے والا آشوب بھی اسے اس احساس سے متعارف کرواتا ہے۔

تنہائی سارا شہر ہے، محفل تمام شہر
کچھ اس طرح ہے میرے مقابل تمام شہر

تنہائی کے آشوب کے علاوہ تیزی سے گزرتے ہوئے وقت کے احساس سے جنم لینے والی اداسی اور پریشانی بھی طارق کے اکثر اشعار میں نظر آتی ہے۔

وقتِ سفر بھی تھوڑا ہے اور سفر بھی لمبا ہے
پھیلتے جاتے ہیں آفاق، سورج ڈھلتا جاتا ہے

ایک تخلیق کار اپنی ذات سے صرف نظر کرتے ہوئے محض عمرانی بے ضابطگیوں اور قباحتوں کو موضوع بنا کر زندگی کی اعلیٰ جمالیاتی اقدار کو تخلیقی فن کے ذریعے فروغ نہیں دے سکتا۔ کیونکہ جو خرابی کائنات کے دائمی اصولوں سے انحراف کی صورت میں پورے معاشرے پر اثر انداز ہوتی ہے اس کے واضح اور گہرے نقوش سب سے پہلے تخلیق کار کی حساس طبع پر مرتسم ہوتے ہیں انھی اثرات کے ردِعمل کے نتیجے میں ایک تخلیق کار تخلیقی مراحل سے گزرتا ہے اسی دوران میں کبھی کبھی وہ معاشرتی خرابیوں کی نشاندہی کے ساتھ اپنی ذات کے ساتھ وابستہ انفرادی خامیوں کو بھی منصۂ شہود پر لاتا ہے اس طرح وہ پوری انسانیت کو کائنات کے ان دائمی جمالیاتی اصولوں سے متعارف کرواتا ہے جن کی مدد سے بگڑے ہوئے انسانی تناظر کو سنوارا جا سکتا ہے۔ طارق کے کلام میں ایسے اشعار بھی موجود ہیں جن میں اس نے اپنے آپ کو ہدف تنقید بنایا ہے۔ ایسے اشعار تخلیق کرنے سے طارق کی شاعری ایک ایسا آئینہ بن جاتی ہے جس کے ذریعے بیک وقت شاعر اور زمانے کو دیکھا اور دکھایا جا سکتا ہے۔

کسی کی کیا کہ خود اپنی سمجھ نہیں آتی
میں خود عجیب ہوں طارق عجیب کس کو کہوں

طارق ہوائے کوئے ستم گر کا آدمی
دل میں فروئے خار گل تر کا آدمی

عموماً دیکھا گیا ہے کہ ہر شعر کی شاعری کسی ایک بڑے تخلیقی تجربے کے زیر اثر اپنی انفرادیت برقرار رکھتی ہے اور اپنے اظہار کی آخری حد تک پہنچنے سے پہلے اپنی تخلیقی توانائی سے کئی ایسے آفاقی اشعار کی تخلیق کا باعث بنتی ہے جو اپنے موضوعات کے اعتبار سے یقیناً ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں لیکن ان کے اندر کسی ایک مخصوص تجربے کی صدا، شاعر کی شخصیت کے اس مرکزی آشوب کی طرف اشارہ کرتی ہے جہاں سے اس کے تمام لفظ اپنے لیے حدت حاصل کرتے ہیں۔ طارق کی شاعری ''شہرِ ہجر'' کے آشوب کی داستان ہے جس کی ابتدا اور انتہاء کسی متوازن کائناتی رویے کی تلاش میں ہجر کے انتشار میں خود کو یکجا کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ طارق کے زیر بحث شعری مجموعہ ''شہرِ ہجر'' میں ہجر کا لفظ وسیع علامتی مفاہیم کا حامل ہے یہ لفظ نہ صرف شاعر کی ذات کے ساتھ منسلک کسی رومانوی تجربے کا غماز ہے بلکہ اس لفظ کے اندر سماجی اور تہذیبی انتشار کے بھی کئی ایسے حوالے موجود ہیں جو شاعر کی شخصیت اور اس کی تخلیقی اکائیوں کو یکجا کرتے ہیں۔

ہجر کا خار بھی رہنے دیا دل میں پیوست
لمحہ قرب سے اس طور گزرنا چاہا

تمہارے قرب نے بکھرا دیا تھا
تمہارے ہجر نے یکجا کیا ہے

ہر شاعر کے اندر رومانوی احساسات کی جلترنگ ضرور ہوتی ہے اس لیے شاعرانہ مزاج کی رومانیت کائنات کے حسن کی جلوہ آفرینیوں کو محبوب کے رنگ اور اس کے خدوخال میں تلاش کرتی ہے۔ حسن کے روایتی بیان سے قطع نظر حسن کی جمال آفرینی نے تقریباً تمام شعرا کی شاعری میں اپنا مخصوص رنگ دکھایا۔ طارق کا تصورِ حسن اس کے محبوب کے پیکرِ صباحت کے ساتھ وابستہ ہے۔ وہ اپنی شاعری میں ''ظلمتِ شب'' کو روشن کرنے کے لیے محبوب کے رخِ صباحت اور اس سے جنم لینے والے احساسِ صباحت کے لمحے کو اپنی گرفت میں لینے کی کوشش کرتا دکھائی دیتا ہے اس کی شاعری میں لطفِ صباحت رخ کی صباحت، پیکر کی صباحت، احساسِ صباحت اور صباحتِ روئے حبیب جیسی تراکیب سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کے تصورِ حسن میں بنیادی حیثیت محبوب کے رنگِ صباحت کو ہے۔

تم مرے ہو تو مری ظلمت شب میں اک پل
اپنے پیکر کی صباحت کو بکھر جانے دو
چاند کوئی تو مری ظلمت شب پر چمکے
تیرے احساس صباحت کا کوئی تو لمحہ

کسی بھی شاعر کی شاعری کے مجموعی مزاج کا اندازہ عموماً ان مختلف امیجز اور علامتوں سے لگایا جاتا ہے جو اس کے شعری تخیل سے نکل کر پردہ شعر پر بار بار نمودار ہوتی ہیں۔ جو علامتیں اور امیجز روایتی ہونے کے باوجود کسی شاعر کی شاعری میں بار بار آتے ہیں ان سے یقیناً اس بات کا اندازہ ضرور لگایا جا سکتا ہے کہ ان روایتی علامتوں اور امیجز کا واسطہ محض روایت سے نہیں بلکہ ان کا تعلق ارتقاء کے اس تسلسل کے ساتھ بھی ہے جو لفظی مطالب کی تبدیل ہوتی ہوئی صورت کے ساتھ انسان کے جدید طرزِ احساس اور نفسیات کو بھی ظاہر کرتے ہیں۔ طارق کی شاعری میں بعض مخصوص روایتی تراکیب، علامتیں اور امیجز بار بار Repeat ہوتے ہیں جیسے شورِ ہوا، بادِ تند، ہوائے تیز، تہِ ریگ، سلگتا ہوا دشت اور پیاس یہ تمام علامتیں اور امیجز نہ صرف اس کی شعری فضا کی خارجی اور داخلی صورت گری کرتے ہیں بلکہ اس کی فکری اور جذباتی دنیا کی روداد بھی سناتے ہیں۔ اس داخلی سرگزشت میں طارق کی ان تمام شکستہ آرزوؤں کا نوحہ ملتا ہے جن کو اپنی تکمیل کی جد و جہد کے دوران میں مخالف سمت سے آنے والی پرشور تند و تیز ہواؤں کے سامنے پسپا ہونا پڑا۔ طارق کی شاعری میں دشت اور صحرا کی امیجری اس کی اپنی ذات کی ویرانی، زندگی کے سفر کی وسعتوں اور بے سروسامانی کی علامت کے طور پر سامنے آتی ہے۔ ''ہوائے تیز'' اور ''شورِ ہوا'' کی استعاراتی گہرائی کے اندر ہمیں ہمارے نظام کی وہ خرابی جھلکتی ہوئی نظر آتی ہے جو لاکھ کاوشوں کے باوجود ہمیں تھکا تو دیتی ہے لیکن کبھی بھی کسی روشن منزل کا اشارہ نہیں دیتی۔ یہیں سے انسانی اضطراب کا ماجرا شروع ہوتا ہے۔ طارق کی شاعری میں ''سلگتا ہوا دشت'' اور پیاس کی امیجری Freudian نفسیات کے مطابق اِڈ (id) کے مطالبات کی عکاسی کرتی ہے جو سپرا ایغو (Supera Ego) کی ابنارمل گروتھ کی وجہ سے دبے رہے۔

محال ہے کہ یہ صدیوں کی پیاس بجھ جائے
اتر گئے ہیں تہ ریگ کتنے ہی دریا
اے مری جاں! میں قرنوں سے سلگتا ہوا دشت
اور یہ لطف ترا لمحہ دو لمحہ باراں
اگرچہ اوک میں دریا بھرا ہے

پر اپنی پیاس کو برپا رکھا ہے
ہوائے طرف چمن ہی ملی نہ سایہ ابر
وہ دشت تھا کہ کراں تا کراں سلگتا رہا

طارق کے شعری مجموعہ''شہر ہجر''میں تقریباً ایک چوتھائی کے لگ بھگ ایسی غزلیں ہیں جن میں اس نے اپنا نام بطور تخلص دو مرتبہ اور ایک غزل میں تین مرتبہ استعمال کیا ہے بعض اوقات وہ غزل کے آخری شعر کی بجائے مطلع اور یا پھر غزل کے دیگر اشعار میں اپنا نام بطور تخلص استعمال کرتا ہے ایک غزل کے مختلف اشعار میں اپنا نام استعمال کرنے کی کئی ایک وجوہات ہوسکتی ہیں لیکن بظاہر یہ لگتا ہے کہ''شہر ہجر'' کا شاعر اپنی انفرادیت کو برقرار رکھنے کے لیے اپنی شاعری میں مضمر ہر خیال اور جذبے کو اپنے حوالے سے محسوس کرنا اور کروانا چاہتا ہے ایسا کرتے ہوئے اس کا تخلیقی دائرہ کار محدود نہیں ہوتا وہ اپنے نام کے ذریعے اپنے جیسے بے شمار کرداروں سے ہمیں متعارف کرواتا ہے۔

اے طارق ہم سا کوئی منہزم بھی
ہم ایسا کوئی صف آرا بھی ہو گا
ٹھہرنا بھی وصال یار طارق
نواح ہجر میں پھرنا بھی ہو گا

وہی شاعری فکر و نظر کے تمام تقاضے پورے کرتی ہے جو متضاد داخلی رویوں کے باہم تصادم اور انجذاب سے جنم لیتی ہے۔ طارق کی شاعری میں متضاد قوتوں کا باہمی تصادم تو نظر آتا ہے لیکن بعض اوقات اس کے جذبے اور فکر کے تصادم کے بعد انجذاب کا عمل ادھورا رہ جاتا ہے۔ اس وجہ سے اس کے بعض اشعار کا ایک مصرعہ خالص فکری فعلیت کے زیر اثر مشکل عربی الفاظ اور اضافتوں کی بھر مار کے سبب کھردرا اور دوسرا مصرعہ خالص جذباتی فعلیت کے تحت رواں اور مترنم ہوتا ہے

جرم مستلزم تعزیر ہے لیکن طارق
پہلا پتھر وہ اٹھائے جو گنہگار نہ ہو
پسپا و بے بساط و فتادہ درخت ہے
شور ہوا سے لڑ کے بکھرتا درخت ہے

لیکن جہاں تصادم کے بعد انجذاب کا عمل مکمل ہوتا ہے وہاں ایسے اشعار بھی نظر آتے ہیں۔

ہے پھول ہتھیلی پہ، سر خار سا دل میں
میں پھول بھی چاہوں ، میں سرخار بھی چاہوں
تھی ایک دید ملاقات ایک دید وداع
یہ عہد رسم و راہ مختصر قیامت تھا

الگ اسلوبیاتی شناخت کے باوجود اپنے اندر اپنے ہم عصر اور پیش رو شعراء کی اسلوبیاتی اکائیوں کو ضرور سمیٹتی ہے۔ طارق کے شعری اسلوب

اورلسانیات پر غالب، فیض، ناصر اور منیر نیازی کے اثرات کی جھلک نمایاں نظر آتی ہے۔ مثلاً

تمام عمر وہی کاو کاو بے صرفہ
تمام عمر وہی رنج رنج لاحاصلش

منفرد خیال اور شعری لسانیات ہی کسی شاعر کی الگ شناخت کا باعث بنتی ہے۔ طارق اپنے شعری اسلوب کی انفرادیت کو برقرار رکھنے کے لیے اپنی غزلوں میں عربی کے بھاری الفاظ وتراکیب کو استعمال کرتا ہے مثلاً ملتفت، متوقف، متشخص، متقابل، متوہم، متاسف، متالم ومتوحش، مجتمع، مخاطبت، مجر، مستلزم تعزیر، ملتہب، بکرمت لمحہ نا مستمر، مزمور حزاں، متامل، شعلہ مستعجل، بضاحت وغیرہ اردو غزل کی شعری لسانیات کی ترتیب وتشکیل اور مقبولیت میں جو زبانیں براہ راست اثر انداز ہوئیں وہ فارسی کے علاوہ برصغیر کی مقامی زبانیں تھیں۔ اس لیے اردو غزل کی لسانیاتی نزاکت پر عربی کے مشکل اور بوجھل الفاظ وتراکیب گراں گزرتے ہیں۔ ۔ لیکن یہی مذکورہ الفاظ وتراکیب ہیں جو طارق کے شاعرانہ اسلوب کو ایک الگ شناخت فراہم کرتے ہیں۔

طارق کی شاعری اسلوبیاتی مزاج کے اعتبار سے شروع سے آخر تک تقریباً ایک جیسی رہتی ہے اور ابتداء سے انتہاء تک وہ ان اسلوبیاتی اور موضوعاتی عناصر کو یکجا کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ جن کا براہ راست واسطہ شاعر کے داخلی انتشار سے پھوٹنے والی توانائی سے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ طارق کی شاعرانہ زبان کی داخلی اور خارجی ساخت ایک ہے وہ اگر مشکل الفاظ کا استعمال کرتا ہے تو ان کے اندر بھی مشکل اور پیچیدہ خیال موجود ہوتا ہے۔

کلامِ طارق

(انتخاب: سدرہ رانا)

مقابلِ صفِ اعدا میں اس طرح ٹھہروں
ہمیشہ مجھ کو میّسر پناہ تیری ہو

ہوں جب ہجوم کناں دشمناں میرا مرجع
ہو تیرا لطف و ترحّم نگاہ تیری ہو

جو آکے میری صفِ منہزم کو جمع کرے
وہ شہر و کُو ہو ترا، وہ سپاہ تیری ہو

وہ شخص مجھے جس سے شکایت ہے،میں خود ہوں
جو مطمئین رنج و اذیت ہے ،میں خود ہوں

ہر فتح پہ شرمندہ ہوں، ہر حُسن پہ نازاں
جو حُسن ہے خود میں، جو قباحت ہے، میں خود ہوں

خود اپنے بجز کچھ نہیں اندوختہ میرا
جوبھی مری صدیوں کی بضاعت ہے، میں خود ہوں

ہر آیۂ آفاق، ہر اک آیۂ انفس
وہ جس سے مخاطب یہ ہرآیت ہے ،میں خود ہوں

اس شہر سے کیسے کروں خود کو متشخّص؟
اس شہر کی ہرشے مری رَویت ہے،میں خود ہوں

اعصار مرے،سب مرا رفتہ و ما حاصل
جوکچھ بھی شکستہ وسلامت ہے، میں خود ہوں

شہروں میں مرے اُڑتی ہوئی کوچہ بہ کوچہ
اک خاک کہ جومیری اضاعت ہے،میں خود ہوں

لمحہ دمہ و روز میں بکھرا ہوا جو کچھ
جوکچھ بھی ترے غم میں سلامت ہے،میں خود ہوں

اوراقِ خزانی پہ اگر لکھا ہوں طارقؔ
جو شہرِ بہاراں کی بضاعت ہے،میں خود ہوں

دست و دامن ہی پہ طارقؔ نہیں برسا ہوا دِل
شہر بھر پہ ہے اُمڈتا ہوا،رویا ہوا دِل

کل تھا اک باغ اب اُڑتی ہوئی خاکستر ہے
حلقہء در ترے آ آکے یہ بجھتا ہوا دل

خوں چکاں دُور تلک ہر رگِ دل اے طارقؔ
دُور تک شب کے سیہ کانٹوں پہ کھینچتا ہوا دل

سامنے آکے ٹھہر جاتی تھی بجلی کی چمک
تیز آندھی میں نہ ہاتھ آتا تھا اُڑتا ہُوا دِل

عجب اُلجھن میں ہوا روزِ ملاقات ِ بسر
ہجر پر مرتا ہوا، وصل میں کھویا ہوا دل

رنگِ سُخن
(علامہ اقبالؒ)

رنگِ سخن

سالانہ مشاعرہ

2020
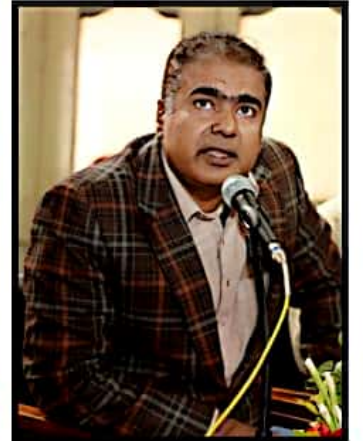
حمد و نعت

سید افضل حسین شاہ

حمد

دلِ ناداں غم و اندوہ سے ہشیار ہو جائے
حقیقت آشنا اور واقفِ اسرار ہو جائے

الٰہی مخزنِ لال و گہر کا میں نہیں طالب
عطا مجھ کو فقط گنجینۂ اشعار ہو جائے

عطا ایسا ہو نصب العین میری زندگانی کو
کہ حاصل بخشش ہر اک لمحۂ بے کار ہو جائے

جو طوفان و تلاطم کو سمجھ لے بحر کا حاصل
یقیناً اس مسافر کا سفینہ پار ہو جائے

نہ افضل زہد میں کامل، نہ رندی میں کمال اس کو
کبھی ہو مے سے وہ تائب کبھی مے خوار ہو جائے

نعت

اب دل مرے پہ عشقِ شہِ دوسراؐ کا رنگ
وصفِ سخن مرا ہوا ان کی ولا کا رنگ

شانِ خدا ہے صورتِ احمد ﷺ میں جلوہ گر
نعتِ رسول ہے میری حمد و ثنا کا رنگ

وہ ﷺ حکمراں ہیں، دل پہ سو اب اُن کے حکم پر
ارماں مِرے کا رنگ، میرے مدّعا کا رنگ

کیا کیا چمن شگفتہ ہیں اس رہ گزار پر
رشکِ گلاب و لالہ ہے اس نقشِ پا کا رنگ

افضل فیوضِ حضرتِ مہر و نصیر سے
آئے گا تیری نعت میں اُنؐ کی ثنا کا رنگ

غزلیات
(کلیم احسان بٹ)

بھولے سے ایک وعدہ بھی ایفا نہیں کیا
تم نے ہمارے ساتھ یہ اچھا نہیں کیا

ہر چند زندگی میں بہت احتیاط کی
لیکن جنونِ عشق میں کیا کیا نہیں کیا

چپ چاپ ایک روز وہ رستہ بدل گیا
اس نے کسی بھی بات پر جھگڑا نہیں کیا

ایسا نہیں کہ تم سے محبت نہ تھی ہمیں
ایسا نہیں کہ دل نے تقاضا نہیں کیا

دشمن کو کیا کہیں کہ اگر دشمنی کرے
تم نے بھی کام دوستوں والا نہیں کیا

ہم سے کسی یزید کی بیعت نہ ہوسکی
ہم نے نبی ﷺ کی آل کو رسوا نہیں کیا

ہم بتکدوں میں پھرتے رہے ہیں تمام عمر
اے شیخ پار سائی کا دعوا نہیں کیا

گھر پر نہیں ملا مجھے دفتر نہیں گیا
وہ شہر سے گیا ہے تو مل کر نہیں گیا

پیرانِ پیر تیری کرامت کی خیر ہو
تعویز ڈال ڈال کے بھی ڈر نہیں گیا

یوں کھا گئی ہے شہر کی مصروفیت مجھے
میں اب کی بار عید پہ بھی گھر نہیں گیا

یہ ٹھیک ہے کہ سانس بھی لینا محال ہے
لیکن ترے بغیر کوئی مر نہیں گیا

سب اپنے کام کاج میں خوش باش ہیں کلیم
اک بچہ بھی مزاج میں مجھ پر نہیں گیا

غزلیات

(سید وقار افضل)

مجھے گمان کی دلدل میں چھوڑ جاتا ہے
وہ جاتے جاتے میرے خواب توڑ جاتا ہے

میں سرجھکائے ہوئے سیدھا چلتا رہتا ہوں
تری گلی کی طرف کوئی موڑ جاتا ہے

میں اُس کے بعد کسی اور کو نہ دیکھ سکوں
وہ جاتے جاتے مری آنکھیں پھوڑ جاتا ہے

میں بیٹھے بیٹھے کئی بار میں نہیں رہتا
کوئی خیال رگ و پے میں دوڑ جاتا ہے

کمال کرتا ہے ،جاتے ہوئے وہ جادوگر
کہ ٹوٹے پھوٹے تعلق کو جوڑ جاتا ہے

نہ جانے کون سے لمحے کا انتظار ہوا
میں پہلی بار محبت میں بے قرار ہوا

میں ظرف دیکھ کے سب مہربان یاروں کا
خود اپنے سامنے آیا تو شرمسار ہوا

تُو میرے خواب کی رنگینوں کو دیکھ ذرا
کہ اتنے پھول کھلے ہیں کہ مرغزار ہوا

نہ جانے کون سا طوفاں تھا موجزن دل میں
کہ ہنستے ہنستے اچانک میں اشک بار ہوا

زمیں پہ آنے سے پہلے میرے گریباں میں
جو ایک چاک تھا وہ سارا تار تار ہوا

یہ لوگ جس کو جنوں خیز عشق کہتے ہیں
یہ پہلی بار نہیں پہلے کتنی بار ہوا

کہاں جمال ترا اور کہاں وقار مرا
تُو میرے سامنے آیا تو اعتبار ہوا

غزلیات و منظومات

(خاور بوسالوی)

اب تو بے نام، بے نشاں سے ہیں
کیا بتائیں کہ ہم کہاں سے ہیں
بے تعلق سے ہوگئے ایسے
نہ زمیں سے نہ آسماں سے ہیں
لوگ لٹتے ہیں روشنی میں جہاں
ہم اسی شہرِ بے اماں سے ہیں
وہ جو نکلے جنوں کے رستے پر
تیر نکلے ہوئے کماں سے ہیں
نہ وہ میرے ہیں نہ میں اُن کا ہوں
لوگ بے وجہ بدگماں سے ہیں
دیکھتے بھی ہیں سوچتے بھی ہیں
ہاں یہ سچ ہے کہ بے زباں سے ہیں
یہ کہیں حسنِ اتفاق نہ ہو
آج کل خود ہی مہرباں سے ہیں
جو بھٹکتے ہیں دربدر اے دل
وہ بھی تو اپنے درمیاں سے ہیں
ہوگئے اجنبی تو کیا خاورؔ
ہم یہیں سے ہیں ہم یہاں سے ہیں

حسن، بیداد تک چلا آیا
ضبط، فریاد تک چلا آیا
ایک معصوم سی محبت تھی
ذکر اجداد تک چلا آیا
دل کی تنہائیاں وہیں کی وہیں
فرد، افراد تک چلا آیا
کوئی شے بام تک چلی آئی
حوصلہ، داد تک چلا آیا
صید مجھ سا بھی کوئی کیا ہوگا
خود ہی صیاد تک چلا آیا
عشق تیری کرشمہ سازی ہے
شاد، ناشاد تک چلا آیا
جس میں آنکھوں کا ذکر تھا، وہ شعر
"پھر سے ارشاد" تک چلا آیا
اب تو میرا نہیں یہ اُس کا ہے
شعر نقاد تک چلا آیا
دلِ برباد نے تسلی دی
عشق آباد تک چلا آیا
عشق آباد سے چلا خاورؔ
اشک آباد تک چلا آیا

غزل

(خاور بوسالوی)

عذابِ راہ گزر تم سے کچھ نہیں کہنا
کٹا ہے کیسے سفر تم سے کچھ نہیں کہنا

مجھے گلہ ہے فقط اپنی بدنصیبی سے
اے خواہشِ بے اثر تم سے کچھ نہیں کہنا

خدا نصیب کرے تم کو اونچی دیواریں
مِرا مکاں ہے یا گھر تم سے کچھ نہیں کہنا

کہوں تو اُس سے کہوں جس کو کچھ نہیں معلوم
تمھیں ہے ساری خبر تم سے کچھ نہیں کہنا

مری انا میری خاموشیوں کا باعث ہے
گلے بہت ہیں مگر تم سے کچھ نہیں کہنا

جو ظلم دیکھ کے بھی خامشی ہے دانستہ
سنو اے اہلِ نظر تم سے کچھ نہیں کہنا

تمام دعوے غلط ہیں، فضول ہیں، خاورؔ
کہوں گا کس سے اگر تم سے کچھ نہیں کہنا

ویلنٹائن ڈے ''احتجاج''

عشق کے دائمی تقاضوں کو
ایک دن کے حصار میں رکھنا
اور پھر اس کے بعد پورا سال
وصل کے انتظار میں رکھنا
یہ بھلا کون سی محبت ہے
وقت کی قید پیار میں رکھنا
ایسی چاہت پہ احتجاج اے دل
جیت والوں کو، ہار میں رکھنا

☆☆☆

الجھن

آج پھر اُس سے طے ہوا ملنا
کافی مشکل سے کافی دیر کے بعد
اُس طرف جا رہا ہوں میں لیکن
فکر لاحق ہے سوچ میں گم ہوں
کیا کہوں گا ملوں گا جب اُس سے
''کیسے آئے'' سنوں گا جب اُس سے
پاس کچھ بھی بجز ''سلام'' نہیں
میرے جذبوں کا کوئی نام نہیں

غزلیات

(سید عامر علی)

آسمانوں کی حفاظت میں چلا جاتا ہوں
اے مرے عشق عبادت میں چلا جاتا ہوں

بے ثباتی مرے چہرے پہ اتر آتی ہے
سانس لیتے ہوئے حیرت میں چلا جاتا ہوں

یہ ہوائیں جو موافق نہیں آتی مجھ کو
میری مٹی تیری قربت میں چلا جاتا ہوں

آئنے روز بنانے نہیں پڑتے اُس کو
ایک ہی شخص کی صورت میں چلا جاتا ہوں

شام ہوتی ہے تو رستے نہیں آتے مجھ کو
میں تو غافل کہیں عجلت میں چلا جاتا ہوں

پسِ دیوار تو جایا نہیں جاتا لوگو!
میں تو ہر روز محبت میں چلا جاتا ہوں

جو کبھی غیر کی محفل میں منافق نہ ملے
دوست احباب کی صحبت میں چلا جاتا ہوں

مختصر بات پہ قائل نہیں ہوتا عامرؔ
طول دیتا ہوں وضاحت میں چلا جاتا ہوں

ریت آنکھوں میں ہے دریا تجھے دیکھوں کیسے
پیاس بجھتی ہی نہیں خواب خریدوں کیسے

کھا گیا عشق تخیل بھی سخن بھی میرا
تیری تصویر بناؤں تجھے سوچوں کیسے

کوئی کوزہ بھی یہاں تم سے وفادار نہیں
میری مٹی میں تجھے چاک پہ رکھوں کیسے

خود کلامی بھی مجھے راس نہ آئی عامرؔ
اتنا خاموش ہوا ہوں کہ میں بولوں کیسے

غزلیات

(احمد عطاؔ)

مسندِ عشق سجائی ہے کمائی تو ہے
میں نے رسوائی کمائی ہے کمائی تو ہے

ایک دنیا کو رلایا ہے اسی دنیا پر
خود پہ خلقت بھی ہنسائی ہے کمائی تو ہے

لوگ تو سانس بھی مرضی سے نہ لینے دیتے
مرکے مرضی کی بنائی ہے کمائی تو ہے

اب تو مٹنے کو تھے ذلت کے نشانات یہاں
پھر سے بنیاد اٹھائی ہے کمائی تو ہے

اور تو داد طلب کچھ بھی نہیں میں نے کیا
زندگی تجھ سے نبھائی ہے کمائی تو ہے

خوب پی اور تماشا بھی کیا خوب عطاؔ
یار محفل تو سجائی ہے کمائی تو ہے

کچھ یہاں حسب ضرورت بھی نہیں دیتے لوگ
آہ بھرنے کی اجازت بھی نہیں دیتے لوگ

بن میں جانکلیں ہم آسودۂ وحشت ہوکر
چاکِ سینہ کی رعایت بھی نہیں دیتے لوگ

ہم ذرا ٹھہرکے دیکھیں تو سہی زخم اپنے
وار کرتے ہوئے مہلت بھی نہیں دیتے لوگ

دھوپ میں زخم رہے اورنمک تک نہ لگے
کتنے اچھے ہیں اذیت بھی نہیں دیتے لوگ

سادہ پانی سے عطا کام چلائے رکھیے
رند کو اب کوئی تہمت بھی نہیں دیتے لوگ

غزلیات

(علی عدنان)

کبھی جو مجھ کو تری سمت آنا پڑتا ہے — خود سے بہتر نظر نہیں آتا
تو راستے میں پرانا زمانہ پڑتا ہے — تجھ کو پتھر نظر نہیں آتا

ہماری روشنی اک دوسرے سے مختلف ہے — عشق چشمہ ہے اور کمال کا ہے
تمھیں چراغ مجھے دل جلانا پڑتا ہے — اس میں چھو کر نظر نہیں آتا

مگر یہ بات بڑی دیر میں سمجھ آئی — دل نہیں چاہتا اسے دیکھیں
کہ عشق ہوتا نہیں ہے کمانا پڑتا ہے — جو برابر نہیں نظر نہیں آتا

جو شعر تجھ پہ کہے غیر کو سناتا ہوں — زندہ رہنے کی بات کرتا ہے
تجھے جو تجھ پہ نہیں ہے سنانا پڑتا ہے — اور اکثر نظر نہیں آتا

عجیب کار اذیت ہے کار دنیا بھی — تجھ کو دستار گر نہیں دِکھتی
کسی کا چاک کسی کو گھمانا پڑتا ہے — مجھ کو بھی سر نظر نہیں آتا

حاکم شہر کی یہ خوبی ہے
کوئی کمتر نظر نہیں آتا

خواب ہے اپنے گھر کو آتا ہوں
اور مجھے درنظر نہیں آتا

غزلیات ومنظومات

(خالد فیاض خاؔلی)

کھلتا کیسے اُس کا بھید بہت کچھ چھپایا، تو جانا
جس نے دل میں رکھّا بھید میں جب مسکرایا، تو جانا

اُس کی خوشبو پُراسرار حقیقت یہ رشتوں کی کیا ہے
اُس کا جسم مہکتا بھید تعلق نبھایا، تو جانا

عشق سمندر کیا کہیے سمجھنے میں بے کار گزری
اِس کا قطرہ قطرہ بھید سمجھ کچھ نہ آیا، تو جانا

سب کے اپنے اپنے روگ کہاں جانتا تھا، کسی نے
سب کا اپنا اپنا بھید مرا دل دکھایا، تو جانا

اپنے شہر میں ہر اک شخص ہَوا کس طرف سے چلی ہے
آدھا ظاہر آدھا بھید دِیا ڈگمگایا، تو جانا

اِس کے سِوا کیا اور بھلا
مجھ سے اُس کا پردہ بھید

خاؔلی لگتا ہے ایسے
جیسے ساری دنیا بھید

☆☆☆

دعویٰ

لفظ اور معنی کا رشتہ
تیرے میرے رشتے سے
بڑھ کر ہونے کا دعوٰی
کرتا ہے
اُس رشتے سے، جس رشتے نے
اِس رشتے کو
جنم دیا تھا

غزلیات ومنظومات

(محمد سعید)

کون سا خواب دیکھا کہاں نیند کی — اک زمیں تھا کہ آسمان تھا میں
کیا بتائیں تمھیں داستاں نیند کی — اپنے لوگوں کے درمیان تھا میں
رتجگوں کا مجھے دکھ نہیں ہے مگر — آپ اتنا نہ یاد کیجے مجھے
خواب بھی لے اڑیں تتلیاں نیند کی — ایک تصویر تھا گمان تھا میں
رفتگاں گر اجازت ملے تو کہو — ایک دو لوگ مجھ میں رہتے تھے
کیا حقیقت ہے اس بے نشاں نیند کی — یعنی اُن کے لیے مکان تھا میں
پاؤں رکھا ہی تھا خواب گہ میں ابھی — خوش گماں تھا کسی کے بارے میں
سوچ پیدا ہوئی ناگہاں نیند کی — اپنے بارے میں کم گمان تھا میں
دیکھیے کیا عجب خواہشیں ہیں مری — ہائے وہ لوگ کیا ہوئے میرے لوگ
خواب کے ہونٹ ہوں اور زباں نیند کی — پچھلے وقتوں میں خاندان تھا میں
ذہن آباد ہیں جسم آزاد ہیں — شعر کہتا تھا اور سوچتا تھا
کتنی پُرشوق ہیں بستیاں نیند کی — اس سے آگے تو بے نشان تھا میں
مصرعوں کی طرح مجھ پہ کھلتی نہیں — ٹوٹ جانے کے بعد مجھ پہ کھُلا
مجھ کو درکار ہیں چابیاں نیند کی — اپنی رہ میں پڑی چٹان تھا میں
خواب دالان میں سوکھنے رکھ دیے — تھرتھراہٹ تھا ایک لمحے کی
اور بچوں کو دیں ٹافیاں نیند کی — ایک آواز کا نشان تھا میں
دوسروں کے لیے شاعری ہے سعید — تُو نے کیسے مجھے کُرید لیا
اور اپنے لیے گولیاں نیند کی — محو ہوتا ہوا گمان تھا میں

نظم

(محمد سعید)

جو ہماری نظر سے اوجھل ہیں
جن کے ملبوس میں ہے بینائی
جن کی آواز میں سماعت ہے
وہ قیود و حدودِ وقت میں سب
اجنبی گردشوں کا رزق ہوئے
جن کی خوشبو ابھی تک آتی ہے
ہم خیالوں میں چلتے پھرتے ہوئے
اور باغوں میں سیر کرتے ہوئے
یہ زمانے یہ گردشِ شب و رُوز
ایک دوجے سے متصل ہیں مگر
وقت کے باہمی تعلق کی
یہ مساوات کس کے ہاتھ آئی
کون جانے کہ لمحہء موجود
کن زمینوں کا رزقِ روشن ہیں
کون سے آسماں پہ رہتے ہیں
جو ہماری نظر سے اوجھل ہیں
وہ ستارے کہاں چمکتے ہیں

نظم

(محمد سعید)

جسم زندان ہے
یہ نہیں جانتا
روح کتنی پریشان ہے

غزل

(سارہ تعبیر)

میں ننگے پیر ہوں جلتی زمیں پر
مرے حصے کی بارش ہے کہیں پر
مرے جیسا ہے کوئی سوختہ سر
کہ میں نے خاک اڑائی خود جبیں پر
تمھیں معلوم ہے رویا تھا کوئی
تمھارے ایک چھوٹے سے نہیں پر
محبت سات رنگی سلسلہ ہے
کسی تتلی کے جیسے ہوں حسیں پر
مرے اللہ میں تجھ کو مانتی ہوں
مگر جب چوٹ لگتی ہے یقیں پر
وہ میرا پانچواں موسم تھا کوئی
جہاں سے آیا تھا لوٹا وہیں پر

یاداشت

(سارہ تعبیر)

سحر گذیدہ شام میرا ذہن چاٹتی رہی
تو ذہن پر جو ثبت ہیں
تمام دکھ تمام سکھ
یہ ہولناک شام انہیں نوچ کھائے گی
مگر وہ میرا ایک دکھ وہ عمر سے طویل دکھ
کے جیسے اک فصیلِ دکھ
سحر گذیدہ شام اس سے ہار جائے گی

غزلیات

(زین رضوی)

آنکھوں میں جن کی خواب ہیں ان کے عذاب دیکھیے
پھر بڑے شوق سے جناب آپ بھی خواب دیکھیے

ایک ہوّا بنی ہوئی ہے رات
ہم کو بچہ سمجھ رہی ہے رات

ہم کو جناب دیکھیے کتنے فراق سہہ گئے
کتنے فراق سہہ گئے ہم کو جناب دیکھیے

جب کہ تشکیل ہوچکا تھا خیال
لفظ اندھیرے میں لے گئی ہے رات

جس نے سراب پی لیا اس کی بجھے گی پیاس کیا
تشنہ لبی میں غوطہ زن اس کو برآب دیکھیے

چاند تاروں سے آسمانوں پر
اک تماشا لگا رہی ہے رات

راہِ فراق میں تو اب آبلہ پا رہے نہیں
کوئی اگر رہا تو ہم ،ہم کوجناب دیکھیے

صبح پرتال دے رہی ہے صبح
رات کا گیت گا رہی ہے رات

رنگ بھی محوِ رقص ہیں اور چھلکتی ہے شراب
عہدِ شباب خواب ہے خواب میں خواب دیکھیے

ہم اندھیرے میں رہنے والے ہیں
اورہم پرعطا ہوئی ہے رات

ہم بھی پسِ حجاب ہیں پیشِ حجاب بھی ہیں ہم
پھر بھی حجاب اٹھائیے زیرِ نقاب دیکھیے

غزلیات

(محسن شہزاد)

کوئی سورج بھی نہ اس نیند پہ وارا جائے
اب تو اس رات سے کہہ دو کہ خدارا جائے

پھر کسی بام سے اک پھول گرے رستے میں
پھر محبت کو میرے دل میں اتارا جائے

کس عبادت میں گنے جائیں گے یہ ہجر کے دن
کیسی امید پہ اب عشق کو ہارا جائے

میرا کردار بدل ڈالو کہانی میں بھلا
کیا ضروری ہے مجھے جان سے مارا جائے

چاند لکھا ہی نہیں شہر کی تقدیر میں جب
پھر کسے چھت پہ کھڑے ہو کہ پکارا جائے

یہاں سے بھاگنے کا راستہ ضروری تھا
تمھارے بعد کوئی دوسرا ضروری تھا

نہیں تو عشق کی یکسانیت لیے جاتی
یقین جانو کوئی حادثہ ضروری تھا

اکیلا اتنا ہوں گھر میں کہ اب یہ لگتا ہے
اک آئینہ کسی دیوار پہ ضروری تھا

یہ تم بجھا ہوا سورج کہاں سے لے آئے
نماز کے لیے جلتا دِیا ضروری تھا

غزل

(وجاہت تبسم)

ایسے منظر بھی ہیں حالات دکھانے والے
میرے شانوں پہ ترے بال ہیں آنے والے

اُن سے کہنا کہ وہ شجرہ بھی ہمارا پڑھ لیں
جو سمجھتے ہیں ہمیں پیٹھ دکھانے والے

حدتِ ہجر ہے ایسی ترے دیوانوں کی
یہ تو پانی میں بھی ہیں آگ لگانے والے

لو چراغوں کی بھی کچھ دیر سلامت رکھنا
اب بھی پیچھے ہیں کئی قافلے آنے والے

حضرتِ عشق مداری کو نچادیتاہے
ناچتے خود ہیں یہاں ریچھ نچانے والے

قاتلوں کو دیے ہتھیار بھی اُن لوگوں نے
قبرِ مقتول پہ جو پھول چڑھانے والے

جو پرندوں کی حفاظت نہ کریں سردی میں
اُن درختوں پہ کبھی پھل نہیں آنے والے

دیکھنا خود بھی تماشا یہ بنیں گے اک دن
جو سرِ عام تماشا ہیں لگانے والے

قطعہ تاریخ قیام زمیندار کالج گجرات ۱۹۳۷ء

پروفیسر حسن نوشاہی (شعبہ اردو)

درخشاں زمیندار کالج رہے، یہ ہے علم و دانش کی اک روشنی
سلامت رہے، تا قیامت رہے، نہ ہو ماند اس کی یہ تابندگی

زمیندار کالج بنایا گیا، علی گڑھ کا منظر سجایا گیا
یہ قومی اداروں کی روشن جبیں، سدا علم وفن میں کرے رہبری

ہوئے فضل، فرمان، حامد یہاں، جیلانی و سرور، سے عالی نشاں
یہ روشن حوالے زمیندار کے، ہے جن سے ادب کی روایت بنی

یہ ہے فخر خطہ ء گجرات کا، محافظ یہ اپنی روایات کا
بنائے کئی اس نے اہل سخن، مثالی ہے اس کی ادب پروری

ہیں عبداللہ، تائب، عنایت حسین، اسی مرکزِ علم سے سرخرو
حسن، آفتاب، انور، الیاس کو، یہیں سے گراں علمی دولت ملی

رہیں اس کے آباد دیوار و در، لہکتے مہکتے رہیں یہ شجر
خزاؤں سے محفوظ رکھے خدا، ملے عزت و شہرت دائمی

قیام زمیندار کالج کی یہ، حسن نوشہی خوب تاریخ ہے
''یہ دانش کدہ جامعِ آگہی، زمیندار کالج، بفضل علی'' ۱۹۳۷ء

☆فضل علی: نواب فضل علی خان، بانی زمیندار کالج گجرات
☆جی سرور: پروفیسر غلام سرور سابق پرنسپل زمیندار کالج (شعبہ انگریزی) سابق پرنسپل کالج
☆غلام جیلانی: پروفیسر غلام جیلانی اصغر، سابق پرنسپل (شعبہ انگریزی) سابق پرنسپل کالج
☆فضل: پروفیسر چودھری فضل حسین (شعبہ فارسی)، سابق پرنسپل کالج
☆فرمان: پروفیسر محمد فرمان: سابق پرنسپل کالج (شعبہ اردو)، صاحب ''اقبال اور تصوف''
☆حامد: پروفیسر حامد حسن سید۔ سابق پرنسپل کالج
☆عبداللہ حسین، معروف ناول نگار
☆حفیظ تائب، معروف نعت گو شاعر
☆عنایت حسین بھٹی، معروف گلوکار و اداکار ☆حسن: ڈاکٹر ملک حسن اختر، معروف مورخ، محقق اور استاد
☆آفتاب: پروفیسر آفتاب اصغر۔ صدر شعبہ فارسی، اوری اینٹل کالج لاہور
☆انور: انور مسعود، معروف شاعر، ان کی تصانیف میں میلہ اکھیاں دا، ہن کی کریئے، قطعہ کلامی
☆جسٹس (ر) محمد الیاس، سابق چیف جسٹس لاہور ہائی کورٹ، نعت گو شاعر

پنجاب رنگ

دمودر، احمد، مقبل تے وارث شاہ دے کرداراں دا ٹکراواں تول

ڈاکٹر وسیم رضا گردیزی

قصہ ہیر رانجھا صدیاں توں پنجابیاں دے دلاں دی دھڑکن آ رہیا اے۔ ایہہ قصہ چوکھا چر کہانی دے روپ وچ سینہ بہ سینہ چلدا رہیا۔ لوک شاعراں اپنی اپنی بت موجب ایس وچ رنگ، رس تے چس رلا کے جدوں لوکائی ساہویں رکھیا تاں ایہہ پنجابیاں دا ہر من پیارا قصہ بن گیا۔ پہلوں ایہہ قصہ وی لوک کہانیاں وانگوں اک سدھ پدھری کہانی دا روپ ای ہووے گا پر ہولی ہولی کہانی سنان والیاں تے لوک شاعراں دی من مرضی تے مذہب ول جھکا پاروں مذہب، متھہاس، ماورائی طاقتاں تے دوجے قصے کہانیاں دے رلدے ملدے روپ وی ایس دا حصہ بندے گئے۔

ہن تیکر دی کھوج موجب دمودر ای اوہ شاعر اے جیہنے ساریاں توں پہلاں ایس قصے نوں پنجابی شعری روپ دتا۔ دمودر نے بڑی سیانف نال پنجابی وسوں تے رہتل نوں مکھ رکھ کے ایتھوں دی لوکائی دی نفسیات موجب ایس قصے دی پاترا اساری کیتی۔ دمودر دے ایس قصے دے مہمان کوی ہون دا ایس توں وڈا ثبوت کیہہ ہوسکدا اے کہ اوہدے مگروں آون والے شاعراں بھاویں ایس قصے وچ اپنی من مرضی دے رنگ بھرے تے کجھ وکھرے پاتر وی ایس وچ لیاندے، پاترا اساری تے اوہناں دی نفسیات نوں وی بدلیا پر کہانی تے پاتراں دا بنایا دمودر دا سچا اوہ میل پتھر رہیا جیہدے توں کلی طور تے کوئی وی شاعر ہٹ کے گل نہ کر سکیا۔ ایس باب وچ، اسیں ہیر دے چار مشہور شاعراں دے پاتراں دا ٹکراواں، تول، اوہناں دیاں سانجھاں، تے نکھیڑیاں دا جائزہ لواں گے۔ وارث شاہ توں پہلاں دمودر، احمد تے مقبل ایہہ قصہ لکھ چکے سن۔ پر وارث شاہ ہوراں اپنے عظیم اسلوب، پلاٹ دی بنتر تے زبان دے رس چس نال اس نوں اوہناں سارے گناں نال مالا مال کر دتا جیہڑے مل کے کسی وی فن پارے نوں کلاسیک دا روپ دیندے نیں۔ وارث شاہ ہوراں اپنے توں پہلاں دے شاعراں دے قصیاں نوں گوہ نال ویکھیا واچیا، پلاٹ نوں اپنے ذہن موجب اساریا تے اوہدے وچ لوکائی دی سوجھ نوں مکھ رکھ کے اجیہے سوہنے رنگ بھرے کہ قصے دی دکھ ای ہور دی ہور کر چھڈی۔

دمودر تے وارث دے قصیاں وچ نفسیاتی حوالے نال ساریاں توں وڈا فرق دوواں شاعراں دے سیاسی سماجی تے معاشی حالات دا وی اے۔ دمودر اکبر دے شمے دا شاعر اے۔ اکبر ہندوستان دے اوہناں بادشاہواں وچوں سی، جیہنے برصغیر پاک و ہند دے چوکھے حصے اتے قبضہ کر لیا تے پھیر اوہنے دوجے مذہباں دے منن والیاں نوں وی رعایتاں دے کے اپنی شاہی وی اساری لئی اپنے نال جوڑ لیا۔ اوہنے قانون دی گرفت اینی پکی کیتی کہ عام آدمی توں وی ٹیکس وصولیا۔ ایہد یاں دوویں شکلاں ای سن۔ اک تاں پنڈاں دی واہی بیجی اتے مالیۂ بالہ تے دوجا شہر دے آڑھتیاں تے کارکنان کولوں ٹیکس وصولن۔ اوس توں پہلاں عام آدمی تیکر قانون دی گرفت اینی پکی نہیں سی ہوندی۔ جدوں سیاسی تے انتظامی صورت حال انج دی ہووے تاں ظاہر اے ایہد ا پرچھاواں کلاکار دی کلا اتے وی پیندا اے۔ اسیں ویکھدے آں کہ ایس عہد دے صوفی شاعر شاہ حسین تے قصہ گو دمودر دوواں دی شاعری رمزالی، علامتاں تے گجھیاں اشاریاں نال بھری پئی اے۔ ایہد ے برعکس وارث شاہ تے بلھے شاہ دی شاعری وچ زیادہ کھل کے گل سدھی کرن دا انداز بہتا ملدا اے۔ وارث دے ویلے مغلاں دیاں تخت نشینی دیاں جنگلاں، افغاناں دے دھاڑے، ایسٹ انڈیا کمپنی دا سمندر دے نال لاگویں علاقیاں اتے قبضہ، مرکز دی کمزوری، مرہٹیاں دی پنجاب تیکر لٹ

مار تے سکھ مسلاں دا قوت بن کر ابھرنا، اجیہے حالات سن کہ کدھرے وی کوئی استحکام وکھالی نہیں سی دیندا جیہد ا سٹا ایہہ نکلیا کہ وارث نے جدوں اپنے شعے دے پاترا سارے تاں اوہناں دے وچ کھیہہ بازی تے اکیواں سبھ سبھا ای وکھالی دین لگ پیا۔

دوشاعراں دے شعے دے اڈ واڈ حالات دا کارن اے کہ دمودر دے قصے وچ پاتر بڑے سہج سبھا نال گل کردے نیں جد کہ وارث شاہ دے پاتر بہتی واری اکے ستے لگدے نیں۔ اوہناں دی نفسیات وچ بے وساہی انتاں دی اے۔ جیہد یاں مثالاں لڈن، مولوی تے قاضی دے پاتر نیں۔ ہن اسیں ایتھے دمودر احمد، مقبل تے وارث شاہ دے پاتراں دا ٹکراواں تول کردے آں۔

(1) دمودر تے وارث شاہ

کسے وی داستان وچ پاتراں دی گنتی گنی متھی نہیں ہوندی پر مرکزی کردارا کوجیہے ہوندے نیں۔ دمودر تے وارث شاہ ہوراں دے پاتراں دی سبھ توں وڈی سانجھ ایہہ ای کہ اوہناں کول ایس قصے دے مرکزی پاتر رانجھا، ہیر، کیدو تے سہتی نیں۔ وارث شاہ ہوراں وی اپنے قصہ، ہیر دی عمارت نوں ایہناں چونہہ پاتراں دے تھماں تے اسار یا اے۔ ذیلی پاتر دوواں کول اک دوجے نالوں کجھ کجھ وکھرے وی نیں۔ پر ایہناں مرکزی پاتراں نوں وی جے ساہمنے رکھ کے ویکھیا جائے تاں ایہناں وچ وی کئی وکھر یویں ویکھے جاسکدے نیں۔

رانجھا:۔

سبھ توں پہلاں اسیں ایس داستان دے ہیرو پاتر رانجھے نوں ساہمنے رکھ کے ویکھدے آں کہ ایہہ پاتر دمودر کول کنج دا اے تے وارث شاہ ہوراں ایس پاترنوں کنج اسار یا اے۔ دمودر دے رانجھے دے پیو داناں ''معظم'' تے وارث شاہ ہوراں ''موجو'' چودھری لکھیا اے۔ دوواں شاعراں کول اوہ گھر وچ ساریاں توں نکا بال اے تے ایسے پاروں سبھ توں ودھ لاڈلا وی اے۔

داستان وچ رانجھے دی مڈھلی تے تعارفی سطح اتے وارث شاہ ہوریں رانجھے بارے صرف اک مصرعہ لکھ کے ای اوہدا سارا بچپن وکھا دیندے نیں۔

وارث شاہ ایہہ قدرتاں رب دیاں نیں، دھیدو نال اوس بہت پیار آہا (1)

جد کہ دمودر نے رانجھے دی حیاتی دے پہلے ورھے بڑی تفصیل نال اک اک کر کے بیان کیتے نیں تے ایہناں ذکر جوگ ورھیاں وچ دو گلاں اوس رانجھے دے پاتر بارے بڑیاں اہم کیتیاں نیں۔

دو ورھیاں دا دھیدو ہویا، ڈھک رہی کڑمائی
چونہہ ورھیاں دا دھیدو ہویا، تاں سورج جھات وکھائی
چھے ورھیاں دا دھیدو ہویا، تاں سبھ کوئی ویکھن آئے
چھے ورھیاں دا پورا ہویا تاں موئی رانجھے دی اماں (2)

دمودر دیاں کیتیاں ایہہ دووِیں گلاں رانجھے دے پاترنوں مڈھ وچ ای کمزور کر دیندیاں نیں۔ بچپن دی کڑمائی بھاویں پنجابی وسوں وچ اج وی موجود اے، پر رانجھے ورگا داستان دا ہیرو پاترا سارن لگیاں ایہہ گل رانجھے دے پاترنوں کمزور کر دیندی اے تے پڑھن والیاں دی دلچسپی نوں وی گھٹ کر دی اے۔ دوجی گل چھے ورھیاں دے رانجھے دی ماں نوں مار دینا وی اوہدی شخصیت نوں کمزور کرن والی گل اے کیوں

جے ژنگ دے بقول نکی عمراں دے مرن نال بالاں وچ (Mother Complex) وی جم پیندا اے تے اوہ بال عورتاں دی ہمدردی دے جاں اوہناں دے نیڑے رہن دے چاہیوان بن جاندے نیں۔ دمودر دے مقابلے وچ وارث شاہ ہوراں شعوری طور تے ایس گل نوں مکھ رکھیا تے اوہناں اپنے رانجھے دے پاترنوں ایہناں دوواں گلاں توں اڈا ساریا۔

ایہدے مگروں رانجھے دا واہ اپنے بھراواں نال پیندا اے۔ دمودر دسدا اے کہ رانجھے دے بھراواں اوہنوں جانوں مارن دا متا پکایا۔

طاہر، ظاہر جیون متا کیتا، چھوہر اسیں مریہاں
کل عالم ویکھن آئے اس نوں اسیں کہنوں منع کریہاں
مشکل سکداری اساں تائیں جے اس جیون دیہاں
آکھو بھائی انجے بندی، ایہہ چھومر اسیں مریہاں (3)

دمودر نے بھراواں کولوں زمین لئی رانجھے نوں مردان دا متا پکوایا اے۔ ایہہ گل وی ساڈی وسوں وچ کوئی اینی عجیب نہیں پر وارث شاہ ہوراں ایہہ گل اک بہت وڈی حقیقت، بیگانیاں، یعنی بھابھیاں ولوں کروائی اے۔ وارث ہوراں رانجھے دے بھراواں نوں ساہمنے آون ای نہیں دتا سگوں ساریاں لڑائیاں تے کوڑے بول بھابھیاں دے موہنوں اکھوا کے رانجھے نوں پنڈ چھڈ جان تے مجبور کیتا اے۔

بھابھی رزق اداس جاں ہوڑیا ہن کاہ نوں گھیر کے ٹھگدیاں ہو
پہلے ساڑ کے جیو نمانڑے دا پچھوں بھلیاں لاونیں لگدیاں ہو
بھائی ساک سن سوتساں وکھ کیتے تسیں ساک کیہ ساڈیاں لگدیاں ہو
وارث شاہ اکلڑے کیہ کرنا تسیں ساک کیہ ساڈیاں لگدیاں ہو (4)

ہیر تے رانجھے دی ملاقات ویلے دمودر دے رانجھے دا کردار وارث دے رانجھے دے کردار نالوں بہت کمزور اے۔ اوہدی دکھ تے شخصیت ہیر نوں ذرا وی متاثر نہیں کر سکی نالے اوہ ہیر کولوں ڈر دا وی اے تے ونجھلی وجا کے، ہیر نوں متاثر کرن دی کوشش کردا اے۔ دمودر ہیر تے رانجھے دی پہلی ملاقات انج کراندا اے۔

دھیدو پلنگ توں ٹپ کھلوتا، پچھے چوچک جائی جائے
پچھے ہیر، کیہ کجھ تینڈڑے وچ؟ مینوں گل دسانبے
تاں ونجھلی تے ممیہا دوویں، رانجھے کڈھ وکھائے
آکھ دمودر ہیر تد آکھے، ہک وارتوں ونجھلی وانبے (5)

ہیر تے رانجھے دا اوہ کیہڑا پیار اے جیہڑا اک دوجے نوں ویکھن نال نہیں ہویا تے ونجھلی وجن نال ہو گیا۔ ایہہ پیار جے ہووی جائے تاں ونجھلی دے سر نال تاں ہو سکدا اے پر رانجھے نال نہیں، پر دوجے پاسے وارث شاہ ہوراں کوزے وچ دریا بند کردا اے تے اوہناں ایس ساری کیفیت نوں انج بیان کیتا اے۔

کوکے ماریں مارتے پکڑ چھمک پری آدمی تے قہروان ہوئی

رانجھے اٹھ کے آکھیاواہ سجن، ہیرہس تے مہربان ہوئی (6)

ایئی کوگل خورے کسے نویں پڑھنہارنوں وی عجیب لگے پراوہ رانجھا کنج داسی جیہدے تے ہیرہس کے مہربان ہوئی وارث شاہ ہوراں انج چتریااے۔

کچھ ونجھلی کن دے وچ والا زلف مکھڑے تے پریشان ہوئی

بھنیں وال چوٹی بھواں چن رانجھا نین کجلے دی گھسان ہوئی

صورت یوسف دی ویکھ طیموس بیٹی سنیں مالکی بہت حیران ہوئی

روپ جٹ دا ویکھ کے جاگ لدھی ہیر گھول گھتی قربان ہوئی

رانجھےداچاک رہنا، بیلے وچ ہیرنوں ملنا، چوچک نوں پتہ لگ جانا تے اوہدا ہیر داویاہ کھیڑیاں ول کردینا دمودر تے وارث شاہ ہوراں کول لگ بھگ اکوجیہااے۔ پرویاہ ہوجان مگروں دمودر دارانجھا ہیرنوں انج دے میہنے دے کے ناکام ہوکے تخت ہزارے چلا جاندااے۔

ناہس چاک چردکا ہیرے میں بھی راٹھاں جایا

آئے اساڈا جی پھدھو ای، تاں میں چاک سدایا

پھراں مریندا چھمکاں کھاندا، پیو دا ناں ونجھایا

آکھ حقیقت اپنی ہیرے، تیں کیہ من تے آیا (8)

دمودر رانجھا اپنے نال دے چاکاں دے مہنیاں تے اوہناں نوں ایہہ جواب دینداا ے۔

جے کرہیر گھس لیتی کھیڑدیاں ،ہزارہ نہ کھڑیا (9)

تے ہیرنوں وی آکھدااے

تدھ میں ساک کویہا ہیرے! میں جلاں تخت ہزارے (10)

پروارث دارانجھااتلی دمودروالی صورت حال وچ ہٹھ داپکااے۔اوس اک واری وی پچھے مڑجان دا سوچیاوی نہیں۔اوہنوں تے جدوں چوچک پہلی واری مجھاں چارن توں جواب دینداا ے اوہ اوس ویلے وی جاندااے کہ اوہدے بغیر مجھاں نہیں چرنیاں تے اخیر چوچک تے ملکی اوہنوں مناکے ترلے منتاں کر کے واپس گھرلیاوندے نیں۔ ہیرداویاہ کھیڑیاں ول ہوجان تے وارث دارانجھا سیالاں دی میہنیاں نال بیٹھلی اتے کر دینداا ے تے ہیردے آکھن تے جوگی بن کے اگے داپینڈا کرداا ے، پارمن کے تخت ہزارے ول نہیں مونہہ کردا۔ہیرداویاہ کھیڑیاں ول ہوجاندااے اوتھے وارث نے جیہڑا بندرانجھے دے موہنوں اکھوایااے اوہ دنیا بھر دے ماڑیاں دی نفسیات نوں بیان دی انتہا اے تے ایس توں ودھ کوئی ماڑیاں دی نفسیات بیان دی کیہ سکدااے۔

ساک ماڑیاں دے کھوہ لین ڈاہڈے ان پہجدے اوہ نہ بولدے نی

نہیں چلدا دس لاچارہوکے موئے سپ وانگوں دس گھولدے نی

کدی آکھدے مارے آپ مرے پئے اندروں باہروں ڈولدے نی
گن ماڑیاں دے سبھے رہن وچے ماڑے ماڑیاں دے دکھ پھولدے نی
شاندارنوں کرے نہ کوئی جھوٹھا کنگال جھوٹھا کرتولدے نی
وارث شاہ لٹائیندے گھریں ماڑے مارے خوف دے موہوں نہ بولدے نی (11)

دمودر دے رانجھے دا پاتر ماڑا کمزور تے نتاناں اے اوہ ہیر دے ویاہ مگروں واپس تخت ہزارے پرت جانداا ے تے بھراواں دے اکھاں وکھان تے پنڈوں باہر دھواں پا کے ڈیرہ لا لیندا اے۔ راموباہمن دے سنیہے تے جیہنوں سہتی ٹوردی اے جوگ لین سدھ بگائی دے ڈیرے لے تے جانداا ے۔ جوگ ملن مگروں سہتی دے چلتر نال ہیرنوں کڈھ کے لے جانداا ے۔ کھیڑے اوہناں نوں پھڑ کے کوٹ قبولے دے راجے دے پیش کردے نیں۔ راجا کھیڑیاں دے حق وچ فیصلہ کرداا ے، بددعا نال شہرنوں اگ لگدی اے تے ہیر رانجھے نوں مل جاندی اے۔ جے دوواں شاعراں دے سارے رانجھے دے پاترنوں ویکھیے تے دمودر دا رانجھا ماڑا تے نماناں اے جیہدی نہ اپنی مرضی اے تے نہ ای اپنی زبان اوہ کسے دے اگے نہیں کسکدا۔ تے دوجیاں دی مرضی مطابق چلداا ے تے بڑی کمزور تے کمپلیکسڈ شخصیت دا مالک اے۔ جدکہ وارث دا رانجھا بڑا متحرک پاترا ے دلیر تے ات سوہنا اے، ایہدا ای اوہنوں مان وی اے۔ اوہ راہ وچ آون والے وسیب دے دوادارایاں دیاں نمائندیاں 'ملاں' تے 'لڈن' دیاں سوالاں جواباں راہیں چکریاں بھواں ویندا اے۔ کدھرے کمزور نہیں پیندا، پچھانہہ پرتنا اوہدے سبھا وچ ای نہیں۔ اوہ بڑی ٹھاٹھ نال جوگ لیندا اے تے سہتی دیاں کرڑیاں سوالاں دے جواب دے کے داستان دا رنگ ڈھنگ ای بدل دیندا اے۔ دمودر دے رانجھے کول اک دوتھاواں اجیہیاں وی نیں جتھے پڑھن والےنوں ہاساوی آوندا اے۔ اک اوہ تھاں جتھے رانجھا سنڈ ھے تے چڑھ کے سیدھے کھیڑےنوں ویکھن جانداا ے تو دوجا ہیر دے ڈولے نال وی رانجھے دا جانا۔ انج تے خورے کدھرے وی پنجاب وچ نہ پہلاں تے نہ ای اج ہویا اے۔ جدکہ وارث دے رانجھے وچ انج دی کوئی جھول نہیں اوہ تے سارا سفر پڑھن والیاں دیاں اسیساں وچ کرداا ے تے کدھرے وی پڑھن والے اوہدے تے ہسن دا سوچ وی نہیں سکدے۔

ہیر:۔

ہیر دا پاتر دمودر تے وارث شاہ ہوراں کول اکو جیہی اٹھان دا مالک اے اتھرا، مونہہ زور، لاڈلا تے کسےنوں وی خاطر وچ نہ لیاون والا۔ سارے وسیبی جبر نال ٹکرلین والا تے وسیبی باندھاں نوں توڑن بھنن تے اوہناں تے چا گھ کرن والا اے، پر فیروی تھوڑے بہتے فرق ایہناں دوواں شاعراں دے بیان ڈھنگ وچ موجود نیں۔ دمودر نے ہیر دے پاتر دی اساری وی ورھے وار کیتی اے پر ایتھے اک واری فیر اوہ ہیروئن دے پاتر دی اساری کرن لگیاں ٹپلا کھا گیا اے تے ہیر دی منگنی وی دوسالاں دی عمر وچ کرواد یندا اے۔ انج جاپدا اے جیویں دمودر دے دور وچ دوورھیاں دے بال دی منگنی کرن دا رواج ہووے کیوں جے اوس رانجھے دی وی انج ای منگنی کروائی اے۔ دمودر ہیر دی نفسیاتی نشوونما ورھے وار انج کرداا ے۔

دوورھیاں دی چھوہر ہوئی ڈھک رہیاں کڑمائیاں
چونہہ ورھیاں دی چھوہر ہوئی گلاں کرے سچیائیاں

چھیاں ورھیاں دی چھوہر ہوئی تاں لگی کرن بھلیائیاں
اٹھاں ورھیاں دی چھوہر ہوئی تاں دردر کوکاں پائیاں
دساں ورھیاں دی چھوہر ہوئی چارے نئیں نوائیاں
باراں ورھیاں دی چھوہر ہوئی تاں رانجھے اکھیں لائیاں (12)

پر وارث شاہ ہوراں ہیر دا پاترا سارن لئی انج دی کسے وی گل دی لوڑ ای نہیں سمجھی او ہناں ہیر دا سراپا لیکیا تے اوہدے وچوں ہیر دی جو تصویر ابھردی اے ،اوہ ای ہیر اے۔اوہدے سارے گن ،اوہدا پورا پاتر وارث شاہ ہوراں ہیر دے سراپے وچ ای کھڑا کر دتا اے۔دمودر نے ہیر نوں چونہہ بھراواں دی بھین وکھایا اے،جیہڑی لاڈلی اے تے وارث شاہ ہوراں صرف دو بھین بھرا وکھائے نیں اک بھرا سلطان تے دوجی ہیر۔ایہہ دوویں جنساں مرد تے عورت وی گھر وچ اپنی اپنی تھاں لاڈلے نیں۔ہیر دا پاتر دمودر تے وارث شاہ ہوراں کول ژنگ دے،Animus،دی مکمل تصویر اے۔اوہدے اندر دا مرد بڑا تگڑا اے۔پر دمودر نے تے ہیر نوں سچ مچ دا مرد تے اوہ وی سور ما تے لڑاکا بنا کے پیش کیتا اے جیہڑی کہ نورے ورگے اک تگڑے راٹھ نال بیڑی دی مالکی دی جنگ لڑدی اے تے جدوں نورے دا لشکر جیہڑا نامی گرامی لڑاکیاں دا جتھا اے۔دمودر ہیر دیاں سہیلیاں کولوں نورے دے لشکر نوں تگڑی بھاج دواندا اے۔ایہہ گل کسے وی طرح پڑھن والے نوں پچدی نہیں۔دمودر لکھدا اے۔

ہیر دھروہ کرماری مصری، سرنورے دے سٹی
آئی راس نہ گئی چھوہاویں، دھرت رت ورتی
ادھا دھڑ ہنے وچ پھاتا، ادھا ڈٹھا دھرتی
آکھ دمودر کیکن دے،جیوں دھوبی ستھن گھتی (13)

دمودر دی پاترا ساری دے حوالے نال جے ایہہ گل وی من لیے کہ ہیر بڑی بہادر اے جیہڑی سورمیاں دے موہنہ وی بھن دیندی اے۔اک پاسے تے ہیر دی ایہہ اٹھان اے کہ لڈن نوں وی جھمب دیتا تے نورے دے کٹک نوں وی رتورت کر کے نسا دیتا۔اودوں تیکر دی ہیر راٹھا چاری وسیب وچ پھسی ہوئی اے،اوہ راٹھاں وانگوں لڑائیاں وی کردی اے تے اپنے کی کارے نال وی دھروہ کر لیندی اے، پر جدوں رانجھے دی پریت اوہدے من وچ اتردی اے تاں اوہدے اندروں ہور طرح دی بندیائی نسر دی اے۔عشق آپوں ای تبدیلی داناں اے تے رانجھے دی ہیر ہن ہور سیدھاں تے سوچدی اے۔

تاں روندی ہیر نہ بولے واتوں ،ذرا بلیندی ناہیں
دکھ نہ تھمے ڈسکیں رووے کوئی بجھ سکے ناہیں
روندے نین کریندی زاری گیں تھوں وکھ وناڈئیں
آکھ دمودر ہسی پچھے، پھر پھر ہیرے تائیں (14)

پر وارث ہوراں کول جیہڑی ہیر دے پاتر دی اٹھان اے اوتھے عشق دا بیان، بہت ڈھکواں اے

رانجھے اٹھ کے آکھیا واہ سجن ہیرہس کے تے مہربان ہوئی
نین مست کلیجڑے وچ دھانیں ہیرگھول گھتی قربان ہوئی
وارث شاہ نہ تھاؤں دم مارنے دی چارچشماں دی جدوں گھمسان ہوئی (15)

سیدعلی عباس جلالپوری، مقامات وارث شاہ، وچ لکھدے نیں

''ہیر رانجھے کو دیکھ کر ہچک رہ گئی جس طرح زلیخا یوسف علی کو نظارے سے اپنے حواس کھو بیٹھتی تھی، وارث شاہ کہتے ہیں کہ چاہنے والوں کی آنکھیں چار ہوں تو وہاں دم مارنے کی گنجائش کیا رہ جاتی ہے دیکھتے دیکھتے عشق طلوع ہوتا ہے اور عشاق کے دل وجان پر چھا جاتا ہے۔ اسے چارچشموں کی گھمسان سے تعبیر کرنا نہایت بلیغ انداز بیان ہے''۔ (16)

دمودر دی ہیر وی ایہہ انداز اختیار کر لیندی اے پر رون پٹن تے زمین تے لکیراں واہ کے سوچن توں مگروں

نہ کوئی آکھو، ہیرے مینوں نہ کوئی آکھ سلیٹی
ذات سنات پچھانو ناہیں میں چاکے نال چکیٹی
کدوں چوچک ماں پیو مینڈا میں کدن اوہناں دی بیٹی
دامن آلڑ لگی تینڈے جے پواں قبول بٹیٹی (17)

بھاویں ایتھے آ کے دمودر نے وارث توں وی اگلی گل کیتی اے کہ ہیر رانجھے دے پیار وچ اپنے ماں پیونوں وی بھل جاندی اے۔ پر سیانے آکھدے نیں پھل موسم دا گل ویلے دی۔ دمودر نے پچھے رانجھے نوں ملن مگروں رداپٹا کے، سوچاں وچ پا کے ہیر دے پاترنوں کمزور ضرور کر دتا اے بھاویں وقتی طور تے ای۔ پر وارث دی، ہیر کدھرے وی ماپیاں نالوں وکھ ہو کے نہیں رہندی تے نہ ای اوہناں توں وکھ ہو کے اپنی رانجھے نال پچھان بنانا چاہندی اے۔ جیہدا ثبوت اخیر تے جا کے وی اوہدا ماپیاں دی گل من لینا اے بھاویں اوہناں اوہنوں زہرا ی کیوں نہ دے دتا۔ نالے ایہ وی اکھان دمودر دی ہیر تے پورا ڈھکدا اے جدوں اوہ رانجھے نال عشق ہو جان مگروں سوچ رہی اے کہ ہن کیہ کراں گی؟ کیہ بنے گا اکھان ایہ اے کہ جتھے عقل دیاں حداں مکدیاں نیں اوتھوں عشق دیاں حداں شروع ہوندیاں نیں۔ ایس لئی اوتھے ہیر دا سوچ وچار وچ پیناوی اوہنوں کمزور ثابت کردا اے۔ روایت پسند بھاویں اوہنوں اوس صورت حال وچ سیانا پاتر گندے رہن۔

دمودر دے ایہناں بولاں توں، سولہویں صدی دے اشرافیہ دی تصویر ابھر دی اے کہ اوہناں دے گھراں وچ تھاں بناون لئی کیہو جیہے ورتن ورتاء دی لوڑ ہوندی اے۔ انج دمودر دی ہیر وڈے فطری طریقے نال رانجھے نوں چوچک وی لوڑ بنا دیندی اے۔

ہولی ٹریں تے مٹھا بولیں، پہلوں منگیں پانی
مونہہ تے ڈھال دیویں لڑ لنگی گل نہ بوہت بکھانی (18)

اوہ رانجھے نوں مونہہ کجن لئی وی آکھدی اے تے بہتیاں گلاں کرن توں وی ہوڑ دی اے۔ وارث شاہ ہوراں دی ہیر بڑی بااعتماد اے اوہنوں پتہ اے کہ اوس جیہڑے کم نوں ہتھ پالینا اے اوہ کر وکھانا اے۔ ایسے لئی اوہ نہ تے رانجھے نوں ای کجھ سمجھاندی اے تے نہ ای پیودے ترلے منتاں کر دی اے سگوں رانجھے نوں اوسے سوہنے سنکھے حلیے وچ پیودے ساہمنے پیش کر کے ایہہ اعلان کر دی اے

ہیر جائیکے آکھدی بابلا وے تیرے ناؤں توں گھول گھمائیاں میں
میری جان بابل جیویں ڈھول راجا ماہی مہیں دا ڈھونڈ لیائیاں میں (18)

ہیر دے ہجر فراق دے بیان بھاویں وارث کول بڑے اعلیٰ درجے نیں، دل نوں رگ بھر دے نیں تے پڑھن والیاں ویاں اکھاں گلیاں کر دیندے نیں پر جذبیاں دے بیان وچ دمودر وی گھٹ نہیں، دمودر دی ہیر دا وکھریواں وارث نالوں ایہہ وی اے کہ کھیڑے ہیر نوں ویاہ مگروں وکھرا کر دیندے نیں۔ اوتھے ہیر رانجھے دی جدائی وچ تڑف رہی اے دمودر نے بڑے سوہنے ڈھنگ نال اوہدیاں نفسیاتی تے جسمانی لوڑاں نوں بیانیا اے۔

سِک رانجھے دی ہیرے تائیں، جیکر کچا پارہ
تڑپھے صحیح نہایت مچھی، گلدا پنڈا وچارا
سلگے سلگ سلگ پھر بجھے، مونہہ نہ بولن ہارا
ہیر سیالی دیہی گالی، کجھ نہ چلدا چارا (20)

دمودر کول وی ہیر دا پاتر تگڑا تے مونہہ زور اے۔ اوہ وی وارث دی ہیر وانگوں قاضی نوں ٹھکویں جواب دیندی اے تے کھیڑے نال نکاح ویلے قاضی جدوں اوہدے نک کن وڈھن دا ڈراوا دیندا اے، اوہنوں اگوں آکھدی اے۔

نک کن تنہاں دے کپیے، جو یاری چوری کریندا
دوجا نک تنہاں دا وڈھیے جو حق پرایا لیندا
رانجھن میرا میں رانجھن دی بیا نکاح نہ تھیندا
اکھیں کدی نہ ڈٹھا کھیڑا کنیں پیا سنیندا (21)

دمودر تے وارث شاہ ہوراں کول ہیر دا پاتر جاگیرداری سماج تے اوہناں دیاں بنائیاں جھوٹھیاں قدراں دا نابر پاتر اے۔ دوواں شاعراں دے قصیاں وچ ہیر دا انداز فتح کرن والا اے۔ ایس پاتر راہیں دوواں شاعراں وسیب وچ عورت دے مرے ہوئے پاتر نوں نویں سرے توں زندہ کیتا اے تے اپنے حق لئی لڑن دا ول دسیا اے۔ دوواں شاعراں کول ہیر دا پاتر اپنے آپ نوں کسے وی پرائے مرد دی غلامی وچ دین نوں تیار نہیں۔ اوہدے من وچ رانجھا وسدا سی تے اوس رانجھے نوں حاصل کرن لئی اپنا پورا ٹل لایا۔ دمودر دی ہیر نے رانجھا حاصل کر لیا پر وارث دی ہیر نوں اخیر جھوٹھے سماج نے زہر دے کے مار دتا۔ ہیر دے پاتر نوں ہر من پیارا پاتر بناون پچھے اساڈی لوک پریت وی اے، پر دمودر تے وارث ورگیاں شاعراں جدوں اوہدیاں باریک نفسیاتی کیفیتاں نوں الیکیا تاں ای اوہ عورت دی آزادی دا استعارہ بنی اے۔

سہتی:۔

سہتی دا پاتر دمودر تے وارث شاہ ہوراں کول بڑا اہم اے۔ دوواں شاعراں کول ایس پاتر دے رنگ ڈھنگ تے کرنیاں وکھو وکھ نیں پر اک کم دوواں کول سانجھا اے تے اوہ اے رانجھے تے ہیر دا ملاپ۔ دمودر کول سہتی دا پاتر بڑا عجیب اے اوہ پنڈوں باہر رہندی اے، ہیر دے ویاہ کے آون تے اوہنوں پنڈوں باہر جتھے رکھیا جاندا اے اوتھے اوہ ہیر دی ہمسائی بندی اے تے رامو باہمن نوں گھل کے ہیر دے ویاہ مگروں تخت ہزارے پرت گئے رانجھے نوں دوبارہ سد کے ملاندی اے۔ دمودر دی سہتی وی ہیر نوں آوندیاں ای پچھان جاندی اے

کہ ایہہ او یاہ ایہدی مرضی دے مرد نال نہیں ہویا۔ جدوں اوہنوں پتہ لگدا اے کہ ہیر رانجھے نوں پسند کردی اے تے فیر اوہ بے غرض ہو کے رانجھے نوں سدوا کے ہیر رانجھے دا میل کروانی اے۔ ہیر نوں سپ لڑوا کے رانجھے توں اوہدا علاج کرن لئی چالی دن کمرے وچ بند رکھدی اے اوہناں دی مدد وی کردی اے۔ دمودر دی سہتی بغیر کسے غرض دے ایہہ سارا کجھ کردی اے اوہدے اندر صرف زنانی دا دکھ دردا اے۔ پر دوجے پاسے وارث دی سہتی تے پڑھن سنن والیاں دے کناں نوں ہتھ لوا دیندی اے۔ اوہ جوگی رانجھے دیاں سوالاں نال پھر کیاں چھیڑ دیندی اے تے داستان وچ اجیہا رنگ بھردی اے جیہڑا بھلن والا نہیں۔ سہتی راہیں وارث شاہ ہوراں چاتر تے چالاک زنانیاں دی نفسیات دا بھرواں وکھالا کیتا اے۔ وارث دی سہتی پرلے درجے دی مطلبی وی اے۔ پہلاں تے اوہ رانجھے دے پیر ای زمین تے نہیں آون دیندی پر جدوں رانجھا اوہنوں مراد بلوچ ملان دی گل کردا اے تے فیر اوہدے پیریں پے جاندی اے۔ رانجھے ہیر ادل میل وی کراندی اے، ہیر نوں جنسی حوالیاں نال چھیڑدی وی اے تے اوہناں نوں نسن وچ مدد دیندی اے تے آپ مراد بلوچ نال نس جاندی اے۔ سہتی دا پاتر قصے دی بھرویں لوڑ اے جیہنوں دوواں شاعراں اپنی اپنی بت تے سمجھ بوجھ نال اساریا اے۔ دمودر دی سہتی دا سبھا درویشاں والا اے جد کہ وارث دی سہتی دا سبھا خود غرضانہ اے۔ پر ایہدے باوجود اوہ ہیر تے رانجھے دا میل وی کروا دیندی اے دمودر دی سہتی ہیر تے رانجھے نوں ایہہ کہہ کے ودیا کردی اے

سن نی ہیرے آکھ حقیقت کتنا کوڑ اکھائیں
کندھیں اتے دوڑیں، آخر میں ڈھیہسائیں
ہووے بول سچاواں ہیرے، سکدے روح ملائیں
کھاوو پیوو، موجاں کریو، آکھ کے تساں سنائیں
آکھ دمودر سنی سلیٹی، جے مراں تاں کم تساہیں (22)

جد کہ وارث دی سہتی ہیر تے رانجھے نوں تورن لگیاں مراد ملان دی سک انج ظاہر کردی اے۔

نکل کوٹھیوں ترن نوں تیار ہوئے سہتی آن، حضور سلام کیتا
بیڑا الا، بنے اساں عاجزاں دا رب فضل تیرے اتے عام کیتا
میرا یار ملاوناں واسطہ ای کم تیرا سرانجام کیتا
بھابھی ہتھ پھڑائیکے تو ردتی کم کھیڑیاں دا سبھو خام کیتا (23)

کیدو:۔

کیدو قصہ ہیر دا بڑا اہم پاتر اے جیہدا مرتبہ داستان وچ ولن والا اے۔ کیدو دمودر کول وی برائی دا استعارہ اے تے وارث شاہ ہوراں تے ایس پاتر نوں آرکیٹائیپل پاتر بنا دتا اے تاں ای اج وی جتھے کوئی پاتر دو پیار کرن والیاں وچکار آون دا چارہ کرے، پیار کرن والے وی تے دوجے وی اوہنوں کیدو آکھدے نیں۔ دمودر کول کیدو چوچک دا سکا بھرا اے۔ دمودر ایس بارے انج لکھدا اے۔

ہوئے دیوانہ چوچک خانا، کیدو سدا نایا
تھیو نہ نا بر میری ولوں، مینڈے ماں پیوجایا (24)

جد کہ وارث شاہ ہوراں کول کیدو چوچک دا سکا بھرا نہیں سگوں اوہ پنڈوں باہر جھگی وچ رہنداا ے، نشئی تے بھنگی اے، ہیر اوہدے بارے رانجھے نوں دسدی اے۔

ساڈے کھوج نوں تک کے کرے چغلی دینہہ رات ہے وچ برائیاں دے
ملے سراں نوں ایہہ وچھوڑ دیندا بھنگ گھتداوچ کڑمائیاں دے (25)

دمودر کول ہیر دا پیو مہر چوچک کیدو دے ترلے کر کے اوہنوں بیلے وچ ہیر تے رانجھے دی سوہ لین گھلداا ے۔ دمودر آکھداا ے۔

سن بھائی میں صدقے کیتا، تینوں آکھ سنائیں
بیلے جائے حقیقت گھنے،آ آکھیں میں تائیں (26)

پر وارث شاہ ہوراں دا کیدو آپ ہیر رانجھے دی کھوج وچ اے:۔

کیدو ڈھونڈ دا کھوج نوں بھرے بوھندا باس چوری دی بیلیوں آوندی اے
وارث شاہ میاں ویکھو ٹنگ لنگی شیطان دی کلا جگاوندی اے (27)

'دمودر' دا کیدو وی ہے شیطان ای کیوں جے چوچک اوہنوں ترلے نال ہیر رانجھے بارے پتہ کرن لئی آکھداا ے تے اوہ چوچک دا پردہ نہیں رکھدا سگوں ساریاں نوں اکٹھا کر کے آکھداا ے۔

سنو سیالو دھیاں والو! دھیاں مول نہ رکھو
بکے تاں دھیا نئیں لڑھاؤ، بگے سر کریاد رکھو
بک بک ونڈی آوندی ناہے، انگل بھر بھر چکھو
تسیں کھاندے ہو ڈھوڈا تھاپی،چاک کھاندے ایہہ وتھو (28)

تے وارث شاہ ہوراں دا کیدو وی چوچک دی عزت پرہے وچ جا کے انج اچھال داا ے۔

پرہے وچ کیدو جاء پگ ماری چلو ویکھ لو اولیاں نیں (29)

ایس شکایت مگروں کیدو نوں گلاں ہیر دیاں سہیلیاں دا کٹن تے کلی ساڑن دوواں شاعراں کول سانجھاا ے پر دمودر دا کیدو ہیر دے آکھن تے جوہ چھڈ جانداا ے، پر وارث شاہ ہوراں دا کیدو بڑا تگڑا پاترا ا ے۔ اوہ برائی دا سمبل اے۔ اک لت توں لنگا، شکل دا کوجھا، نہ رواں نہ دھواں نہ زمین نہ جائیداد، منگ تنگ کے کھانداا ے تے احساس کمتری دا شکارا ے۔ ایڈلر دی احساس کمتری دی تھیوری وارث شاہ ہوراں دے کیدو تے پوری اتردی اے۔ آپ پنجابی وسوں دی سوجھ، لنگے تے کانے دی اک رگ ودھ، آکھ کے کیدو دے پاترنوں شیطان ثابت کردی اے۔ وارث دا کیدو چوچک کولوں بے عزت ہو کے، ہیر کولوں پھاٹ کھا کے، ہیر دیاں سہیلیاں کولوں کٹ کھا تے جھگی سڑوا کے وی باز نہیں آوندا۔ اوہ پرھیا وچ چوچک نوں بھنڈ داوی اے تے چوچک اوہدے آکھے لگ کے ہیر دا ویاہ کھیڑیاں ول کر دینداا ے۔ کیدو دا پاتر دوواں شاعراں کول برائی تے شیطانی دا سمبل اے پر وارث شاہ ہوراں کول ایہہ پاترا ینا تگڑاا ے کہ ایس پاترنے اپنے ورگے کئی بندے اپنے حمایتی بنا لئے نیں جیہڑے کیدو دے مرن مگروں وی اوہدی شیطانی ریت دیاں لیہاں تے ٹررہے نیں۔

لڈن:۔

لڈن دا پاتر دمودر کول ایس حوالے نال بڑا اہم اے کہ لڈن نوں دمودر نے ماڑی تے بھکھ مردی لوکائی دا نمائندہ بنا کے پیش کیتا اے، جیہناں دی نہ کوئی زمین تے نہ جائیداد ہوندی اے ایہدے توں ودھ ایہہ کہ اوہناں دی اپنی مرضی وی کوئی نہیں ہوندی تے ہر ویلے اتلے میل دی من مرضی نال چلنا ای اوہناں دی حیاتی دا مقصد ہوندا اے کیوں جے اوہ ماڑے جو ہوندے نیں۔ دمودر نے لڈن دے پاتر دا تعارف انج کروایا اے جیہدے وچ ایہہ گل صاف دسدی اے کہ ایہہ طبقہ وچارا ہر ویلے سدیاں تے ٹردا رہندا اے۔

لڈن ناؤں ملاں دا نینگر، دوروں سدانایا (30)

دمودر موجب لڈن دے نورے راٹھ دی بیڑی وچ وڑن پاروں اوہنوں نورے کولوں مار پیندی اے تے اوہ غصے وچ آ کے اوہدی بیڑی کھول لیاوندا اے پر ایتھے وی اوہدی بے وسی ویکھن والی اے کہ اوہ ہن جائے کتھے؟ اخیر ہیر اوہدا ایہہ مسئلہ حل کردی اے تے بیڑی اپنے کول رکھ لیندی اے۔ نورا دھاڑ کردا اے تے ہیر سہیلیاں نال اوہناں نوں بھاج دیندی اے۔ ایتھے ہیر لڈن تے نورے نوں اپنا جاگیردارنہ ٹل وکھایا اے۔ اصل وچ سولہویں صدی تیکر انسانی شعور ایتھوں تیکر اں اپڑیا سی کہ اک دے ظلماں توں اک کے دوجے دی پنجالی گل گھت لوو۔ ایہو کجھ لڈن نال ہوندا اے۔ اوہ اک جاگیردار کولوں نس کے دوجے دی چھاں ہیٹھ آ جاندا اے۔ پر جدوں ہیر نوں رانجھے نوں بیڑی وچ واڑن پاروں لڈن تے غصہ آوندا اے تاں اوہ وی لڈن نال نورے والا سلوک کردی اے یعنی ماڑا ہر پاسے ماریا جاندا اے۔

دمودر دا لڈن نرم دل وی اے جتھے رانجھا اوہنوں بیڑی وچ سون دی اجازت منگدا اے تاں پہلاں لڈن نہیں مندا پر رانجھے دے ناراض ہو جان تے اوہدا دل نرم پے جاندا اے تے اوہ اوہدے لئی ہیر دی مار تے غصہ جھلن لئی وی تیار ہو جاندا اے۔ دمودر لکھدا اے۔

لڈن دھا چلیا پل پچھوں، تاں پھڑ کھچڑ چایا
جے میں مویا تاں صدقے کیتا، کم رنجھیٹے دے آیا
وار بڈھے دی ہن مروینداِ، جے توں ٹرسدھایا
آکھ دمودر دھیدوتائیں، آن کے پلنگ سوایا (31)

دمودر نے اکبری شے دے جاگیردارانہ وسیب وچ کمی دی حیثیت نوں بیان کیتا اے پر دوجے پاسے وارث شاہ دا لڈن بڑا چاتر، رشوت خور تے جاگیردار دا کمی ہو کے وی جاگیردارانہ سرمایہ دارانہ سوچ والا پاتر اے۔ اوہ بڑا پتھر دل اے جیہڑا رانجھے دے ترلیاں منتاں تے وی کن نہیں دھردا تے اوہنوں جواب ایہہ دیندا اے۔

پیسہ کھول کے ہتھ جے دھریں میرے گودی چائے کے پارا تارناں ہاں
اتے ڈھیکیا مفت جے کن کھائیں چابیڑیوں زمیں تے مارنا ہاں
جیہڑا کپڑا دئے تے نقد مینوں سبھو اوس دے کم سوارناں ہاں
زوراوری جے بیڑے تے آن چڑھے اوہ واٹڑے ڈوب کے مارناہاں (32)

وارث شاہ ہوراں دے لڈن دی ایس سوچ دی وجہ پکی گل اے اٹھارویں صدی دے سیاسی سماجی حالات سن جیہناں پاروں بندیائی

وچوں بندا لاگ دا مک جانا صاف پیا دسدا اے۔ وارث دا لڈن اٹھارویں صدی وچ بیٹھا اے جتھے بے وساہی اتناں دی اے نہیں پتہ دھاڑویاں کس ویلے آپینا اے جاں اوہناں دی غیر موجودگی وچ بنے چنے دے بھرا واں آن گل وڈھنے نیں۔ بلھے شاہ ہوراں تے ایس بے وساہی نوں ماں نوں دھی دے لُٹ کھڑن تیکر بیانیا اے تے اوہ تے لڈن اے جیہد ا رانجھے نال رشتہ وی کوئی نہیں ایس لئی اوہ کیوں رانجھے جیہے ماڑے بندے نوں، جیہدے کول دھیلا وی نہیں، بیڑی وچ واڑے پر جدوں اوہدا اپنا خسارہ رناں دے رانجھے نال کھسکن دا ڈر بیندا اے تاں اوہ ویکھدا اے۔

رناں لڈن جھبیل دیاں بھرن مٹھیں پیر دویاں دی ہِک ٹکا بیٹھا

غصہ کھائیکے لئے جھبیل جھمیاں اتے دونہاں نوں ہاک ملا بیٹھا (33)

تے اخیر لڈن اپنیاں زنانیاں دے ہتھوں جان دے ڈر توں بے وس ہو جاندا اے وارث لکھدے نیں۔

دوہاں بانہاں توں پکڑ رنجھیٹڑے نوں مڑ آن بیڑی وچ واڑیانیں

تقصیر معاف کرآدمی دی مڑ آن بہشت وچ واڑیانیں (34)

دمودر دا لڈن اک پرامن وسیب وچوں جنمیا پاتر اے اوہدے وچ ماڑا تے کی ہون دی کمزوری تے موجود اے پر اوہدے وچ انسانیت سگوں موجود اے جیہڑا اک انجان دے رس جان پاروں اوہدی منگ آپ مارکھا کے وی پوری کر دیندا اے۔ پر وارث دا لڈن اٹھارویں صدی دے بے وساہی دے گھمن گھیر اندر پھسیا انسان جیہدے وچوں حالات دی بے وساہی دھاڑویاں دی لٹ مار تے جبر تے اپنیاں دے جانوں مارن دے خوف نے اوہدے وچوں انسانی قدراں دا جنازہ کڈھ چھڈیا اوہ تے مارتے بیٹھا اے، اپنے گھاٹے دا سودا اوہنوں اکا گوارہ نہیں۔ دوویں پاترا پنے اپنے وسیب دی بھرویں نمائندگی کردے نیں۔

چوچک:۔

چوچک، ہیر دا باپ دمودر تے ورث شاہ ہوراں کول اکو جیہے جاگیرداری نظام دا خودغرض تے فائدے دا پتر پاتر اے۔ دمودر ہیر دے جمن توں کجھ چر مگروں ای ہیر نوں اپنے فائدے لئی ورتنا چاہندا اے جیویں جاگیر دار اپنیاں جاگیراں ودھان لئی دھیاں دے ساک اپنے توں وڈے جاگیرداراں ول کردے نیں۔ دمودر دا چوچک وڈی ہوندی ہیر نوں ویکھ کے ایہہ پسار پسار رہیا اے تے اخیر تے اوہدی نظر ہیر نوں اکبر بادشاہ نوں دے کے وڈے فائیدیاں تے اے۔ دمودر لکھدا اے۔

بھائی بابے متا پکایا، ہیر کڑی کہیں ڈیہاں

کہے تاں دیجے توڑ پٹھاناں، سندھوں پار چڑیہاں

کہے دوبہاں اکبر غازی، کچھاں آپ کچھیہاں (35)

وارث شاہ ہوراں دے چوچک کول انج دی کوئی سوچ نہیں پر اپنے فائدے لئی اوہ ہیر دی وکالت اگے اپنی سیانف نوں وی کنڈ پچھے رکھ دیندا اے تے ایہہ جاندیاں وی کہ کڑی منڈے تے ریجھ گئی اے تے اگے کیہ ہونا اے، اکھاں میٹ کے رانجھے نوں چاک رکھ لیندا اے۔

باپ ہس کے پچھدا کون ہوندا، ایہہ منڈرا کت سرکار دا اے

ہتھ لائیاں پنڈے تے داغ پوندا ایہہ مہیں دے نہیں درکار دا اے (36)

پر فیر اپنی لوڑ ہتھوں مجبور ہو کے ہیر دے سر احسان کر رہیا اے۔

تیرا آکھنا اساں منظور کیتا مہیں دے سنبھال کے ساریاں نی (37)

دمودر دا چوچک جدوں بیلے وچ رانجھے ہیر نوں اکٹھیاں ویکھدا اے، رانجھے نوں ماردا وی اے تے چاکری توں وی جواب دے دیندا اے۔ پر جدوں رانجھا ٹردا اے تے ساریاں مجھاں وی رانجھے دے مگر ٹر دیاں نیں تے فیر چوچک نوں رانجھے دی ہیر نال موجاں کرن والی گل بھل جاندی اے تے فائدے والی گل اکھاں اگے چڑھ کھلوندی اے فیر اوہ رانجھے نوں انج منتاں ترلیاں نال منا ندا اے۔

آکھے خان توں تاں ہی رٹھا جے میں سٹاں لائیاں
جے خان پٹھان اساڈا، نال برابر بھائیاں
جے باپ سزا دتی بیٹے نوں کے کیہ لیہسن سائیاں
آکھ دمودر ایوں کر مجھیں ،چوچک خان بھرائیاں (38)

ایہہ گھٹیا تے اپنے فائدے دی سوچ ای پندرھویں صدی دے جاگیر دار وی جیہنوں اپنا نکا جیہا نقصان اپنی دھی دی قیمت تے جرنا وارہ نہیں کھاندا پر اٹھارویں صدی دا جاگیر دار جے ایہہ آکھے تاں ایڈی انوکھی گل وی کوئی نہیں وارث لکھدے نیں۔

چوچک آکھیا جامنا اوسنوں ویاہ تیک تاں مہیں چرا لیئے
جدوں ہیر ڈولی پاتر توردیئے رس پوے جواب تاں چا دیئے
ساڈی دھی دا کجھ نہ لاہ لیندا سبھا ٹہل ٹکور کرا لیئے
وارث شاہ اسیں جٹ سدا کھوٹے جٹکا فندا ایتھے بک لا لیئے (39)

دمودر تے وارث دے چوچک دی سوچ خالص جاگیر دارانہ تے اپنے فائدے دی سوچ اے جیہڑی ڈھڈ دیاں جمیاں نوں وی اپنے فائدیاں تے قربان کر دیندی اے جے دھی اجیہے بندے نوں پسند کر لوے جیہدے توں کوئی فائدہ نہیں تاں اوہنوں جھوٹھی انا خاطر جانوں وی ماریا جا سکدا اے پر جے فائدہ دین جوگا ہووے تاں اوہناں نوں اک دوجے وچ مصروف ویکھ کے وی اکھاں میٹ لوو۔ کجھ مصلحت پسند ایہہ وی اکھدے نیں کہ چوچک عشق نوں ہیر رانجھے دا فطری تقاضا سمجھ کے برداشت کر جاندا اے۔ دمودر تے وارث شاہ دے چوچک نوں کھ رکھ کے ایہہ گل آکھنا چٹے جھوٹھ وانگوں اے کیوں جے اوہ فطری تقاضا ویکھن تاں اوہناں دا ویاہ کر دیناوی تاں فطری تقاضہ اے۔ اوہ تاں نہیں ہوسکیا اوہناں کولوں سوا ایہہ فطری تقاضا نہیں سگوں رتبے دے حصول دی نفسیات اے کہ وڈے بندیاں نال دھیاں ویاہ کے اوہناں دی ساکا چاری نال اپنے آپ نوں مضبوط کرنا۔ ایہہ کمینگی جاگیر داری وسیب وچ کل وی موجود سی تے اج وی اے۔ پر حقی گل ایہہ وے کہ سرمایہ داری نظام دی وی انجے لوڑ بن گئی اے جاگیر داری وچ ایس توں سانگیاں دی مضبوطی دا کم کر لیا جاندا سی تے ہن کاروباری سہان اسارندا۔ بھاویں وسیب جاگیر داراں توں سرمایہ داری ول ودھ رہیا اے پر اتلے میل دی ایہہ لوڑ اکو جیہی اے۔

ملکی:۔

ملکی دا پاتر وارث ہوراں کول تے کندی دا دمودر کول ہیر دی ماں اے۔ پر ایس پاتر دی سوچ دوواں شاعراں کول وکھ وکھ

اے۔ دمودر کول کندی دا پاتر چوکھا متحرک ہے اے تے اک پنجابی سیانی ماں دا پاتر اے جو اپنی دھی ہیر نال ہر ڈھنگ نال چلن دا چارہ کردی اے کدے اوہدے عیب چھپاندی اے تے کدیں اوہنوں غصے نال سمجھاندی اے، کدھرے بھراواں دا ڈراوا دیندی اے۔

سن نی ہیرے گُنی گہیرے ! تدھ بھلیری جائی
گھرگھر گلّی تہاڈی ہیرے سن سن سکے بھائی
جے مرجاوے چاک کویہیں ،اساں اوندھی آئی
نِج آوندا کدوں آیا، لگیں کانی کائی (40)

پر جدوں ہیر دا پیو چوچک اوہدے کولوں ہیر رانجھے دے میل بارے پچھدا اے تاں اوہ سارا کجھ جاندیاں وی گل انج کردی اے جیویں اوہنوں کسے گل دا وی نہیں پتہ اوہدی ایس چالاکی نوں دمودر انج بیان کردا اے۔

مہری آن وڑی پھر اندر، ہس کرخان بلایا
کیوں دلگیر اتے چپ چپاتا، توں کیوں اندر آیا
کیہا غم گھدو ای خاناں! کیہ تدھ کسے دکھایا؟
آکھ دمودر خان چوچک تھوں مہری انج پچھایا (41)

جدوں چوچک ہیر رانجھے نوں کیدو نال جا کے آپ ویکھ کے گھر آوندا اے تے کندی ہیر دے عیب تے انج پردہ پاندی اے۔

منت کڑیاں خضردی آہی پاء پاء گھیو پایو نیں
ایہہ چوری میں ہی کٹ دتی، ایتوار ڈٹھو نیں (42)

دمودر کول کندی دا پاتر خاندان دی عزت تے دھی دے پیار وچ ونڈیا ہویا اے۔ ایس لئی اوہ اخیر تے کھیڑیاں دی ڈولی پین لئی وی ہیر دے ترلے کردی اے کیوں جے اوہنوں اپنے خاندان دی عزت پیاری اے تے ترلے ایس لئی کر رہی کہ کدھرے ایہدی ضد پاروں پیو بھرا ایہنوں مار ای نہ دین، ایس لئی دمودر نے کندی راہیں ہیر دی ماں دی نفسیات نوں سوہنے ڈھنگ نال بیانیا اے۔

دوجے پاسے وارث شاہ ہوراں کول ملکی دا پاتر ہیر دی ماں دا اے۔ اوہ اک سطح تے سیانی ماں دا پاتر نہیں اوہنوں جتھے ہیر دے رانجھے نال بیلے وچ ملن دا پتہ لگدا اے تاں چپ کر کے سیانف نال ہیر نوں اندروڑ کے سمجھان دی تھاں انج رولا پا دیندی اے۔

ملکی آکھدی سدتوں ہیرتائیں جھب ہوتوں اولیا نائیاوے
کھیڈن گئی منہ سوہجلے گھروں نکلی نماں شام ہوئی نہیں آئیاوے
الفو موچیا موجماں واگیا وے دھدھی ماچھیا بھج توں بھائیاوے
وارث شاہ ماہی ہیر نہیں آئی موہرا منگواندی گھریں آئیاوے (43)

تے ہیر نوں وی آوندیاں ای اندرواڑ کے نہیں سمجھاندی سگوں اوہنوں ایس ایس ذات دیاں گاہلاں کڈھدی اے جیہڑیاں کسے سنیاں نہ ہون کجھ ونگی انج اے۔

یرولیے گولیے بے حیائے کنڈوٹیے تے گل پھریئے نی
ادھلاگیے ٹوٹنیں تت کرمئیں نی چھل چھدریئے چھاپے چھریئے نی
ساہناں نال رہیں دینہہ رات کھیندی آٹلیں نی کتیے وہڑیئے نی
اج رات تینوں مجھو واہ ڈوباں تیری ساعت آوندی تھریئے نی (44)

فیر چوچک دے پوٹے تے لگ کے اوسے رانجھے نوں جیہنوں چاکری توں پہلاں جواب دتا جدوں اوہدے باجھوں مجھاں نہ چگیاں تاں انج فقے کٹنی بن کے رانجھے نوں گھر آ کے ہیر مانن داانج آکھدی اے۔

ملکی آکھدی لڑیوں جے نال چوچک کوئی سخن نہ جیوتے لیاوناایں
کیہا ماپیاں پتراں لڑن ہوندا تساں کھٹناں تے اساں کھاونا ایں
توئیں چوئیکے ودھ جماوناں ای تو ہیں ہیردا پلنگ وچھاوناں ایں
کڑی کل دی تیرے توں رس پئی توہیں اوس نوں آمناوناں ایں
منگوماں سیال تے ہیر تیری نالے گھورناں تے نالے کھاوناں ایں (45)

وارث شاہ دی ملکی ایس حوالے نال ایہہ سارا کجھ کردی اوبھڑنہیں لگدی کیوں جے اوہدا مالک چوچک وی تے انج ای کردااے۔ تے ملکی انج کردی اے تاں وکھ کیہ اے وجہ فیر اوہی اٹھارویں صدی دی سیاسی سماجی صورتحال والی اے جتھے بلھے شاہ آکھدے نیں کہ آپو دھاپی وچ دھی ماں نوں لٹ کے لے گئی تے جے ملکی اپنے گھر دے مفاد خاطر انج کردی اے تاں کجھ اچرج نہیں کیوں جے اوہ وی اٹھارویں صدی دے جاگیردار چوچک لوبھی دی گھر والی ملکی لوبھن اے۔

ایہناں پاتراں توں وکھ دمودر کول وارث شاہ ہوراں توں کجھ وکھرے پاتروی نیں جیہناں دی ہیر لکھدیاں وارث شاہ ہوراں لوڑ ای نہ سمجھی تے اوہناں نوں اپنی داستان دا حصہ نہ بنایا۔ اوہناں وچوں اک تے نورے دا پاتر اے جیہڑا ہیر دے پیو وانگوں اک تگڑا راٹھ اے اوہدی اک تھاویں دمودر ہیر نال لڑائی کروا کے ہیر تے اوہدیاں سہلیاں دے ہتھوں چنگی مٹی پلیت کرواندا نے دوجا وکھرا پاتر 'ہسی' دا اے جیہڑی ہیر دی سہیلی اے تے ہیر دے نال ہوندی اے سوائے ہیر دے رنگ پور ویاہے جان دے۔ اوہ ہیر دا کھیڑیاں ول ویاہ ہوجان مگروں رانجھے نال تعلق وی بنانا چاہندی اے پر رانجھا اگے نہیں ودھدا۔ تیجا کھیڑواں پاتر رامو باہمن دا اے جیہڑا ہیر دا ویاہ کھیڑیاں ول ہوجان مگروں تخت ہزارے پرت گئے رانجھے نوں سہتی دے سنیہے تے واپس لے کے آوندا اے پہلاں تاں انج لگدا اے جیویں رامو باہمن نال سہتی دا چکر اے پر مگروں پتہ لگدا اے کہ انج دی کوئی گل نہیں سی۔ ایتھے اسیں داستان ہیر رانجھا دے شاعراں دمودر تے وارث شاہ دے اوہناں پاتراں دا ای جائزہ لیا اے، جیہڑے دوواں کول موجود سن۔ انج داستان وچ کئی ذیلی پاتر جیہے نیں جیہڑے وارث شاہ کول وڈی ادبی تے ثقافتی امیری نال آئے نیں جیویں بالناتھ دا پاتر، پر دمودر نے سدھ بگائی نوں سرسری جیہا ای وکھایا اے۔ اسیں ایتھے انج دے پاتراں نوں زیر بحث نہیں لیاندا کیوں جو ایسے باب وچ آگے جا ک وارث شاہ نال ملدے احمد تے مقبل دے پاتراں دے ضمن وچ گل کراں گے۔ انج وی اساڈی بحث دا مہاڑ ایہہ ای اے کہ ایہناں شاعراں نے پاتراں نوں کیویں بیانیا اے نہ کہ ایہناں کول ضمنی پاتراں دی موجودگی نہ ہون

دے کارن گنواناا ے۔

مکدی گل ایہہ اے کہ دمودر دے پاتراں دا جدوں وارث شاہ ہوراں دے پاتراں نال ٹکراواں تول کریے تے دمودر نوں ایہہ آدر تے دینا پیندا اے کہ اوہ پہلا ہیر رانجھے دی داستان دا پنجابی قصہ کار اے تے اوس قصہ بہت سوہنا لکھیا اے پر جدوں اسیں وارث شاہ ہوراں دے پاتراں نال اوہدا ٹکرواں تول کردے آں تے فیر سانوں اوہی وارث شاہ دا عظیم اسلوب منّنا پیندا اے۔ وارث شاہ ہوراں دے سارے پاترا پنی اپنی تھاں تے اپنے بھرویں تے ٹل والے نیں کہ دمودے پاترا پنی تھاں پکے پیریں ہوندیاں وی وارث شاہ ہوراں دے پاتراں دا مقابلہ نہیں کردے۔ دمودر دے پاتراں وچ جھولاں دی نیں تے ہسادین والیاں گلاں وی پر وارث کول سوجھ سیانف انتاں دی اے اوہ اپنے پاتراں کولوں اوہ اوہ کم لے گیا اے جیہڑے اٹھارویں صدی دی نفسیات مطابق نیں، وارث شاہ ہوراں اپنے پاتراں راہیں اوہ بغاوتاں کرائیاں نیں جیہڑیاں بہت سارے جیوندی جان والے وی چاہندیاں نہ کر سکے۔

مکدی گل ایہہ اے کہ دوواں فنکاراں وچ شمے دا فرق جیہڑا اے اوہ اوہناں دی پاتراساری وچ مڈھلا کردار ادا کردا اے۔ ادب عالیہ دا اک گن ایہہ وی ہوندا اے کہ فنکار کول انسانی روپ نوں سمجھن دی صلاحیت کنی اے تے ایس پکھوں دوویں فنکار مان یوگ نیں، وارث شاہ اصل وچ پنجابی وسیب نوں جنی ڈونگھیائی نال ویکھیا اے اوہدے ساویں گھٹ ای فنکار کھلوسکدے نیں۔ اوہ وسیب تے جی دے اندروں لنگھ جاندا اے اوہدے ایہناں گناں دے باوجود وارث شاہ ورگے عظیم کلاکار حادثاتی طور تے پیدا نہیں ہوندے سگوں اوہدے پچھے کنے ای دمودر لگے ہوندے نیں۔

احمد گجر تے وارث شاہ:۔

قصہ ہیر دے مڈھلے رچنہاراں وچوں احمد گجر دی تھاں بہوں اچیری اے۔ احمد گجر توں پہلاں پنجابی وچ دمودر ہیر دا قصہ لکھ چکا سی پر احمد دا کمال ایہہ اے کہ اوہ دمودر دے پچھے اکھاں میٹ کے نہیں ٹریا سگوں کئی حوالیاں نال وکھریویاں دی اجیہی بنیاد رکھی کہ ہولی ہولی دمودر دا قصہ آون والے کویاں لئی اپنی اہمیت قائم نہ رکھ سکیا تے دمودر توں مگروں آون والیاں شاعراں اوہدی تھاویں احمد دے قصے نوں ای بنیاد من لیا جیہدیاں بھرویاں مثالاں مقبل تے وارث شاہ ورگے کویاں دے روپ وچ دتیاں جاسکدیاں نیں۔ احمد نے وی دمودر دا قصہ پڑھیا ضرور پر اپنی پیڑ وکھری بنائی۔ احمد نے پہلی واری فارسی دی مشہور صنف مثنوی نوں مکھ رکھ کے ایہہ قصہ بیتاں دی شکل وچ لکھیا۔

احمد نے ایس قصے وچ اوہ بدلا لیاندے جیہناں نوں مکھ رکھ کے احمد نوں قصہ ہیر دے نویں مکتبہ فکر دا بانی آکھنا پیندا اے۔ پنجابی قصہ کاری وچ جیہڑی تھاں مرزا صاحباں وچ پیلو نے ملی اوہی تھاں قصہ ہیر دے شاعراں وچوں احمد کول اے۔ احمد نے ایس قصے وچ بناوٹی گلاں تے ودھیکیاں نوں کڈھ کے اپنے خیالاں دا مرکز عوامی جیون نوں بنایا تے حقیقت پسندی دی بنیاد رکھی۔ اوہنے مجاز توں حقیقت ول سفر کر کے قصہ ادب نوں نویں حیاتی، نواں روپ تے نواں ڈھنگ بخشیا۔

جتھوں تیکر احمد توں مگروں قصہ ہیر لکھن والے شاعراں دا تعلق اے تے اوہناں وچوں مقبل تے وارث شاہ ہوراں دے ناں سرکڈھویں نیں۔ وارث شاہ ہوراں دی ہیر پڑھ کے احمد نوں پڑھیے تے ایہہ گل بغیر کسے شک شبے دے آکھی جاسکدی اے کہ وارث شاہ ہوراں پلاٹ تے پاتر سارے دے سارے احمد کولوں لئے نیں۔ احمد تے وارث دے پاتراں وچوں سوائے وارث دے بالناتھ دے اک وی

پاتروارث شاہ ہوراں کول نواں نہیں۔ احمد نے بالنا تھ دی تھاں رانجھے نوں بال گوسائیں کولوں جوگ دوایا اے۔ وارث کول باقی سارا کجھ احمد دی دین اے پر وارث نے احمد دے دتے ہیر دے سچے وچ رنگ اپنی مرضی نال بھرے تے زبان بیان دی شیرینی نال قصے نوں اپنے لیکھے پالیا۔ وارث تے مقبل دے جتھوں تیکر احمد کولوں متاثر ہون دا تعلق اے ایہناں دوواں شاعراں کول احمد دے مصرعیاں دے مصرعیاں نکے موٹے وادھے گھاٹے نال اپنی پوری شکل وچ موجود نیں۔ انج لگدا اے جے ہیر لکھن شمے احمد دی ہیر ایہناں دوواں شاعراں تیکر اپڑ چکی سی۔ ہن اسیں احمد تے وارث شاہ دے پاتراں دا ٹاکرا واں تول کردے آں۔

احمد دے لکھے قصہ ہیر نوں پڑھدیاں جس گل دی گھاٹ وکھائی دیندی اے اوہ اوہدی پاترا ساری اے احمد نے جنا دھیان قصہ ہیر دی کہانی ول دتا اے اونا دھیان اوہ اپنے پاتراں ول نہیں دے سکیا۔ ایسے لئی اوہدے پاتر ہن تے وارث شاہ والے پر اوہ وارث شاہ دے پاتراں وانگوں نہ تے تگڑے نیں تے نہ ای اگھڑ کے ساہمنے آوندے نیں۔

رانجھا:۔

وارث شاہ ہوراں دا رانجھا ایک لیجنڈا پاتر دا روپ وٹا گیا اے اوہدی وجہ وارث نے رانجھے نوں لوکائی دی نفسیات نوں مکھ رکھ کے حالات دی اجیہی بھٹھی وچوں لنگھایا کہ اوہدا روپ امر تے ہر من پیارا ہو گیا۔ جدکہ احمد نے ایس پاتر نوں قصے وچ وارث وانگوں حالات وسیب تے اداریاں دے جبر تے ظلم نوں انج مکھ نہیں رکھیا جیویں وارث شاہ ہوراں رکھیا۔ احمد دی ہیر وچ اوس نہ تے رانجھے دا رنگ روپ اساریا اے نہ اوہدے مڈھلے حالات بارے کوئی جانکاری دتی اے تے نہ ای کجھ ہور دسیا اے سگوں اوہ قصہ شروع ای بھراواں دی زمین دی کانی ونڈ توں کردا اے جیہدے نال ایہہ پاتر مڈھ وچ ای نامکمل تے ادھورا لگدا اے۔ احمد لکھن مگروں رانجھے دا تعارف انج کردا اے۔

ویرنال بھائیاں زمیں ونڈ دتی جتھے اگیا سی اک تے گھاہ میاں
رانجھے کہی پکڑی ہتھیں پئے چھالے نہ سی جان دا کھیت دا راہ میاں
کیہی سٹ رانجھا چھاویں جابیٹھا بھابھی آکھیا لے روٹی کھامیاں
اسیں روٹی کسے دی نہیں کھاندے جی، موڑ اپنے گھر لے جامیاں (46)

جدکہ وارث شاہ ہوراں تخت ہزارہ وسایا اے جتھے رانجھیاں رنگ مچایا اے فیر موجو چودھری دا پاتر اساریا اے فیر اوہدے جیا جنت نوں وکھا کے اخیر تے آکھیا اے۔

وارث شاہ ایہہ قدرتاں رب دیاں نیں دھیدو نال اوس بہت پیار آہا (47)

وارث موجب رانجھے دا باپ مردا اے تے بھرا، بھابیاں رانجھے نال کجھ نہ کرن پاروں خار کھاندے نیں تے اخیر کانی ونڈا راہیں قاضی نوں رشوت دے کے رانجھے نوں بنجر زمین دیندے نیں۔

وارث لکھدے نیں۔

حضرت قاضی تے پینچ سدا سارے بھائیاں زمیں نوں کچھ پوایا اے
وڈھی دے کے بھوئیں دے بنے وارث بنجر زمین رنجھیٹے نوں آیا اے (48)

وارث رانجھے دا بھابیاں نال اجیہا انٹریکشن (تفاعل) کراندا اے جتھوں رانجھے دا پنڈوں نکلن دا جواز جمدا اے جد کہ احمد رانجھے دی پاترا ساری وچ چوکھی کالھی وکھاندا اے تے اگے توں اگے ٹریا لگا جاندا اے۔ احمد صرف اکو تھاں بھابھیاں کولوں اک دو مہینے دوا کے رانجھے نوں پنڈ چھڈوا دیندا اے۔ وارث نے قصے وچ تجسس پیدا کرن لئی ہیر دے پاتر دا مہناوی رانجھے نوں بھابھیاں کولوں مروا کے قصے نوں ہور دلچسپ بنا دتا اے جد کہ احمد دے رانجھے کول صرف زمین دی کانی ونڈ دے جواز پاروں رانجھے نوں پنڈ چھڈنا پیندا اے۔

رانجھے دے پنڈ چھڈن مگروں وارث شاہ ہوریں مذہب دے ادارے دے علمبردار مولوی نال اوہدا ٹاکرا کرا کے ایس دیاں بھیڑیاں کرتوتاں دا پول بڑی سیانف نال کھولدے نیں۔

باس حلویاں دی خبر مردیاں دی نال دعائیں دے جیوندے ماردے ہو
انھیں کوڑھیاں لوہلیاں وانگ بیٹھے قرعہ مرن جہان دا دھاردے ہو
شرع چا سرپوش بنایا جے روا داروڑے گنہگار دے ہو
وارث شاہ مسافراں آیاں نوں چلو چل ہی پئے پکاردے ہو (49)

وارث شاہ ہوراں ملاں دا پاتر لیا احمد کولوں ای اے پر اپنے عظیم اسلوب پاروں ایس پاترنوں وی کمال اساریا اے احمد کول ایہہ پاتر صرف اینا اے۔

جدوں وچ مشیت دے جائے وڑیا اگے ملاں سی پڑھدے نماز میاں
ملاں پچھیا بھائیا توں کون ہندا ایں رانجھے مول نہ دتا جواب میاں (50)

انج ای لڈن دا پاتر وی اک جھاکی دے کے الوپ ہو جاندا اے پر وارث نے لڈن نوں جاگیرداری سماج دا بڑا اہم پاتر بنا کے پیش کیتا اے۔ جیہڑا رانجھے جیہے غریب الوطن مسافر تے کوئی ترس نہیں کھاندا پر احمد دا لڈن اوہنوں دریا آسانی نال پار کرا دیندا اے۔ رانجھے دا ہیر دے پلنگ تے سونا، ہیر نوں پتہ لگنا، لڈن نوں مارنا' فیر رانجھے نوں مارن لئی ودھنا تے پیار ہو جانا ایہہ دوواں کویاں کول سانجھا اے پر احمد ایس صورت حال نوں انج بیاندا اے۔

ہتھ پکڑ سوٹا متھے گھت تیوڑی کر کے ہیر چلی مارو مار میاں
آکے پلنگ اساڈے تے کون ستا سانوں اٹھ کے دے دیدار میاں
گئی مارنے نوں اوتھے آپ موئی رانجھا شیر تے ہیر شکار میاں (51)

پر وارث شاہ ہوراں کول ایہہ صورتحال انج اے

کوکے مارہی مار تے پکڑ جھمک پری آدمی تے قہروان ہوئی
رانجھے اٹھ کے آکھیا واہ سجن ہیر ہس کے تے مہربان ہوئی (52)

احمد کول رانجھے دے چاک بنن وچ ہیر دی کوئی سیانف نہیں اوہ تے ایسے پہلی ملاقات تے پچھدی اے کہ توں کون ایں تے احمد دا رانجھا آکھدا اے۔

ہیر پچھیا توں کجھ جاندا ہیں رانجھے آکھیا مہیں داپاں میاں (53)

پروارث شاہ ہوراں دا رانجھا ایس صورت حال وچ آپ چاک نہیں بندا سگوں ہیر اوہنوں چاک بنن تے مجبور کردی اے تے ایہدے پچھے وارث نے اک پکا جواز بنایا اے ہیر تے رانجھے دے بیلے وچ میل دا۔ احمد دا رانجھا بالنا تھ تے سہتی نال مکالمیاں وچ ای اگھڑ کے ساہمنے آوندا اے تے ایہناں دوواں صورتاں وچ وارث دے رانجھے دے تل دا اے پروارث شاہ ہوراں ایہناں دوواں صورتاں وچ وی اپنی مہا استادی وکھاندیاں اپنے رانجھے نوں بنا شنگھار کے اکھراں دے ون سونے بانے پوا کے اپنا رانجھا دوجیاں توں سوہنا بنالیا جد کہ احمد کول رانجھے دا پاتر روایتی جیہا کمزور تے عام جیہا اے جیہدے مقابلے وچ وارث دا رانجھا اجیہا جے جیہڑا ساریاں دا سانجھا بن جاندا اے۔

ہیر:۔

احمد کول ہیر دا پاتر وی رانجھے وانگوں بغیر کسے جان پچھان تے تعارف دے ساہمنے آوندا اے ایس لئی لازمی گل اے ایہہ پاتر اسار فنکار دی کمزوری دی نشاندہی اے کیوں جے پاتر دی کوئی اٹھان جاں تعارف نہیں ہووے گا تاں پاترنوں اپنی پچھان بنان لئی چوکھا ٹل لانا پئے گا۔ وارث شاہ ہوراں کول اپنے توں پہلے سارے شاعراں وچوں ایہہ گن ای اوہناں نوں عظیم فنکار ثابت کردا اے۔ اوہناں رانجھے تے ہیر دے دوویں پاتر بڑے چجے تلے تے پھباویں ڈھنگ نال اسارے نیں سگوں ہیر تے رانجھے نالوں وی چوکھی محنت کیتی اے تے اوہدی اٹھان اجیہی بنائی اے کہ جیہڑی پورے جگت ساہت وچوں مثال داروپ دھار گئی اے۔ احمد کول ہیر دی پہلی جھاکی لڈن نوں مارن ویلے ساہمنے آوندی اے پر کوئی چڑھت نہیں، قصے دی ہیروئن آئی اے تے اوہنوں اپنا تعارف آپ کرانا پے رہیا اے۔ پر دوجے پاسے وارث نے پہلاں اوہدی سراپا نگاری وچ انتہا کیتی اے تے فیر اوہدے توں پہلا انج دے بول اکھوا کے اوہدی قصے وچ ہیروئن دی حقیقت مسلم کر چھڈی اے۔

جوانی کملی راج ہے چوچکے دا اتے کسے دی کیہ پرواہ مینوں
میں تاں دھروہ کے پلنگ توں چاسٹاں آیا کدھروں ایہہ بادشاہ مینوں (54)

احمد کول ہیر دا پاتر داستان وچ اگے جا کے وی وارث وانگوں نابری نہیں وکھاندا۔ اوہدا کیدو نال متھا وی انج نہیں لگدا جیویں وارث کول لگدا اے۔ احمد وی ہیر کولوں کیدوں نوں مرواندا اے۔ احمد کول ہیر اپنی ماں نوں کھیڑیاں ول ویاہ کرن تے جیہڑا مکالمہ کردی اے اوہدے وچ نابری گھٹ تے شکوہ بہتا اے۔ پر اوہدا پاتر دلیر تے ہٹھ دا پکا اے۔ احمد لکھدا اے۔

مائے نگھر جانے لاگیاں برا کیتا دتھے کھیڑیاں دے پلے دم مائے
میں تے رانجھے دا رب نکاح بدھا جدوں لکھیا سی لوح قلم مائے
تساں ماپیاں میں نال برا کیتا مینوں پچھ کے کیتا نہ کم مائے
اساں جان رانجھیٹے دے پیش کیتی ساڈا کھیڑیاں نوں دے چم مائے (55)

پروارث کھیڑیاں دے نال ساک کرن توں پہلاں ہیر دی ماپیاں تے قاضی نال پوری کھیڈ پواندا اے۔ جواز بناندا اے تے فیر کھیڑیاں ول ساک ہوندا اے۔ قاضی دی دوویں کوی اکو جیہی مٹی پلید کردے نیں، ہیر قاضی دے سوالاں تے فتویاں دے کرڑے جواب دے

کےوارث تے احمد دے قاضی دا مونہہ بند کر دیندی اے۔ احمد کول ہیر دا ویاہ ہو جاندا اے تے فیر رانجھے نال رابطہ خط راہیں ہوندا اے۔ خط وچ دوویں ہیر تے رانجھا اپنے پچھلے لنگھے چنگے ویلے یاد کر دے نیں فیر رانجھے دے اندر آپ ای جوگی بنن دی مت جاگدی اے۔ ہیر دا ایس جوگ لین لئی آکھنا احمد کول نہیں احمد لکھدا اے۔

اوہا چننگ رنجھیٹے نوں فیر جاگی ہوئی چاہاں ہیر پاسے جاونے دی
گجھی گل جوجیا وچ دے نہیں کسے نوں آکھ سناونے دی
آکھ احمد ا درد نے گھیرلیا پئی مصلت کن پڑوانے وی (56)

پر وارث دی ہیر آپ رانجھے نوں جوگی بنن ولوں آکھدی اے تے رنگ پور سددی اے۔

تینوں حال دی گل میں لکھ گھلاں ترت ہو فقیر تیں آنوناں ایں
کسے جوگی تھے جائیکے بنے چیلا سواہ لائیکے کن پڑواناں ایں
سبھاذات صفات برباد کرکے اتے ٹھیک تیں سیس مناوناایں
توہیں جیوندا دیدنادئیں سانوں اساں وقت نہ جیوندیاں آوناایں (57)

احمد کول ہیر دے جوگی بنن لئی نہ آکھن پاروں رانجھا جدوں جوگی بن کے ہیر دے گھر منگن جاندا اے تاں ہیر اوہنوں پچھاندی نہیں تے لمے مکالمیاں مگروں ہیر نوں پتہ لگدا اے کہ ایہہ رانجھا اے، پر وارث دی ہیر نے کیوں جے اوہنوں آپ جوگی بنن لئی آکھیا اے ایس لئی اوہ چھیتی پچھان جاندی اے کہ ایہہ رانجھا ای اے۔ وارث نے احمد دی ایس کمزوری نوں مکھ رکھ کے رانجھے نوں ہیر ولوں جوگی بنن لئی رانجھے نوں اکھوایا تاں جے اگلی صورت حال وچ دوویں رل کے کجھ کر سکن، سہتی دا پاتر دوواں کویاں کول اکو جیہا ترکھا تے چاترا اے۔ وارث وی احمد وانگوں چوکھے مکالمے سہتی تے رانجھے دے کروا کے قصے نوں انت ول کھڑدا اے۔

دمودر نالوں احمد دی وڈیائی ایہہ وی اے کہ دمودر نے قصے دا انت سکھانت (comic) رکھیا اے جد کہ احمد نے ایس قصے نوں ٹریجک بنا کے اپنے آپ نوں وڈا فنکار ثابت کیتا اے کیوں جے احمد جاندا سی کہ دنیا بھر دا وڈا ساہت ٹریجک ای اے ایس لئی اوس وی ہیر نوں کسے بیماری پاروں مروا دتا تے رانجھا وی اوہدے مرن دی خبر سن کے مر گیا۔ پر وارث نے قصے دا انت دکھانت ای رکھیا احمد وانگوں پر صورت حال اپنی مرضی دی بنائی۔ اوہنے سیالاں کولوں ہیر نوں دھوکھے نال گھر رکھ کے زہر دوایا تے جاگیر دارانہ سماج دے مکر فریب دے سارے پردے پاڑ دتے تے فیر رانجھے نوں ایہہ خبر سنا کے مروا دتا۔ ایتھوں ثابت ہوندا اے جے وارث کول، تقدیر دا تصور متحرک اے جامد نہیں۔

ہیر دا پاتر احمد کول ہے سگواں تے اپنی آزادی دی جنگ لڑدا ہویا پر اوہدی ہیر پچھے کمانڈ جاں ڈائریکشن کمزور اے۔ احمد کولوں ایہہ پاتر وارث وانگ بھرویں ڈھنگ نال کھڑا نہیں ہو سکیا۔ جیہدی وجہ احمد دا اختصار توں کم لینا اے پر وارث شاہ ہوراں تے انج لگدا اے کہ ایہہ قصہ لکھیا ای۔ ہیر دا پاتر اسارن لئی اے تے ایہہ پاتر اوہناں صدیاں توں وسیبی جبر سہندی سوانی نوں حوصلہ تے زبان دین لئی بڑے بھرویں تے دلیرانہ ڈھنگ نال چتریا اے جیہدے وچ وارث سو فیصد کامیاب رہے نیں۔

کیدو دا پاتر وی احمد کول اک دوجھا کیاں دا پاتر اے۔ اوہ ہیر نوں بیلے وچ رانجھے نال ویکھ کے شکایت لاندا اے۔ ہیر غصے وچ

اوہنوں ماردی اے تے اوہ جوہ چھڈ جاندااے، پر ہیر دا ویاہ کھیڑیاں ول کران دا بی بیج جاندااے جد کہ وارث دا کیدو بڑا تگڑا تے داستان وچ بھرویں ولن دا رروپ اے،اوہ جدوں وی داستان وچ آوندااے ساری توجہ اپنے ول کرلیندااے۔اوہ احساس کمتری دامار یااے تے اخیر اوہ وی ہیر دا کھیڑیاں ول ویاہ کرواکے الوپ ہوجاندااے۔

احمد کول پاترسارے موجودنیں پراوہ سیانے ڈھنگ نال پاتراساری نہیں کرسکیا۔اوہدے کول قصے وچ سوائے سہتی تے رانجھے دے مکالمیاں دے ساری داستان اختصار دا شکاراے۔اوہ پاتراں نوں ساہمنے لیانوںدااے،اک دو جھاکیاں وچ فارغ کر دیندااے پر وارث نے ساریاں توں ودھ سمجھ دا مظاہرہ پاتراساری وچ کیتا اے تے پاتراپنی اپنی نفسیات موجب گل کردے داستان دا رنگ بنھدے لگے جاندے نیں۔وارث نے پاتراں راہیں داستان وچ اجیہے الجھاؤ لیاندے نہیں جیہڑے قصے دی چیٹک وچ اناں دا وادھا کردے نیں تے قصے نوں جاندار تے شاندار بناندے نیں۔وارث نے اپنے سارے پاتر احمد کولوں لئے نیں پر پاتراساری اپنی من مرضی تے قصے دی لوڑ موجب،جیہڑی کہ وارث دے ذہن وچ سی،کیتی تے ایس پڑ وچ احمد نوں کتے پچھے چھڈ گیا۔ایہہ ای فنکاری تے ایہہ ای گن ہوندے نیں جیہڑے کسے فنکار نوں عظیم فنکار دے مرتبے تے اپڑاندے نیں۔

(ج)وارث تے مقبل:۔

مقبل تے وارث شاہ ہوراں دے پاتراں دا ٹکراواں تول کردیاں کجھ گلاں پہلاں کرن دی لوڑ اے کہ مقبل تے وارث شاہ ہوراں دیاں سانجھاں تے وکھرویں کیہ نیں؟ قصہ ہیر دی ریت موجب مقبل توں پہلاں دمودر تے احمد گجر قصہ ہیر لکھ چکے سن۔دمودر اوہ پہلا کوی اے جیہنے ایہہ قصہ لکھیا۔ہن تیکر دی تحقیق موجب اوہدے ساہویں انج دا کوئی نمونہ نہیں جیہنوں مکھ رکھ کے اوہ اپنا قصہ لکھدا۔ایس لئی اوس اپنی سمجھ بوجھ تے عقل موجب ایہہ قصہ الیکیا پر دوجی تھاویں احمد گجر نے قصہ ہیر لکھیا تے ہیر دمودر اوہدے ساہمنے سی پر اوس وی دمودر دے رچے قصے نوں اکھاں میٹ کے نقل نہیں کیتا سگوں اپنی من مرضی تے سمجھ بوجھ موجب قصے وچ نہ صرف پاتر تے صورت حال بدلیاں سگوں اک اجیہی بحر وی ایس قصے نوں دتی جیہڑی مگروں آون والیاں ہیر دے شاعراں دی پچھان بن گئی۔قصہ ہیر دی گائیکی لئی بھیرویں راگ وی ات لوڑ یدا ہو گیا تے ہیر دی گائیکی دی پچھان بن گیا احمد نے دمودر نالوں جیہڑے پاتر وکھرے قصے وچ لیاندے اوہ ای پاتر مگروں آون والیاں قصیاں وچ ورتے گئے۔

احمد توں مگروں جس کوی نے ایہہ قصہ نظم کیتا اوہناں داناں حافظ شاہجہان مقبل اے۔اوہ اکھاں دے نور توں وانجے سن پر اوہناں اکھاں دے چانن دا کم دماغ توں لے کے اجیہا قصہ ہیر جوڑیا کہ اوہناں دا لکھیا قصہ اپنے توں پہلے دووڈے کویاں نوں کدھرے پچھے چھڈ گیا۔اوہناں وی اکھاں میٹ کے احمد دی پیروی نہیں کیتی سگوں قصہ رچن وچ اپنے فن دے کمال وی وکھائے تے اپنی عقل، سمجھ بوجھ موجب قصے وچ بدلاوی لیاندے تے بحر نال وی نکی جیہی چھیڑ کر کے چونہہ چونہہ مصرعیاں دے بنداں وچ ہیر دا قصہ لکھیا۔احمد نے جیہڑی گل چار توں ودھ مصرعے لکھ کے مثنوی موجب مانی مقبل ہوراں اوہنوں چار چار مصرعیاں دے خانے وچ بند کر کے اک پاسے تے اپنی کلا لئی پڑ نکا کیتا پر دوجے پاسے ایس نکے جیہے چار مصرعیاں دے خانیاں وچ وی اپنی فنکاری دے اجیہے کمال وکھائے کہ پڑھن والا داد تیوں بناں نہیں رہ سکدا۔مقبل ہوراں احمد نالوں اک ہیر ایس حوالے نال وی اگانہہ رکھیا کہ اوہناں پاتراساری وچ احمد ورگی کالھی نہیں وکھائی تے کئی تھاواں تے

کھلو کے عقل فہم شعور نال احمد نالوں ودھ کے اپنے پاتراں نوں کوچیا مانجیا تے لشکا پھبا کے لوکائی ساہویں دھریا، مقبل دا اک ہے وادھا قصہ ہیر لکھن وچ ایہہ وی اے کہ ایہناں بنداں دے عنوان اوہناں پہلی واری فارسی وچ لکھے تے فیر اک اک عنوان نوں نبھان خاطر اوہدے تھلے تن چار چھے بنداں تیکر وی لکھے تے ایہدے توں ودھ وی، دمودر دے قصے نوں تے احمد نے تھوڑی بہت رہنمائی لے کے چھڈ دتا پر مقبل ہوراں صرف تے صرف احمد دے قصے نوں ای مکھ رکھیا تے اوہدیاں گھاٹاں تے اختصار نوں چوکھی حد تیکر مکا کے قصے دی چھوہلی ٹور نوں مٹھی تے مٹھی چالے پا کے قصے دا رنگ ڈھنگ بدلیا۔ ایہو کم فیر وارث شاہ ہوراں مقبل دے قصے نوں مکھ رکھ کے کیتا۔ وارث شاہ ہوراں احمد کولوں وی لابھ لیا پر دمودر کولوں بہت گھٹ سگوں نہ ہون دے برابر کجھ احمد کولوں تے چوکھا مقبل کولوں لے کے امر قصہ ہیر رچیا۔ وارث ہوراں اپنے توں پہلے ایہناں شاعراں کولوں لابھ تے ضرور لیا پر اوس لابھ نوں اوہناں بھگتا یا اپنی من مرضی تے پیر استادی نال۔ وارث شاہ ہوراں منطق تے لوکائی دی نفسیات نوں مکھ رکھ کے اپنے پاتراں دی نفسیات اساری تے قصہ برائے قصہ نہیں لکھیا سگوں قصہ برائے زندگی لکھیا، جیہڑا کل وی امر سی اج وی امر اے تے پکی گل اے آون والی بھلک وچ وی امر ای رہنا اے۔

مقبل تے وارث دے پاتراں دے حوالے نال ٹکراواں تول کرنا دمودر تے احمد دے پاتراں دے ٹکراویں تول نالوں چوکھا سوکھا اے کیوں جے مقبل دے اسارے پاتر وارث نوں وی بھائے تے مقبل احمد نوں لئے۔ وارث دے پاتر مقبل نالوں صرف تے صرف کجھ تھاواں تے اک دوجے نالوں وکھ نیں باقی داستان دے حوالے نال وارث سب توں ودھ متاثر مقبل کولوں نیں جیہدا ثبوت وارث تے مقبل تے مصرعیاں دے مصرعے تکے موٹے لفظی ہیر پھیر نال وارث ہوراں اپنی ہیر وچ رلا لئے۔ ہن اسیں دوواں شاعراں دے پاتراں نوں ٹکراویں تول دے حوالے نال ویکھنے آں۔۔

رانجھا:۔

مقبل دا رانجھا سیچوایشن تے پاتراں دے آپسی ٹاکرے دے حوالے نال وارث توں چوکھا وکھرا اے رانجھے دا پاتر مقبل ہوراں بڑی تفصیل تے سوجھ سیانف نال اساریا اے۔ اوہناں کول رانجھے دی حیاتی دا اڈھلا دور چوکھا وکھرا اے۔ مقبل کول رانجھا داستان وچ انج آوندا اے۔

موجو جٹ دا لاڈلا نام دھیدو وچ تخت ہزارے دے وسدا سی
مونہوں جھڑن گلاب دے پھل تازے جدوں سوہنا کھل کے ہسدا سی
نینیں ہیر دی خواب وچ ذبح ہویا بھیت کسے نوں مول نہ دسدا سی
دن رات معشوق دے ویکھنے نوں پیا مقبلے وانگ ترسدا سی (58)

مقبل کول وی رانجھے دے بھراواں دی پیودے مرن مگروں زمین دی کانی ونڈ موجود اے۔ جیہڑی پنڈ دے پینچاں تے بھراواں نال رل کے ونڈی اے تے رانجھے نوں مقبل موجب انج دی زمین آئی اے۔

ملک اپنے باپ دے ونڈ نے نوں پینچ سد کے بھائیاں نے کجھ پائی
جتھے وہ تے سرکڑا ملیا سی سوئی زمین رانجھیٹے دی ونڈ آئی (59)

مقبل کول رانجھا بنجر زمین واہن جاندا تے اوہدے ہتھاں تے چھالے پے جاندے نیں تے اوہ بے ہوش ہو کے ڈگ پیندا

اے۔روٹی لے کے آئیاں رانجھے دیاں بھرجائیاں بے ہوش رانجھے نوں ویکھدیاں نیں۔مقبل کول بھراواں تے بھابیاں دارویہ رانجھے نال بڑا پیار بھریااے۔جدوں رانجھا پنڈ چھڈ کے جان لگدااے تے مقبل کول اوہدے پنڈ چھڈ کے جان دی وجہ ہیرنوں خواب وچ ویکھنااے نہ کہ بھابیاں تے بھراواں داغلط رویہ اے۔جس ویلے رانجھا پنڈ چھڈ کے جان لگدااے تے مقبل کول رانجھے دیاں بھابیاں اوس نوں آکھدیاں نیں۔

مقبل کم دامار یا جاہ ناہیں اسیں چاکری تیری توں پاک ہوئیاں (60)

یا

کہیا بھابیاں رانجھیا چھوڑناہیں تیری تھاؤں اسیں ہل جونیاں ہاں (61)

رانجھے نوں وی اپنیاں بھابھیاں نال کوئی گلہ نہیں اوہ اوہناں نوں آکھدااے۔

رانجھا آکھدا بھابیو خوشی رہو میرے نال جے تساں احسان کیتا

دماں باجھ غلام ہاں بھابھیاں داتساں ایروں جیو قربان کیتا (62)

بھابیاں دے نال نال رانجھے نوں اپنے بھراواں نال وی کوئی گلہ نہیں اوہ بھراواں بارے اوہناں نوں آکھدااے۔

رانجھا آکھدا سکیاں بھائیاں نوں تسیں مول نہ پووخیال میرے

میرا لوں لوں خوشی ہے بھائیاں توں مینوں سونپ کے رب نوں جاؤ ڈیرے (63)

رانجھے دے گھروں جان دا بھائیاں نوں وی بڑا دکھ اے۔

ویرو چھڑے بہت غمناک ہوئے پئے جھوردے طعام نہ کھاوندے نی (64)

رانجھا پنڈوں نکلدا اے تے اوہدا واہ مولوی نال پیندا اے جیہڑا بڑا بیبا اے۔اوہ رانجھے نوں جی آیاں نوں آکھدا اے تے اوہدے کھان پین دا بندوبست کردا اے۔مقبل دے رانجھے دالڈن نال واہ پیندا اے تے اوہ وی اوہنوں ترکے دریا پار کرنوں منع کردا اے تے بیڑی وچ بٹھا کے دریا پار کرادیندا اے رانجھا جھنگ ہیر دے وطن بغیر کسے ٹاکرے جاں مخالفت دے سدھے سدھا اپڑ جاندا اے۔مقبل کول تے ایہہ سدھی سدھی ہیر کہانی اے پر وارث شاہ ہوراں پہلے حصے وچ ای قلم دے اوہ کمال وکھائے نیں کہ ایہہ داستان نری داستان نہیں رہی سگوں تاریخی دستاویز بن گئی اے۔مقبل تے وارث دا زمانہ اٹھارہویں صدی دا ای اے پر مقبل تے اٹھارویں صدی دے سماجی سیاسی حالات دا کوئی خاص پربھاؤ نہیں پیا اوس سدھی سدھی کہانی بیان کردتی اے پر وارث شاہ دی داستان نوں پڑھ کے صاف پتہ لگدا اے کہ اوہناں کول بھرواں سیاسی سماجی شعورہ کھلیاں اکھاں تے روشن دماغ سی۔اٹھارویں صدی دے سیاسی سماجی حالات جس ٹٹ بھج دا شکارسن وارث اوس توں پوری طرح آگاہ سن ایسے لئی اوہناں رانجھے دے جھنگ اپڑن تیکر غرضاں مارے بھراواں بھابیاں رشوت خور قاضیاں تے سرمایاداری دے پُرزے لڈن تے مذہب دے نام نہاد ٹھیکیدار ملاں نال رانجھے دا ٹاکرا کرا کے اٹھارویں صدی دے تاریخی تے نفسیاتی حالات تے لوکائی دے ویہاراں دا تت کڈھ چھڈیا اے تے نال ای ایہناں اداریاں دے کرتوت بڑی دلیری تے دبنگ لہجے وچ وسے نیں۔مثال وجھوں وارث ملاں بارے بہت بہت کجھ لکھیا اے پر کئی تھاواں تے اکو گل وچ بہت کجھ آکھ گئے نیں۔

وارث شاہ میاں پنڈ جھگڑیاں دی پچھوں ملاں مشیت دا آیا اے (65)

اٹھارویں صدی دے انصاف دے ادارے دا آ گو قاضی اے اوہدے بارے وارث لکھدے نیں۔

حضرت قاضی تے پنچ سداسارے بھائیاں زمین نوں کچھ پوایا اے

وڈھی دے کے بھوئیں دے بنے وارث بنجر زمین رنجھیٹے نوں آیا اے (66)

رانجھے دے بھراواں دے حوالے نال جیہڑے کہ خون دا رشتہ نیں لکھدے نیں۔

باپ کرے پیار تے ویر بھائی ڈرباپ دے تھوں پئے سنگدے نیں

کوئی وس نہ چلنے کڈھ چھڈن دیندے مہنے رنگ برنگ دے نیں

وارث شاہ ایہہ غرض ہے بہت پیاری ہورساک نہ سین نہ انگ دے نیں

لڈن جیہڑا کہ جاگیرداری وسوں دا اک پرزہ اے اوہدے بارے لکھدے نیں۔

وارث شاہ میاں لڈن وڈھی کپن، کیا شہد دالدیا بانیاں نیں (68)

مقبل دے مقابلے وچ وارث شاہ ہوراں ایہناں سرکاری تے غیر سرکاری مذہبی تے خونی رشتیاں نال رانجھے دا ٹاکرہ کرا کے اٹھارویں صدی دے پنجاب واسیاں دی حالت تے نفسیات نوں انج بیان کیتا اے کہ ایہناں پاتراں دے مکالمیاں وچوں اوس دور دی لٹ مار بے وساہی، کھوہا موہی، ڈرخوف سارا کجھ اکھاں ساہویں آجاندا اے اے جد کہ مقبل دا رانجھا ساؤ سبھاد اما لک اے تے ہر صورت حال نوں آسانی نال پار کری جاندا اے۔

رانجھے تے ہیر دے میل دا رنگ دوواں کویاں کول لگ بھگ اکو جیہا اے پر رانجھا جیہڑا ہیر نوں مقبل موجب خواب وچ ویکھ چکا اے تے اوہدے عشق وچ مبتلا وی ہو چکا اے، ہیر نوں کھلی اکھیں ویکھ کے پچھان نہیں سکدا تے ہیراوہنوں پچھدی اے کہ توں کیہ کرسکنا ایں تے رانجھا آکھدا اے کہ ''میں مجھاں چار سکناں''، جد کہ وارث ہوراں ایس جھول نوں کڈھ کے رانجھے نوں ہیر کولوں چاک بنوایا اے تاں جے اوہناں دے بیلے وچ ملن دا جواز پیدا کیتا جا سکے۔

مقبل ہیر رانجھے دی بیلے وچ پنج پیراں نال ملاقات کرا کے اوہناں دا ہیر دے ماپیاں نوں دس بجھن توں بنا ای نکاح کرا دیندا اے جد کہ وارث شاہ پنجاں پیراں نوں رانجھے نوں ملاندے ضرور نیں پر اوہناں دا نکاح نہیں کراندے سگوں وارث کول ہر اوکھی گھاٹی وچ مدد، امداد تے تھاپنا دیندے نیں۔

رانجھا تے ہیر بیلے وچ ملدے نیں، کیدو راہیں چوچک نوں پتہ لگ جاندا اے اوہ ہیر دا ویاہ کھیڑیاں ول طے کر دیندا اے تے رانجھے نوں چاکری توں جواب دے دیندا اے۔ چوچک دے آکھن تے ای ملکی اوہنوں منا کے لیاوندی اے۔ مٹھی نائن دا گھر دوہاں دا میل خانہ بندا اے۔ ہیر دا کھیڑیاں ول ویاہ ہو جاندا اے۔ ایتھوں تیکر دوویں کوی ایہناں گلاں نوں اکو جیہے ڈھنگ نال بیاندے نیں۔ پر مقبل رانجھے تے ہیر دا میل ڈولی وچ وی کراندا اے جتھے کھیڑے رانجھے نوں مارن لئی تیار ہو جاندے نیں جد کہ ایہہ صورت حال وارث کول نہیں ملدی۔ وارث ویاہ توں پہلاں ہیر دے سدے تے رانجھے نوں ہیر نال ملا دیندا اے۔ وارث کول مٹھی نائن دا پاتر ہیر دے ویاہ تیکر اے جد کہ

مقبل کول مٹھی نائن پرانے رواج موجب ہیر دی ڈولی دے نال رنگ پور کھیڑیاں جاندی اے تے جدوں سیدا ہیر کول جانداا ے تے پلنگ وی باہی بھج جاندی اے تے سیدے نوں بڑی سٹ لگدی اے۔ پر وارث ایتھے کوئی معجزہ نہیں وکھاندا سگوں ہیر سیدے نوں تراہ دیندی اے ۔ہیر دے ویاہ مگروں مقبل رانجھے نوں واپس تخت ہزارے گھل دینداا ے۔

رانجھے راہ سیالاں دا چھڈ دتا پھیر تخت ہزارے نوں چلیا اے

ملیا جائیکے بھائیاں بھابیاں نوں مقبل یاردے عشق دا پھلیا اے (69)

پر وارث دا رانجھا متحرک اے اوہ تخت ہزارے پرت کے کمزوری نہیں وکھاندا سگوں ہیر دے آکھن تے جوگی بن کے رنگ پورا پڑ دااے تے سہتی دی مدد نال ہیر نوں لے کے نس جانداا ے۔ مقبل کول ہیر تے سہتی رانجھے کول لاگی گھلد یاں نیں تے رانجھا بالناتھ کولوں جوگ لیندا اے۔مقبل کول بالناتھ دا کوئی چیلا نہیں پر وارث کول بالناتھ دے کئی چیلے نیں جیہڑے رانجھے نوں جوگ دین لگیاں بالناتھ نال لڑ دے وی نیں۔قولاں دا پاتر وی دوواں کویاں کول موجود اے جیہڑا ہیر رانجھے دے سنیہے اک دوجے نوں دینداا ے۔اخیر رانجھا رنگ پور جا کے رنگ مچانداا ے، سہتی نوں نال رلانداا ے مراد بلوچ آوندا اے تے رانجھا تے ہیر مراد تے سہتی کھیڑیاں دیاں اکھاں وچ کھیہ پا کے نس جاندے نیں۔ایہہ ساریاں صورتاں دوواں کویاں کول اکو جیہاں نیں۔راجے عدلی دی عدالت وچ ہیر رانجھے دی بدعا نال اگ لگنا، ہیر واپس رانجھے نوں ملنا، تے قصے دا انت ہو جانداا ے۔دوجے پاسے وارث نے ایس قصے نوں بھرویں ٹریجڈی بنا کے پیش کیتا اے۔مقبل کول رانجھے دا پاتر دمودر تے احمد نالوں ودھ سیانا اے پر وارث نے دمودر، احمد تے مقبل کولوں رانجھے دے پاتر نوں بہتر بنا کے پیش کیتا اے وارث نے ایس پاتر نوں بڑی استاکاری نال چتریا اے تے ایہہ پاتر قصے دا ہیرو بنا کے پیش کیتا اے۔

ہیر:۔

ہیر دا پاتر مقبل کول وی بڑا تگڑا اے۔مقبل دی ہیر وی ماپیاں، قاضی تے کھیڑیاں نال اپنی آزادی دی جنگ لڑ دی اے تے رانجھے نوں نال لے کے چلدی اے پر کئی حوالیاں نال کمزور وی اے۔

مقبل اوہنوں قصے وچ تھاں تھاں تے رواندا اے جیہدے نال اوہدا پاتر مقبل کول عجیب تے ماڑا وی لگدا اے جیویں۔

ہیر رانجھے دا جیوں دھڑا ئیکے جیوزادی روندی ماں دے پاس آئی (70)

اک ہور تھاں مقبل انج لکھدے نیں۔

ہیر چوڑیاں بھنیاں وال کھوہے روندڑی رنگ وٹایا سو (71)

ہیر قاضی اگے وی روندی اے۔

ہیر آکھدی روئیکے قاضیے نوں میاں کیہیاں رکتاں رکتا چائیاں نی (72)

مقبل دی ہیر دا انج ای کئی تھاواں تے رونا ہیر دے پاتر دی کمزوری جاپدا اے۔وارث دی ہیر کدھرے وی روندی وکھالی نہیں دیندی سگوں بہت عقل دے نال تدبیر وی کر کے نویں راہ کڈھ لیندی اے۔ہیر دا پاتر کدھرے مایوسی تے محرومی دے احساساں دا شکار ماڑا جیہا ہوندا وی اے تاں اوہ انسانی نفسیات دے عین مطابق اے کہ کدے نہ کدے انسان تھکی ہوئی گل کرای جانداا ے۔انج وارث شاہ دی

ہیر دے مزاج دے ای خلاف اے کہ اوہ رووے دھووے۔

کیدو:۔

کیدو دا پاتر مقبل کول ایویں دوتن جھا کیاں دا پاترا ے۔اوہ قصے وچ آوندا اے تے شکایت کردا اے تے پاسے ہو جاندا اے۔ پر وارث دا کیدو تے قصہ ہیر دا چوتھا تھم اے اوہدے بغیر قصہ ہیر ادھورا اے۔ فیر جیویں وارث شاہ نے اوہنوں اساریا اے اوہ اک تگڑے ولن دا روپ اے جیہڑا اوڑک ایس قصے نوں ٹریجک بنا کے ساہ لیندا اے۔

سہتی:۔

سہتی دا پاتر دوواں کویاں کول چاتر تے چالاک زنانی دا اے۔ دوواں نے زنانی دی سوجھ سیانف، علم فضل تے مکر فریب نوں دل کھول کے بیان کیتا اے پر وارث ایتھے وی اپنے زور بیان، ٹکرا تے الجھا دا ماہر ہون کر کے سہتی دے پاتر نوں قصہ ہیر وچ اجیہا چتر گیا اے کہ نہ وارث توں پہلاں تے نہ ای مگروں کوئی ہور شاعر ایس پاتر نوں وارث وانگوں چتر سکیا اے۔ دواں کویاں کول سہتی اپنے جنسی جذبیاں دے ہڑھ وچ ویہہ کے ہیر تے رانجھے دے میل کراندی اے پر آپ وی اپنی مراد پالیندی اے۔ دوواں کویاں کول سہتی دا پاتر ہیر تے رانجھے دے میل دے حوالے نال بھرواں تے سپورٹنگ پاترا ے۔

ملکی تے چوچک دوواں شاعراں کول لوبھی تے مطلبی پاتر نیں جیہڑے اپنے مطلب لئی اپنی دھی نوں وی رانجھے نال ملدیاں ویکھ کے اکھاں میٹی رکھدے نیں۔

زور بیان، روانی، چیٹک تے شعری حسن مقبل کول وی اتناں دا اے، تے مقبل دی ہیر تے اوہدے پاتر دمودر تے احمد نالوں بہتی سیانف نال چترے گئے نیں پر وارث دا وادھا ایہہ اے کہ اوس ایہناں پہلے تناں کویاں دے پاتراں نوں ساہمنے رکھ کے تقابل کیتا فیر اپنی سوجھ، وسیبی تے سیاسی سماجی حالات نوں مکھ رکھ کے ایہناں پاتراں دی چھنگائی کیتی تے ایہناں نوں اپنی اپنی بت موجب اجیہاں گلاں کر دیاں دکھایا اے اے جیہناں نوں پڑھن والا اعتراض لئی انگلی چکن دی تھاں ایہناں دیاں کیتیاں گلاں دے سوا وچ اگے توں اگے ٹریا جاندا اے۔

وارث توں پہلے شاعر دمودر، احمد تے مقبل وی انسانی نفسیات دے چنگے جانوسن پر اوہناں وی چترائی تے اوہناں دے ویلے دے حالات وی چوکھے اثر انداز ہوئے۔ جیویں وارث تے، پر وارث نے حدوں ودھ حساسیت وکھائی جیہڑی کہ اک بہت وڈے فنکار دا انملا گہنا ہوندی اے، تاں ای وارث اک Legend دا روپ وٹا گیا تے اوہدی لکھی داستان ہیر رانجھا کلاسیک دے درجے تے جا اپڑی۔

حوالے:۔

1۔ عبدالعزیز شیخ (مرتب)۔ ہیر وارث شاہ (لاہور، پنجابی ادبی اکیڈمی 1964ء) 9۔

2۔ محمد آصف، خاں (مرتب)۔ ہیر دمودر (لاہور، پنجابی ادبی بورڈ 1986ء) 60۔

3۔ محمد آصف، خاں (مرتب)۔ ہیر دمودر، 65۔

4۔ عبدالعزیز شیخ (مرتب)۔ ہیر وارث شاہ، 31۔

5۔ محمد آصف، خاں (مرتب)۔ ہیر دمودر، 89۔

6۔ عبدالعزیز شیخ (مرتب)۔ ہیر وارث شاہ، 62۔
7۔ عبدالعزیز شیخ (مرتب)۔ ہیر وارث شاہ، 62،63۔
8۔ محمد آصف، خاں (مرتب)۔ ہیر دمودر، 132۔
9۔ محمد آصف، خاں (مرتب)۔ ہیر دمودر، 138۔
10۔ محمد آصف، خاں (مرتب)۔ ہیر دمودر، 145۔
11۔ عبدالعزیز شیخ (مرتب)۔ ہیر وارث شاہ، 208۔
12۔ محمد آصف، خاں (مرتب)۔ ہیر دمودر، 38۔
13۔ محمد آصف، خاں (مرتب)۔ ہیر دمودر، 57۔
14۔ محمد آصف، خاں (مرتب)۔ ہیر دمودر، 92۔
15۔ عبدالعزیز شیخ (مرتب)۔ ہیر وارث شاہ، 63۔
16۔ علی عباس جلال پوری۔ مقامات وارث شاہ (لاہور، مقامات وارث شاہ، تخلیقات، 1999) 18۔
17۔ محمد آصف، خاں (مرتب)۔ ہیر دمودر 94۔
18۔ محمد آصف، خاں (مرتب)۔ ہیر دمودر، 94۔
19۔ عبدالعزیز شیخ (مرتب)۔ ہیر وارث شاہ، 74۔
20۔ محمد آصف، خاں (مرتب)۔ ہیر دمودر 188۔
21۔ محمد آصف، خاں (مرتب)۔ ہیر دمودر، 266۔
22۔ محمد آصف، خاں (مرتب)۔ ہیر دمودر، 239۔
23۔ عبدالعزیز شیخ (مرتب)۔ ہیر وارث شاہ۔
24۔ محمد آصف، خاں (مرتب)۔ ہیر دمودر، 115۔
25۔ عبدالعزیز شیخ (مرتب)۔ ہیر وارث شاہ، 88۔
26۔ محمد آصف، خاں (مرتب)۔ ہیر دمودر، 166۔
27۔ عبدالعزیز شیخ (مرتب)۔ ہیر وارث شاہ، 58۔
28۔ محمد آصف، خاں (مرتب)۔ ہیر دمودر، 117۔
29۔ عبدالعزیز شیخ (مرتب)۔ ہیر وارث شاہ، 165۔
30۔ محمد آصف، خاں (مرتب)۔ ہیر دمودر، 47۔
31۔ محمد آصف، خاں (مرتب)۔ ہیر دمودر، 86۔

32۔ عبدالعزیز شیخ (مرتب)۔ ہیر وارث شاہ، 45۔

33۔ عبدالعزیز شیخ (مرتب)۔ ہیر وارث شاہ، 46۔

34۔ عبدالعزیز شیخ (مرتب)۔ ہیر وارث شاہ، 49۔

35۔ محمد آصف، خاں (مرتب)۔ ہیر دمودر، 38۔

36۔ عبدالعزیز شیخ (مرتب)۔ ہیر وارث شاہ، 75۔

37۔ عبدالعزیز شیخ (مرتب)۔ ہیر وارث شاہ، 80۔

38۔ محمد آصف، خاں (مرتب)۔ ہیر دمودر، 124۔

39۔ عبدالعزیز شیخ (مرتب)۔ ہیر وارث شاہ، 108۔

40۔ محمد آصف، خاں (مرتب)۔ ہیر دمودر، 112۔

41۔ محمد آصف، خاں (مرتب)، ہیر دمودر، 113۔

42۔ محمد آصف، خاں (مرتب) ہیر دمودر، 118۔

43۔ عبدالعزیز شیخ (مرتب)۔ ہیر وارث شاہ، 134۔

44۔ عبدالعزیز شیخ (مرتب)۔ ہیر وارث شاہ، 38-137

45۔ عبدالعزیز شیخ (مرتب)۔ ہیر وارث شاہ، 110۔

46۔ سبط الحسن ضیغم (مرتب)۔ ہیر احمد گجر (اسلام آباد، لوک ورثہ، 1992) 21۔

47۔ عبدالعزیز شیخ (مرتب)۔ ہیر وارث شاہ، 9۔

48۔ عبدالعزیز شیخ (مرتب)۔ ہیر وارث شاہ، 12۔

49۔ عبدالعزیز شیخ (مرتب)۔ ہیر وارث شاہ، 41۔

50۔ سبط الحسن ضیغم (مرتب)۔ ہیر احمد گجر، 26۔

51۔ سبط الحسن ضیغم (مرتب)۔ ہیر احمد گجر، 33۔

52۔ عبدالعزیز شیخ (مرتب)۔ ہیر وارث شاہ، 62۔

53۔ سبط الحسن ضیغم (مرتب)۔ ہیر احمد گجر، 62۔

54۔ عبدالعزیز شیخ (مرتب)۔ ہیر وارث شاہ، 60۔

55۔ سبط الحسن ضیغم (مرتب)۔ ہیر احمد گجر، 31۔

56۔ سبط الحسن ضیغم (مرتب)۔ ہیر احمد گجر 53۔

57۔ عبدالعزیز شیخ (مرتب)۔ ہیر وارث شاہ، 248۔

58۔ فقیر، محمد فقیر، ڈاکٹر (مرتب)۔ ہیر مقبل (لاہور، عزیز بک ڈپو، س ن) 2۔
59۔ فقیر، محمد فقیر، ڈاکٹر (مرتب)۔ ہیر مقبل، 3۔
60۔ فقیر، محمد فقیر، ڈاکٹر (مرتب)۔ ہیر مقبل، 4۔
61۔ فقیر، محمد فقیر، ڈاکٹر (مرتب)۔ ہیر مقبل، 4۔
62۔ فقیر، محمد فقیر، ڈاکٹر (مرتب)۔ ہیر مقبل، 5۔
63۔ فقیر، محمد فقیر، ڈاکٹر (مرتب)۔ ہیر مقبل، 6۔
64۔ فقیر، محمد فقیر، ڈاکٹر (مرتب)۔ ہیر مقبل، 6۔
65۔ عبدالعزیز شیخ (مرتب)۔ ہیر وارث شاہ، 32۔
66۔ عبدالعزیز شیخ (مرتب)۔ ہیر وارث شاہ، 12۔
67۔ عبدالعزیز شیخ (مرتب)۔ ہیر وارث شاہ، 10۔
68۔ عبدالعزیز شیخ (مرتب)۔ ہیر وارث شاہ، 43۔
69۔ فقیر، محمد فقیر، ڈاکٹر (مرتب)۔ ہیر مقبل، 66۔
70۔ فقیر، محمد فقیر، ڈاکٹر (مرتب)۔ ہیر مقبل، 34۔
71۔ فقیر، محمد فقیر، ڈاکٹر (مرتب)۔ ہیر مقبل، 36۔
72۔ فقیر، محمد فقیر، ڈاکٹر (مرتب)۔ ہیر مقبل، 43۔

جنگل وستی

حمیدرازی

ایہہ جون دے دناں دی گل اے، دوتن دیہاڑیاں توں ہسٹرودھیا ہویا سی۔لگدا سی جیویں ساون کجھ دیہاڑے پہلاں آ گیا اے۔اوہنے بہندیاں سارای سجے ہتھ باری توں باہر ویکھیا، اوہنوں لگا رکھ کجھ چل رہے نیں تے کالے بدل کسے پاسیوں اوارہ گردی کردے ایدھر آنکلے نیں۔اوہنے نائب قاصدنوں باری دے پردے ہوراگے پچھے کرن دا آکھیا، پردے ہٹے اوہ باہر ویکھن لگ پیا۔لگدا سی بدل اج ورھن دا پروگرام بنا کے آئے نیں۔لوکی فٹ پاتھ اتے ترکھے ترکھے ٹر رہے سی۔

تنویر دفتر اپڑن مگروں سبھ توں پہلا قہوہ پیندا۔اوس دن دے سرکاری کماں نوں اک کاغذ اتے لکھدا تے ساہمنے شیشے تھلے رکھ دیندا۔دوجے کاغذ اتے بالاں دی فیس، بجلی یا گیس دے بل یا کوئی ہور گھر دا نکا موٹا کم لکھ لیندا۔اوہ ریلوے راولپنڈی ڈویژن دا پرسنل افسر سی۔اوہ ملازماں دی بدلی' ترقی تے سزا دے معاملات ویکھدا سی۔ڈویژن وچ کوئی دس ہزار دے نیڑے تیڑے ملازم سن۔ملازماں دی بھلائی وی اوہدے سرکاری کم دا حصہ سی۔ایس پکھ توں اوہنوں ملازماں دی ماں وی آکھیا جاندا سی۔اوہنے ہفتے وچ دو دیہاڑے ملازماں دے مسئلے سنن لئی رکھے ہوئے سی، سچی گل تے ایہہ سی جے ہفتے دے باقی دیہاڑیاں وچ وی اوہنوں ملن اتے کوئی روک رکاوٹ نہیں سی۔

اوہ حالی دفتر کم شروع کرن لگا ای سی جے اتوں اوہدا دفتری بیلی اشفاق آ گیا۔اشفاق ڈویژن وچ اکاؤنٹس دے محکمے دا انچارج سی تے اوہنوں ایتھے کم کردیاں دوتن سال ہو گئے سن۔اوہ بہندیاں سارای آکھن لگا، میں کجھ پریشان آں، میرے کول اک بابا جی دوتن دیہاڑیاں توں آرہے نیں، مینوں سمجھ نہیں آوندی میں اوہناں دا مسئلہ کنج حل کراں۔اینی گل کر کے اوہ تنویر ول دیکھن لگ پیا تے پھیر آپوں ای بول پیا، جے تسیں اجازت دیو تے میں بابا جی نوں اندر سدلواں، تے فیر اٹھ کے بابا جی نوں جیہڑے دفتر دے باہر کھلوتے سن، اندر بلا لیایا، اوہ اندر آئے تے تنویر نے اوہناں نوں کرسی اتے بیٹھن دا آکھیا تے نال ای اوہناں اتے اک نظر وی مارلتی۔اوہ پینٹھ ستر دے پیٹے وچ ہوون گے، ہوسکدا اے اوہناں دی عمر کجھ گھٹ ہووے پر غریبی بندہ گال دیندی اے، تے خوراک گھٹ لبھن نال اوہ اندروں زنگالیا جاندا اے۔اکھاں اتے پرانی جیہی عینک لگی ہوئی تے اوہناں دے چہرے دا رنگ کنک ونا ہو گیا ہویا سی۔بابے ہوراں قمیض نال مڑھکا پونجھیا، اپنے ساہ سدھے کیتے تے تنویر ول ویکھن لگ پئے۔اشفاق نے ویکھیا بابا جی بہہ گئے نیں تے بولیا، ہن تسیں اپنا مسئلہ دسو۔

''میں مسئلہ دساں، میں کنی واری دساں، میں دس دس کے اک گیا آں۔میں پشاور جاندا آں اوہ پنڈی گھل دیندے نیں، پنڈی والے پشاور بھیج دیندے نیں، میں گڈیاں وچ سفر کر کے رل گیا آں، مینوں کوئی گھاہ ای نہیں پاندا۔میرا پتر منجی اتے پیا ہویا اے، مینوں اوہدے سراتے بہنا چاہیدا اے، کوئی پتہ نہیں اوہ کنے دن ساڈے کول اے، کینسر ورگے موزی مرض نے اوہنوں اندروں کھا چھڈیا اے، چالی پنجتالی ورھیاں دا گبھرو میرے ہتھوں ڈھلدا جارہیا اے، ریلوے والیاں نے اوہدے لئی ستر ہزار کیہ منظور کیتے نیں، مینوں تے رول ای دتا اے''۔

تنویر تے اشفاق نے بابا جی ول ویکھیا، اوہناں دی کاوڑ ودھدی جارہی سی۔''ستر ہزار؟ میں تے کئی ستر ہزار لگا دتے نیں، ڈاکٹراں نے وی مینوں کھالتا اے، ایہہ اللہ نے میرے نال کیہ کیتا اے، میں بڈھا بندہ رل رہیا آں، میں قرضئی ہو گیا آں، میرے کول

سکھ نہیں رہیا، میں تے اٹھ سال دی پوتری وی رہن رکھ دتی اے''۔ ایہہ گل آکھ کے اوہ ڈھاہ مار کے رون لگ پئے۔ تنویر تے اشفاق نے اک دوجے ول ویکھیا، اوہناں دیاں اکھیاں وچ وی اتھرو آگئے۔ ''یار، باباجی نوں پیسے کیوں نہیں لبھ رہے؟'' تنویر نے پچھیا۔ باباجی دا پتر کندیاں ریلوے ٹیشن اتے ملازم سی جد اوہنوں کینسر دا مرض لگ گیا۔ جدوں علاج لئی کیس گیا، اددوں کندیاں ریلوے ڈویژن پشاور وچ آوندا سی۔ ہن پیسے منظور ہو کے آئے نیں تے ایہہ ٹیشن ریلوے ڈویژن راولپنڈی وچ آ گیا اے''۔

''اشفاق یار ایہدا حل دسو۔۔۔'' تنویر نے پچھیا تے باباجی، اتھرو پونجھ کے گل سنن لگ پئے۔

''ایہدا اک حل اے''، اشفاق بولیا۔

''اوہ کیہ؟''۔

''ایہہ جون دے دن نیں، مالی سال مکن والا اے، میرے کول بجٹ نہیں پر کجھ پیسے ریلوے ہسپتال پنڈی دی ایم ایس دے بجٹ وچ موجود نیں، جے اوہ مینوں ستر ہزار دا بجٹ دے دیوے تے ایہہ مسئلہ حل ہو سکدا اے۔'' تنویر دیاں اکھاں وچ چمک جیہی آ گئی۔ اوہ کرسی اتے پچھے ہو کے بہہ گیا تے کجھ گھڑیاں سوچن لگ پیا، فیر اوہ ایم ایس نال گل کرن لئی فون ملاون لگ پیا۔ اوہ تے ایم ایس پچھلے دو تن سال توں اک دوجے نوں جاندے سن تے اک دوجے دی عزت کردے سی۔ ڈاکٹر سعیدہ نے اوہدی گل سنی تے نال ای دس وی دتا جے اوہدے بجٹ وچ ستر ہزار موجود نیں تے اوہنوں ایہہ پیسے دیون اتے اعتراض وی کوئی نہیں، بس اکاؤنٹس والیاں نوں اعتراض نہ ہووے۔ تنویر نے اگوں آکھیا اکاؤنٹس والیاں نال اوہ آپوں نبڑ لوے گا تے نال ای اشفاق ول تکن لگ پیا۔ تنویر نے اپنی سرکاری گڈی ہسپتال گھلی تے ایک گھنٹے دے اندر ایم ایس ولوں لیٹر اوہدی میز اتے موجود سی۔ تھوڑے چر پچھوں اشفاق تے باباجی فیر اوہدے دفتر آ گئے۔ تنویر نے ایم ایس دا لیٹر اشفاق دے ہتھ پھڑایا تے اوہدا جواب اڈیکن لگ پیا۔ اشفاق نے باباجی نوں ویکھیا تے بولیا، بزرگو کل اک وجے آکے ستر ہزار دا چیک لے جانا۔

باباجی نے دوواں نوں تکیا، اوہناں دیاں اکھاں وچ حالی وی بے یقینی دے پرچھاویں سن، دوواں اتے اک نظر مار کے اوہ دفتروں باہر نکل گئے۔ باہر کسے کولوں ویلا پچھیا، حالی دن دے باراں وجے سن، اوہ سوچن لگ پئے میں کندیاں ٹرجاواں یا پنڈی ای رہ جاواں۔ کل اک وجے حالی پورا دن پیا ہویا اے۔ اوہناں دا مونہہ ریلوے ٹیشن ول سی، ٹیشن توں تھوڑا پہلاں اک ریڑھی اتے رک کے تے دوسموسے لے اگے جا کے کھلو گئے۔ کسے گڈی دا ویلا ہو گیا سی، لوک ٹیشن ول دوڑی جا رہے سی۔ اوہناں اسمان ول ویکھیا تے بولے، چنگا پتر اج فیر میں پنڈی رہ جاندا آں، ٹیشن اتے ای رات نوں کسے بنچ اتے سوں جاواں گے جے نیندر آئی تے، جتھے اینا وقت لنگھ گیا اے، کل اک وج ای جائے گا۔۔۔ اوہناں ایہہ گلاں انج کیتیاں جیویں اوہناں دا پتر ساہمنے بیٹھا ہووے۔

اگلے دیہاڑے تنویر دفتر وچ بہت رجھیا رہیا۔ وزیر اعظم نے اک دودن وچ ٹیشن اتے کسے ریل گڈی دا افتتاح کرنا سی۔ اوہدے ذمے کئی کم لگے ہوئے سن۔ افسراں تے ملازماں دے سیکورٹی کارڈ بناونے سی، ایس مقصد لئی ضلعی انتظامیہ تے پلس نوں کجھ خط لکھنے سی، وزیر اعظم دے کھان پین دا شہر دے وڈے ہوٹل توں سربندھ کرنا سی۔ خوراک نوں پہلاں ڈاکٹرنوں چیک کروانا سی۔ انج دے بہت سارے نکے موٹے کم اوہدے پیٹے پئے ہوئے سن۔ اتوں میٹنگاں توں جان نہیں سی چھٹ رہی۔ اوہدا باباجی دے کم ول دھیان ای نہ

گیا۔ اوہنے پانی پیندیاں گھڑی ول ویکھیا، دن دے ڈیڑھ وج چکے سی۔

’اوہ‘‘، آکھ کے اوہ باباجی بارے سوچن لگ پیا۔ اینے چر وچ دفتر دا بوہا کھلیا تے باباجی اندر آ گئے۔ اوہ اوہدے ول ودھدے آ رہے سی، اوہ اندروں ڈر گیا۔ اکاؤنٹس والیاں نے فیر کوئی اعتراض لگا دتا ہووے گا۔ اوہنے باباجی ول تکیا اوہ ہور نیڑے آ گئے سی تے آکے کھلو کے تے جھولی چک لئی، پتر اللہ تینوں دوواں جہاناں وچ عزت دے۔ تے فیر اوہناں دعاواں دی چھتری کھول دتی۔ میں شرمسار آں، تہاڈا کم بہت پہلے ہو جانا چاہیدا سی۔ باباجی خش لگ رہے سی۔ اوہ جیہدے بارے اوہ ناامید ہو گئے سی، دیر سویر اخیر ہو ای گیا سی۔ تنویر کرسی اتے بیٹھا تے باباجی دعاواں دیندے باہر نکل گئے۔

دوپہر دے تن چار وج گئے سی۔ مہر ایکسپریس چلن وچ حالی کجھ چر باقی سی۔ باباجی تن نمبر پلیٹ فارم اتے لکڑی دے بنچ اتے بہہ گئے اوہناں چاہ دے سٹال توں اک کپ چاہ تے دو تن بسکٹ لے لتے، اوہناں نوں ڈاڈھی بھکھ لگی ہوئی سی۔ اوہ چاہ وچ بسکٹ ڈبو کے کھاون لگ پئے۔ اینے چر وچ گڈی وی پلیٹ فارم اتے آکے لگ گئی۔

اوہناں اچے اچے ڈکار مارے تے آکے گڈی وچ بہہ گئے۔ اوہ چھیتی گھر اپڑنا چاہوندے سن۔ فیر کئی سوچاں نے اوہناں نوں کلاوا مار لیا۔ اوہ پتر بارے نہیں سی سوچنا چاہوندے، اوہ ایہدے بارے سوچدے تے ڈر نال کنبنی لگ جاندی۔ اوہناں دا دھیان اپنی پوتری چھیماں ول سی۔ میں کل سویرے سویرے بینک جا کے چیک جمع کرا دیاں گا۔ اک دو دیہاڑیاں وچ پیسے لبھ جاون گے۔ پیسے اوہناں خنزیراں دے مونہہ اتے ماراں گا تے دھی رانی نوں گھر لے آوں گا۔ ایہناں سوچاں نال اوہناں دے چہرے اتے تھوڑی چمک جیہی آئی۔ اوہناں باہر ویکھیا کوئی ریل گڈی ٹھکا ٹھک کردی لنگھ رہی سی۔

ریل دا ڈبہ لوکاں نالوں بھر گیا سی تے آوازاں دا میلہ لگا ہویا سی۔ جد گڈی چلی اوہناں نوں لگا جیویں ایہدی رفتار بہت گھٹ ہووے۔ کندیاں کد آوے گا، اوہناں اپنے آپ نال گل کیتی تے چپ چپیتے اپنی سیٹ اتے بیٹھے رہے۔ نہ اوہناں کسے نوں بلایا نہ اوہناں نال کسے گل بات کیتی۔ گڈی جنڈ ریلوے ٹیشن اپڑی تے باہر ہنیرا اپے گیا ہویا سی، باباجی اک دو دن دے ڈاڈھے تھکے ٹٹے ہوئے سی، نیندر نے اوہناں اتے حملہ کیتا تے اوہ سوں گئے۔ اوہناں خاب وچ ویکھیا چھیماں رو رہی اے، اگلی گھڑی اوہناں ویکھیا اوہ بینک دے گیٹ اتے کھلوتے نیں تے گارڈ اوہناں نوں اندر نہیں جاون دے رہیا، بابا حالی بینک دا ٹائم نہیں ہویا۔۔۔ اوہناں دی اکھ کھل گئی، کندیاں نیڑے آ گیا سی۔ اوہ ٹیشن توں باہر نکلے ساہمنے ای ریل وستی سی۔ رستے وچ ہنیرا پر اوہناں ویکھیا لوکی اوہناں دے کوارٹر ول جا رہے سی۔ تھوڑے ہور اگے ہوئے تے کسے دسیا، بابا تیرا پتر پورا ہو گیا اے۔۔۔

گھر مرداں تے زنانیاں نال بھریا ہوا سی۔ ساری ریل وستی اوہناں دے گھر آ گئی سی، اوہناں اگے پچھے نظر ماری تے رون دی کوشش کیتی پر اتھرو اوہناں دیاں اکھاں وچ سک گئے سی۔ اوہناں نے زنانیاں ول ویکھیا، اوہ ظالمو اج تے چھیماں نوں چھڈ جاندے۔ میں تار دیاں گا تہاڈے پیسے۔۔۔ چیک میرے بوجھے وچ اے، تار دیاں گا، میں تار دیاں گا۔۔۔ زمین سجیوں کھبے گھم گئی، فیر تھلے گئی اپر جا رہی سی تے باباجی پتر دی منجی اتے ڈگ پئے۔ اوہناں دے بل ہل رہے سی، میں تار دیاں گا، تار دیاں گا تہاڈے پیسے۔

علامہ اقبال کی غزل کا پنجابی ترجمہ

خاور بوسالوی

کدے اے حقیقتے لکیے نی نظری آ توں روپ مجازدے وچ
فیر ویکھ میرے متھا ٹیکنے نوں ڈب ڈب کے عجزنیازدے وچ

باقی رہیا ناں عشق داتاء کدھرے ناں اوہ شوخڑا حسن بلا کدھرے
ناں اوہ غزنوی نوں اندر کھچ پیندی ناں اوہ کنڈل اے زلف ایازدے وچ

ایویں رکھ ناں ایہنوں بچاکے توں شیشہ وکھرا عجب عجیب تیرا
ٹٹا ہووے تے چنگا اے لکھ واری اکھیں بھاوندا اے شیشہ ساز دے وچ

کدھرے رہی ناں جا امان والی بخشن والے نے بخش کے لج پالی
میرے قدوں وڈے سن عیب میرے اوہنے عیباں نوں رکھیا اے راز دے وچ

متھا ٹیکیا جدوں میں زمیں اُتے اگوں زمیں پکار پکار آکھے
تیرا دل اے بتاں دا بتخانہ تینوں ملے گا کیہ نماز دے وچ

(غزل)

اخلاق عاطف

بھلے وسرے قرار دی گل اے
ایہہ گواچی بہار دی گل اے
لوک سن کے تڑفدے رہندے نیں
خورے کس بے قرار دی گل اے
صرف خشبو ، کہ پھل کلیاں وی؟
ایہ ترے اختیار دی گل اے
میں کسے دا گلا کراں کاہنوں
اپنے اپنے ویہار دی گل اے
بول مٹھے نہ ہون تے صورت
صرف اک اشتہار دی گل اے
سرخی کجلے تے مک نہیں جانی
ایہ تے سولھاں سنگار دی گل اے
جھال جھلے گا کون ، ایہ چن دے
ڈونگھ دی تے ابھار دی گل اے
تیر خنجر نظر تے دل والی
جو وی اے ، آر پار دی گل اے
شاناں والا قبولسی عاطفؔ
اوس دے شرم سار دی گل اے

(غزل)

احمد نعیم ارشد

ایہ نہ سمجھیں گلاں لکیاں ہوئیاں نیں
کندھاں دے وچ اکھاں اگیاں ہوئیاں نیں

ایویں تے نہیں کھلری چپ ترنجن تے
اک دوجے نال سکھیاں رسیاں ہوئیاں نیں

اصلی موہناں اتے جعلی باسے نیں
پھلاں چوں خوشبو آں مکیاں ہوئیاں نیں

دھرتی اتے کال اے ساوے رکھاں دا
ایسے لئی سب ندیاں سکیاں ہوئیاں نیں

دل کرے تے جپھی پاکے مل جاویں
نعیم ارشد دیاں باہواں کھلیاں ہوئیاں نیں

(غزل)

اشفاق شاہین

پیار دلاں چوں دھکیا ہویائے میں تے اوہنے
اپنے آپ نوں ڈکیا ہویائے میں تے اوہنے

عشق سمندر کنا ڈونگھا ہو سکدا اے
ڈب کے تر کے تکیا ہویائے میں تے اوہنے

میں تے اوہ واں اک دوجے دے لیڑے وانگوں
اک دوجے نوں ڈکیا ہویائے میں تے اوہنے

اودھراوہ وے نیلم نیلا ایدھر میں آں
زہر عشقے دا پھکیا ہویائے میں تے اوہنے

جے اشفاقؔ اسیں نہ ٹریے وکھری گل اے
رستہ ہراک تکیا ہویائے میں تے اوہنے

بسم الله الرحمن الرحيم
In the Name of Allah, the Most Beneficent,
the Most Merciful

Printed By:
Kashish Printers
Ph: 042-37157719, 37157726
E-mail: kashish9299@gmail.com

Govt. Zamindar Postgraduate College, Gujrat

Principal's Message

Reading not only takes us into the new realms of knowledge but we can also press it into service for time earned ideas in the field of writing. It is universally acknowledged that reading is a pre-requisite for completeness and variety in writing. Keeping it in view, I can't help appreciating and congratulating all the teachers on the Editorial Board of The "Shaheen" for initiating the students into the art of committing their experiences and observations to paper.

Prof. Ghulam Abbas
(Principal)

Editorial Board 2019-20

Sitting L to R: Syed Saadat Mehdi, Dr Syed Waseem Raza Gardaizi, Muhammad Mehdi Khawar, Syed Waqar Afzal, Prof. Ghulam Abbas (Principal) Prof. Dr Muhammad Iqbal Butt (Vice Princpal), Rashad Ullah Butt, Muhammad Javaid Saghir, Muhammad Saeed

Standing: Hussain, Abdullah, Faiman, Armeen, Sidra, Komal and Rafia

CONTENTS

Editorial

"The Shaheen", this year too is a link in the chain of the great educational services rendered by Govt Zamindar Postgraduate College Gujrat. A history of many decades proves vividly that the college leaves no stone unturned for promoting any activity that contributes to the mental elevation of the youths associated with this phenomenal institution.

The regular publication of "The Shaheen" is the recognition of the facts that reading and writing are the two pivotal activities for enhancing the intellectual horizon of the students.

We try to maintain a diversity of writing items so that every taste can be gratified. Poetry, short stories, informative articles and translated writings are all the areas that we try to cover for ensuring diversity in the magazine. We are immensely delighted that our students wait for the magazine eagerly for relishing its contents, along with submitting their writings. This is what we want and this is what the magazine is meant for.

We always welcome the suggestions for the improvement of the standard of your magazine.

Rashad Butt
Assistant Professor
(Department of English)

Structuralism

Prof. Muhammad Javaid Saghir

(Department of English)

Ferdinand de Saussure (1857-1913) was a Swiss linguist whose ideas laid the foundation of structuralism. His most influential work, "Course in General Linguistic" was published in 1916. It started a movement called structuralism and this mode of reasoning is applied in such fields as anthropology, sociology, psychology, literary criticism and architecture. The leading linguists of this movement are Ferdinand de Saussure, Roland Barthes, Clande Levi Strauss, Jacques Lacan and Louis Althusser.

Structuralism gave the study of humanities and social sciences a new direction. It stressed on the fact that instead of studying a particular idea or trend, we should study the underlying structures that shaped it. It rejected the concept of author as a source of meaning. Instead our endeavor should be as to discuss the concept of meaning in the Saussurean linguistics.

Since, the time of Plato, it was believed language is merely a system of naming things. The things and the concepts existed in the world and when language was developed, it simply named these things and concepts. This theory took language passive which played no role in the formation of concepts. Saussure rejected this theory and said that language came before these things and helped us in understanding this world by differentiating among concepts.

In order to understand the concept, one has to analyze his linguistic system. His system that gave rise to the term structuralism might be discussed under the following headings.

The Signifier and the Signified:

Saussure says that language is a system of signs. A sign consists of a signifier and a signified. A signifier is the round image or the written shape. For example, when we read the word "dog" or write it, this would be called the Signifier. The signified is the concept associated with the signifier. When we hear the word "dog", the image of a four legged animal comes into our

mind. The signifier and the signified are inseparable. In fact, these are the two sides of the same coin. When the one comes into the mind; at once, the other follows.

Arbitrariness

Another feature of this structuralist approach is that there is no logic or reason between the signifier and signified. In this respect, Saussure says that in the beginning when language was formed someone named this four legged animal "dog" and the other people also started to call it by the same name. Later on, this became a convention and the coming generations also accepted it. So, Saussure believes that it is arbitrary to name a thing and yet it (the thing) has a trajectory structure to convey its concept.

Binary Opposition

Binary opposition is yet another structure/pattern that generates the meaning. Saussure believes that there is no positive term in language. He means to say that a Sign generates its meaning not by pointing to that sign rather by pointing to its negative. So, meaning of the Sign "night" is defined by its negative relation to the sign "day" as "not day"; "female" as "not female", so on and so forth.

Langue and Parole

"Langue", according to Saussure, is the abstract system of a language. This includes the sound system, vocabulary and grammar of a language. In the beginning, when a language was formed, such system did not exist. After some time, some people studied the way a language was spoken by the members of the community and derived rules from it. These "rules" became the "langue" of the language. The langue was derived from the speech of the individuals but after it came into existence, it (the langue) started ruling than (the individuals). Now, they cannot deviate from it. "Langue", therefore is a social phenomenon. It is concrete and one can study it. The books of a grammar of a language contain its language, the rules which must be followed by all the learners of that language.

"Parole", is the use of the rules of a language. For example, the rules of the Present Indefinite are langue and their use is the parole. Saussure

believes that the writer's parole cannot be free of the langue. He also believes that structuralism looks at the units of a system and the rules which make that system work. For structuralists, the units are words (or, the 44 phonemes which make all the sounds of words in English) and the rules are the forms of grammar which order words. In different languages, the grammar rules are different, as are the words, but the structure is still the same in all languages. Words are put together within a grammatical system to make meaning.

Syntagmatic & Paradigmatic structure

It is also called Chain, and Choice structure. Language is a form and not a substance. In a language, things are syntagmatically ~ paradigmatically related to each other. Syntagmatic form remains in linear/horizontal position; it represents a chain; while, on the other hand, paradigmatic form remains in vertical position means that we have choice to substitute words. For example,

Ali plays Cricket.

It is a syntagmatic form. But, at the same time, we have choice to substitute each word of the upper sentence. It depends on our choice. We may say:

Imran enjoys Cricket.

Here, we have made two changes. Such tendency is called the paradigmatic pattern of making sentences.

SYNCHRONIC and DIACHRONIC Structure/System of analyzing a language

Ferdinand de Saussure says that Synchronic study of a language means that the study of a language in a fixed time or in a given time. It views a particular state of a language at some particular/given time. It is also called descriptive linguistic.

On the other hand, diachronic linguistics views the historical development of the language. Thus, on the diachronic axis, we can go back – forth in time, watching the features. It is also called prescriptive linguistics.

In short, Saussurean Structuralism is based on Linguistic Relativity that emphasizes on the study of the properties of human language such as semiotics (The study of signs), arbitrariness, productivity, duality, discreetness. The thesis is that every language is a law in itself. To put it in the words of Ernst Cassirer (1945):

"Structuralism" is no isolated phenomenon; it is rather an expression of a general tendency of thought that, in these last decades, has become more and more prominent in almost all the fields of scientific research. It is the analysis of formal structures".

Prof. Zafar Hashmi

Hasty Sixty

Aleeza Khaliq (M.A English Part-II)

I am not the only one to benefit from the glorious light of knowledge shed by the distinguished teacher named Zafar Hashmi. The light emitted by him showed the path to thousands. Even millions won't be wrong particularly when he was associated with Govt. Zamindar College Gujrat and that too for more than three decades. Countless are those who attended his classes and many many are those who indirectly tied themselves with him as his students despite not attending his classes.

Prof. Zafar Hashmi explored literature and discovered a unique way of making his students explore it. A meticulous observation of life and human beings enriched his knowledge about literature. This was the observation which made his lectures a source of seeing the human life on a very large canvas. He was particularly dexterous in teaching poetry. He always analyzed poetry from undiscovered angles and made his analysis truly stunning. This tendency on his part contributed to the widening of the mental horizon of his students. He was always equipped with amazing example from the real life both serious and humorous. Sometimes too casually dressed and sometimes surprising formal in his outfit, he maintained diversity in his appearance.

Prof. Zafar Hashmi's retirement is like depriving the students of a unique aroma, and the tastiest spice. He cannot be forgotten on the grounds that whatever he spoke, he made it something to cherish and something to stay in his pupil's mind for ever. I will never forget his beautifully explained ideas flowing smoothly with interesting sips of too cold tea or too hot Pepsi. A small quantity of tea did not end unless the period ended, even if it lasted for two hours. The last word of lecture and last drop of Pepsi always went together.

So painful is his retirement because it brought interesting scenes to an end along with many many interesting words. How and why does one turn sixty so quickly. One should not, when one is Prof. Zafar Hashmi.

PAS-E-DEWAR-E-AAINA

Iqbal Malik

Department of English

Govt. College Satellite Town, Rawaplindi

To discover a poet in the personality of Prof. Kalim Ehsan Butt has been quite a task for me. His general conversation scarcely gives any idea of his being a poet. I myself experienced this situation in first meet-and-greet sessions with Prof. Butt. The significant fact of his versatile personality dawned upon me with the arrival of his fresh collection of poetry with the title given above. A brief critical analysis of certain thematic concerns Prof. Butt deals with in this collection is done here.

The very title of the book "*Pas-e-Dewar-e-Aaina*" by Prof Kalim Ehsan Butt signifies the world or worlds behind all demonstrations of this world. The poet seems to be somewhat exhausted with the panorama of the universe. The concept of lack in the poet's own perspective is frequently sensed during the course of reading. Consequently, the desire finds its way through words of the text. Prof. Butt chases his desire in the flight of imagination to a great extent. But the last milestone of his physical being reads the sign of 'forlorn' which he cannot cross. His physical existence does not support him rather hampers, yet he remains adamant but complains:

Go mera jism mera sath nahe day sakta

Meray inkar mein baqi rahi taqat meri.

The dual effect of the lack, retrospective and prospective, is given appropriate description in several ghazals. Likewise, nostalgic effects provide the feel of right literary taste of the poet. He misses the flowers and birds in the lap of Mother Nature. He remains in search and inquires about the whereabouts of those agents of beauty. He asks:

Janay kahan gai hen wo phoolon ki bastian

Janay kidhar gay hen prinday bahar kay.

In the era of postmodernism, Prof Butt gives good comprehension of discourse of his time. While he misses romantic pleasure amidst nature, at the same time he articulates his understanding. That is to say that he is not naïve in the field of pure romanticism, rather he approaches the politics underneath and strikingly points out it. He says:

Us ki ye sari guftagu hazrat

Bus siasi hay aur kuch bhi nahe

While negotiating with nature, the poet does not remain earth bound. He travels to the celestial world. He even fathoms the metaphysics. His quest does not let his soul remain at peace; rather he time and again transports his very being into the world of dream to satisfy his specific pursuit for the ideal. The metaphor of dream and migration are yoked together.

Janay ye khawab kia dikhaay ga

Mein ne dekhi hay rat bhar hijrat

Like Shelley, Prof. Butt feels and describes both dimensions of Nature. Shelley addresses the west wind by calling it destroyer and preserver. In the lines of Prof. Butt, rainfall turning into storm as a disastrous agent is given appropriate depiction. The rain as blessing for droughty soil of the desert is also characterized through personification it in a befitting manner. The benevolent and malevolent aspects of natural phenomena is well expressed in the lines of Prof. Butt.

Us ki qudrat mein hen barish bhi hawaen bhi kalim

Mein ne ik deep jalaya hay Khuda kher kray

……

Aesi piasi thi rait sehra ki

Parh gai hay azab mein barish.

Parameter of Normalcy

Irfan Haider

(Lect. English Govt. Zamindar P/G College Gujrat)

Every society has its own value system. We live in an age where passion, ego and materialism fall in the category of what we call normal. People come and start following the prevalent patterns of those societies. After all they want themselves to be called normal. No one has the guts of becoming abnormal. In other words, people stop regarding selflessness, patience and sympathy or even goodness itself as it will make them abnormal.

K. is a person who remains aloof from his homeland for a good deal of time. At last, after a great many years, he returns to his vicinity to which he belongs physically but not culturally. He can be compared to an infant being separated from the filth of his surroundings and returning as an adult whose childish innocence is still intact. Alas! His naivety brings him the label of an idiot.

He cannot drive his vehicle fast. He cannot even kill a fly. He has within him the womanish sensitivity and frankness of a child. He lacks the usual crassness of the world. Initially, people make fun of him. He is just a laughing stock for them. But later he becomes a threat for them and their seemingly holy patterns.

He is goodness incarnate and expects everybody else around him to be the same. Unfortunately, the others have a certain value system to follow. They are not acquainted with goodness, politeness and patience. As a result, they hammer him back to where he comes from. Finally, the personal values fail to be preserved in the teeth of the so-called normal social standard.

Crassness prevails only when virtue backs off. Certainly, goodness needs the aggressiveness of the evilness. Otherwise, it will be a one-sided battle between a dwarf and a giant.

Why are Encouragement Words Better Than Criticism?

Saba Sikandar Hayat

(M.A English Part-I)

Encouragement is the act of giving someone support, confidence and hope. Encouraging others is an important part of being part of a family, a group of people and a community. Sometimes, a single word of encouragement can help others realize that their efforts are not valueless. A word of encouragement during failure is better than an hour of praise after success.

As said by Johann Wolfgang "Correction does much, but encouragement does more"

Even if we know that everyone needs encouragement, not everyone has the will to give it away. Our selfish human nature makes us love to judge others or put them down. In a world where challenges abound, it's easy for us to feel discouraged. The thought of giving up is always present in our minds just because there is no one we can turn to for words of kindness and encouragement. These words can help us to provide with energy and strength to accomplish our objectives. They are like light that gives us hope. Challenges can make us physically and emotionally drained, but with the right words, we can be revitalized.

We all are human beings, we try new and different things, and we make mistakes as well but it does not mean we should criticize others for their mistakes, rather we should appreciate them for trying.

As said by Albert Einstein "A person who never made a mistake, never tried anything new".

According to Daisaku Ikeda "Even if things don't unfold the way you expected, don't be disheartened or give up. One who continues to advance, will win in the end"

When we are at our lowest, we tend to withdraw from other people because we fear their judgment. But if there is someone who can empower us with encouragements, that person will be the bringer of hope. Positive words can help to calm us and make us stop to analyze what's going on in our life. It has the power to make us see the situation from a better perspective. Encouragement is not just a confidence booster. It is also a restorer of self-confidence.

Encouragement is a great motivator. It makes people work harder and exert greater effort to accomplish their objectives. It helps to make people successful in their endeavors. Encouragement from others will help them be proud of their accomplishments. We should try to avoid people who discourage us. You will need many people in your life to tell you that you are not capable, tell you that it is beyond your reach to laugh at you and your dreams, but you should not get discouraged rather their negativity should inflame your passion. You should have a mindset "I can do whatever I want"

A person should always be aware of his strength. Most of the time, when someone tries to discourage you from your vision, it is due to things which have nothing to do with you. They are in fact threatened by you, jealous of you or they lack vision themselves.

If you have a vision and you are willing to do the work necessary to get somewhere, don't allow other people to contaminate your dream with negativity. Their negativity belongs to them. If you want to move past mediocrity and gain positive momentum in your life, you must shield yourself from the negative. It is negativity that fertilizes the destructive downhill boulder. You must conceive what you want, and move ahead with the commitment that you can reach the pinnacles and you should make your mark.

"Effect of Social Media on Human Perception"

Ali Hussaini Naqvi Lecturer in English

Social media and human perception are intimately associated to each other. The image gets blurred when it comes to close contact with eye. It magnifies beyond reality and forms a magnanimous canvas which not only distinguishes one color from other but also separates one stroke of the same color from another. Then, that one stroke magnifies to such an extent that one gets drowned and lost inside it. The canvas engulfs and devours the looker. In the same way excessive use of social media defines one's being, justifies one's existence, suggests one's performance and handles the affairs concerning our day to day lives. The more one uses the more one gets affected. The graph of both competence and performance touches the lowest line of decline. The person who spends his days and nights using apps sleeps on the pillow of Skype, on the mattress of Whatsapp, on the sheets of Viber and under his pillow lays Facebook which he takes out during the pauses of his sleep.

The one who uses social media deadens his ability to perceive the things. His level of concentration gets diluted and his physical presence means nothing for others. Though he remains at a particular place yet he does not remain there. Social media obsession converts one's physical presence into a mental absence. The user seems to be awakened in the peak hours of the day with his eyes wide opened but in fact he enjoys slumber at that time. His eyes remain no longer opened when they are opened and he neither can think nor can understand while he professes to do so. It happens because he is already in warm engagement with the fancies of his mind. He lulls himself to sleep in the phenomenal world of existence while keeps all his senses fully awakened in the realm in which he is lost. Using social media is to induce it in your brain; its addiction is worse than a drug, its company is an illusion, its touch is sweet suffocation and its obsession is a confirmed death. The results summarized after the collection of data through different sources clearly disclose what social media has done with the very psyche of people. Its excessive use is the root cause of neglect on the part of the people towards the ongoing affairs of their lives. Consequently, the students do not understand what needs to be understood, the teachers do not

deliver what they actually should deliver, private and public servants do not perform in a way which suits them and doctors do not come up to the expectations. Relatives are ignored and friends are taken for granted because people remain busy in communicating with the friends and relatives of an illusory world. The fever of excessive use of social media blurs human perception in such a way that they do not pay any heed and attention to the people around them. They mean exactly the opposite to what is said to them or sometimes they misunderstand what they must understand. Personal and private lives of the people who are involved in an excessive use of social media get badly affected because the obsession disturbs the very psyche and working of human brain. The nearer get distant and remote whereas the distant become the nearest. Human mind gets upside down and the power of perceiving things turns turtle. Hence what gets distant in the minds of the users (which is in fact the nearest) is ultimately forgotten. The very profession, occupation, learning, concepts, theories, character, conduct, treatment, philosophy and almost everything vanishes along with the forgotten memories and all is replaced by a new set of things. In this state, only castles can be built in the air but they are as transitive as daylight, as fleeting as human plans, as changing as a dice and as fickle and untrustworthy as human nature itself. Because of his inverted perception, the user of social media lives everywhere else except in the world of reality- the physical world. Therefore, when he does not understand and respond to anything because of his blurred perception, his mind is definitely not responding the way it should and his senses are miserably numbed. An excessive user of social media disorients his mind and his psyche becomes the most indistinct thing of the world.

Social media leaves such scars on the human perception as prevent it from perceiving the things in their actual form. Obsession of social media disturbs the human perception in a way that no panacea can heal the wounds inflicted on one's power of understanding. It also creates a world of 'Presence in Absence' and 'Absence in Presence. Who can then deny the fact that the human perception and the level of mental concentration get blurred and badly affected by the unrestrained use of social media? Tragically, there is no realization about how much devastation this obsession is causing to our power of perceiving things in their actual perspective.

Feelings and Emotions

Areej Arif

Zoologist at UoG

Ex-Student and Girls Sports Head of Zamindar College

The word "Feeling" was first used in the English language to describe the physical sensation of touch through either experience or perception. In psychology, the word is usually reserved for the conscious subjective experience of emotion.

A gut feeling is a visceral emotional reaction to something. It may be negative such as feeling of uneasiness or positive such as feeling of trust. Gut feelings are not mostly under the conscious control. It may also be called "common sense", perception of what is considered the right thing to do; such as, helping an injured passer-by, avoiding dark alleys and generally acting in accordance with instinctive feelings about a given situation.

Emotions and feelings are central to our life. They allow us to achieve the fullness of our personality by motivating us towards that which is good. However as a result of bad experiences, our emotional life can be disturbed. Our whole life is built around emotions, many people can't understand and express them. In this accordance, Leo Tolstoy asked in his novel:

"Is it really possible to tell someone else what one feels? "

The best answer is, feelings and emotions are innate and everyone has the ability to experience and express them. Each person has some degree of control over the way of expressing the feelings. Some people hesitate and others express their feelings openly, without any hesitation.

Colours are also used for the representation of feelings and emotions. Negative emotions such as anger and sadness are believed to fill an aura with dark and unpleasant colours while positive emotions such as happiness, show light and clear colours.

According to Daniel Goleman, success isn't entirely based on one's I.Q level, it is mainly based on individual's emotional intelligence. To refrain from rage or any other bad emotions, a person can reframe the situation by thinking positively. Emotional changes can benefit as well as harm a person and people around him.

In Shakespear's writings, three of the most basic human emotions, love; hatred; and jealousy are thoroughly examined. In one of his plays, "Romeo and Juliet" many characters make rash decisions by following their emotions.

Human mind is very much complex and it doesn't take much to completely change one's attitude or psychological state. Emotional responses also differ depending on what type of mood you are in. The new born babies show majority of their emotions through crying. With the passage of time, infants begin to express a wider range of emotions.

Emotions and feelings have a close link with music and poetry. If we do have similar emotions as the writer, we can't understand the message conveyed. Poetic words explains meanings, feelings and emotions. On the other hand, any song that doesn't express emotions should be considered an art.

Emotional imbalance can cause many diseases. "Anoresia nervousa" is an emotional illness in which a person refuses to eat. It is common in adolescent girls and young women. The word anoresia means without appetite and anorexics may be extremely hungry most of the time. Actually, they avoid food for psychological reasons.

"Excess of everything is bad"

Emotions and feelings should also be maintained in a balanced state. We should stay hopeful and thankful towards Allah Almighty in all situations and conditions. It is one of the best ways to keep our feelings and emotions in a proper balance.

Teaching and Teacher

Tania (M.A English Part II)

1. Never teach without being in love for teaching.
2. Teaching is unfolding the wings of head and heart.
3. A good teacher can inspire hope, ignite the imagination and instill a love of learning.
4. A teacher gives his pupils something to take home to think about besides home work.
5. The task of the modern educator is not to cut down jungles, but to irrigate deserts.
6. Good teaching is ¼ preparations and ¾ theatres.
7. Teaching is the royal road to learning.
8. Teaching is productive only when it makes the learner think.
9. Teaching is the highest form of understanding.
10. The art of teaching is the art of assisting discovery.

Saba Pervaiz

(M.A English Part-2)

How deceptive is a mirror?

Inspite of being clearer.

As whenever you look in it,

It admires; you're incredibly fit.

This reflector always creates confusions,

And you'r caught prey of its delusions.

Oh man! yes you a well dressed poor man,

Considering yourself as beautiful as a nymph with fan.

Oh poor man! Beware of its feat,

It is nothing but a cheat.

And you search your reality in it, oh the man in blue;

It is just a reflections, not the real you.

you'll realize yourself as clear as never before.

English Translation of Amjad Islam Amjad's Poem

"A Poem for Nelson Mendella"

Translated by (Prof. Rashad Butt)

All around was endless gloom,

Not letting him feel,

When the night approached

And when the day broke.

He was all alone.

The deadly treads of watchmen,

Deepened more the silence,

Which blackened the prison doors

And the prison walls___

The treads that he had been with

For seven and twenty years.

Many who were keeping watch

Were not as old as was

His imprisonment.

Heaven knows what elements

Were chosen to form

That silent "Resolve",

Lounging with the prison wall;

That Prince of the oppressed,

The armless and the black,

As he himself was;

That singular man.

He was shedding from his soul

A glowing fragrance of flowers

Overwhelming every place

Off the prison walls.

A beam of dreams was in his eyes

Melting yoke and shackles.

There were dwellings in his eyes,

Haunted by dismay,

With dead bodies around

And people with dreams.

Those who passed away

Were his kinsmen___

All belonging to him

These were faceless people all___

Homeless, though they had a home;

They were now with bloody eyes,

Void of sights around.

That imprisoned, lonely,

Still and silent shadow,

Was in fact a "Proclamation"

With many a face in it;

A "Denial" he was in which

Meaning, had been transformed

Of the words the strong had coined;

Such tenacious wall he was

As had made the storms recede.

All around within his soul

Were the mirrors for showing him

That the long stretched gloom

Was at last to have an end;

And beyond the prison wall,

All the fragrance of his dreams

Was pervading heart to heart.

He did know

That day is close

When his land is to be his

As a garden through and through.

When that world of likelihood,

When that world of codes

Will from the impossible

Be the possible,

Standing on the threshold

Of the dawning century

When the world discerns behind,

Interspersed with his shadow,

Will be every sight;

Whenever is indited

The tale of human reverence,

There will be his name too

In golden

And glowing words.

Gabriel and Satan By Iqbal

Translated into Engllish by Anwar Hussain Syed

Gabriel

O old friend of mine! Tell me

How is this world of scent and hue?

Satan

It has nothing but music sad,

Pain and pang, longing to expand.

Gabriel

In the skies, you are the subject

Of our discussion each moment.

Don 't you like your robe torn

Be mended and be adorned?

Satan

Ah! O Gabriel this mystery

To you is unveiled really!

Actually my broken goblet

Intoxicated me at best.

It is impossible for me

To abide here with glee.

This world so dull so calm and quiet

Is void of streets and turrets high.

He whose disappointment lent

The Cosmos the real pain and fret,

Will dejection or optimism

Benefit, suit and favour him?

Gabriel

Your denial cost you your high

Renown, stature and pride.

What respect did the angels hold

In the eyes of the true Lord?

Satan

My defiance has lent man

The urge to grow and expand.

The riots and evils I stir

From the basis of mind subtle.

The war between good and evil grim

You only espy from the brim

Who is being buffeted by

This severe storm? You or I?

Khidzer is utterly helpless

And Ilyas's chagrin is no less;

Because my tempests run wild

In oceans, rivers, and streams mild.

If ever you spare time,

Just inquire of God to find

Whose blood lent colour and sway

To man 's today and yesterday.

My being pricks the heart of God

Like a thorn so sharp and hard;

You are only given to God’s_

Submission, fear, and full command.

English Translation of Faiz’s Ghazal

(گلوں میں رنگ بھرے بادِ نو بہار چلے)

(Rendered into English By Qaisrah Syed)

HOD (English) UOG Marghazar Campus, Gujrat

Flowers may get hue

Vernal wind may blow

Come my dear I pray

And make the garden grow!

.....

The cage is gloomy O friends!

Say some thing to the breeze

For God's sake some one

Should talk of love indeed.

.....

My dawn may break someday

With your gentle smile

By touching your sweet locks

The night in fragrance flow.

.....

Though this heart is poor

The bond of pain is big

Your name is enough to pull

consolers to my side.

.....

Don’t ask how I spent

In loneliness that night

The tears shed by me

Washed your future bright.

.....

I was called before the friend

With the sheet of fondest love

Bagging all the threads

Of my collar I left.

.....

No place fascinated me

O Faiz on the way!

Leaving the lane of love

To the gallows went straight.

English Translation of Iftikhar Arif's Urdu Poem

Barhwaan Khilarhy (Twelfth Man)

Translator: Rashad Butt (Assistant Professor)

In a pleasant weather

Innumerable spectators

Turn out to applaud

The team that they adore

And to cheer the players

They are fond of.

Sitting aloof however

I just hoot and hoot

At the twelfth man.

How strange a player

Is a twelfth man!

When on goes the play,

Shouts are all they way,

Up remains the passion

Of viewer's ovation.

Secluded this twelfth man

Meanwhile awaits

Some tragic incident

Or any mishap,

So that he could go to play

خوشگوار موسم میں

ان گنت تماشائی

اپنی پنی ٹیموں کو

داد دینے آتے ہیں

اپنے اپنے پیاروں کا

حوصلہ بڑھاتے ہیں

میں الگ تھلگ سب سے

بارہویں کھلاڑی کو

ہوٹ کرتا رہتا ہوں

بارہواں کھلاڑی بھی

کیا عجب کھلاڑی ہے

کھیل ہوتا رہتا ہے

داد پڑتی رہتی ہے

اور وہ الگ سب سے

انتظار کرتا ہے

ایک ایسی ساعت کا

ایک ایسے لمحے کا

جس میں سانحہ ہوجائے

پھر وہ کھیلنے نکلے

تالیوں کے جھرمٹ میں

ایک جملہ ء خوش کن

ایک نعرہ ء تحسین

In a thunderous clap
For winning some winsome phrase
Or chanting of praise,
Wishing that for all applause,
He too be a cause;
Longing for the worthiness
The other players possess.
But this seldom comes off.
Even then the people say
That between a game and player
There's a bond to stay.
Nonetheless this lasting tie
Comes to break up by and by.
At the final whistle's blow
The sinking heart may break too.
You too Iftikhar Arif are a twelfth man---
Waiting for a tragedy
Or many mishap.
You will also lose heart;
You too have to fall apart

اس کے نام ہوجائے
سب کھلاڑیوں کے ساتھ
وہ بھی معتبر ہوجائے
پر یہ کم ہی ہوتا ہے
پھر بھی لوگ کہتے ہیں
کھیل سے کھلاڑی کا
عمر بھر کا رشتہ ہے
عمر بھر کا یہ رشتہ
جھوٹ بھی توسکتاہے
آخری وسل کے ساتھ
ڈوب جا نے والا دل
ٹوٹ بھی تو سکتاہے
تم بھی افتحار عارف
بارہویں کھلاڑی ہو
انتظار کرتے ہو
ایک ایسے لمحے کا
ایک ایسی ساعت کا
جس میں حادثہ ہوجائے
جس میں سانحہ ہوجائے
تم بھی افتحار عارف
تم بھی ڈوب جاو گے
تم بھی ٹوٹ جاو گے

English Translation of Faiz's Poem

Translated into English by K.C KENDA

Having lost both the worlds in the game of love,

دونوں جہان تیری محبت میں ہار کے

There goes a lonesome man, ending his night of grief

وہ جارہا ہے کوئی شبِ غم گزار کے

Desolate lies the tavern, abandoned lies the cup,

ویراں ہے میکدہ خم و ساغر اداس ہیں

With your departure, spring has taken leave.

تم کیا گئے کہ روٹھ گئے دن بہار کے

Just a mere four-day leave given to us to sin,

اک فرصت گناہ ملی وہ بھی چار دن

How magnanimous, you see, is our mighty Lord!

دیکھے ہیں ہم نے حوصلے پروردگار کے

The world has expunged your memory from my mind,

دنیا نے تیری یادسے بے گانہ کردیا

More engaging than you are the cares of daily life.

تجھ سے بھی دلفریب ہیں غم روزگار کے

To-day, Faiz, unawares she chanced to give a smile,

بھولے سے مسکراتودئیےہیں وہ آج فیض

O what a swell and surge within my powerless heart!

مت پوچھ ولولے دل ناکردہ کارکے

A poem by Qadeer Afzal Warraich

Student: M.A English

Only in dark you can see the stars

You have to struggle to get the mark

To make your identity out of billions

Stay in field, when others are in pavilion

The sun burns to look bright

Work hard and hold your dreams tight

Don't be like those who only want to eat but don't want to hunt

Learn to face hardships and bear the brunt

Don't get afraid of rustling of wind

Stand steadfast and to obstacles abscind

You have to prove those scoffers wrong

Failures are meant to make you strong
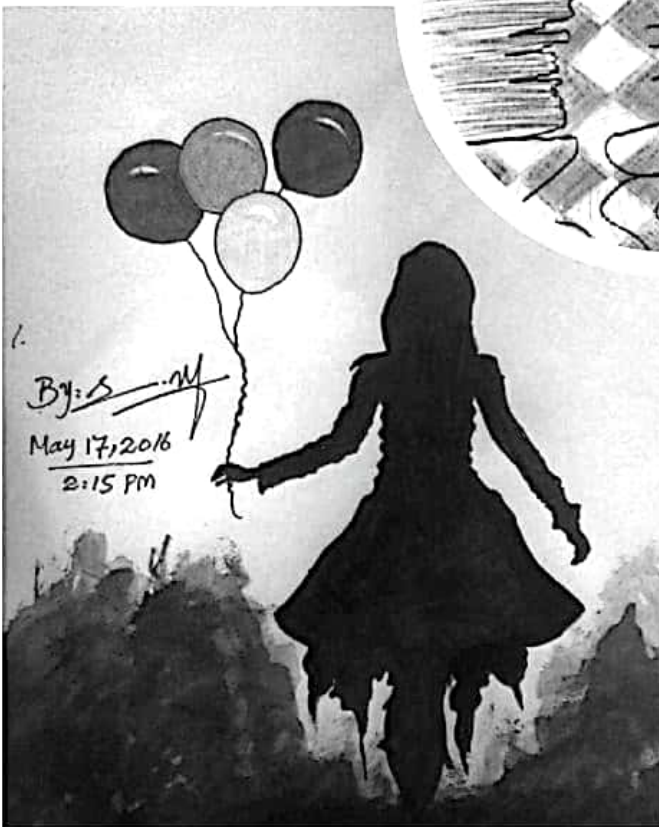
Syeda Nida Fatima
Ex- Student of Zamindar college

کالج سٹاف اور تقریبات کی تصویری جھلکیاں

گروپ فوٹو کالج ٹیچینگ سٹاف

شاہین رائٹرز کلب

گروپ فوٹو، شعبہ نفسیات، انگریزی اور پنجابی

گروپ فوٹو شعبہ علوم اسلامیہ

گروپ فوٹو شعبہ کمپیوٹر سائنس

گروپ فوٹو شعبہ اکنامکس

گروپ فوٹو شعبہ کیمسٹری

گروپ فوٹو شعبہ فزکس

گروپ فوٹو شعبہ اردو

گروپ فوٹو شعبہ سیاسیات

گروپ فوٹو شعبہ ریاضی

گروپ فوٹو۔ بی ایس پروگرام (پہلا سیشن ۲۰۱۹)
طلبہ اور اساتذہ پرنسپل کے ہمرا

دائیں سے بائیں ڈاکٹر اقبال بٹ ، پرنسپل غلام عباس،
ڈی ڈی سی گجرات شہزاد منور

گروپ فوٹو سی ٹی آئی اساتذہ

انچارج ایوننگ پروگرام

پروفیسر سید افتخار علی شاہ ہمراہ پرنسپل و اساتذہ

گروپ فوٹو زمیندار ہیلتھ کیئر سوسائٹی ہمراہ پرنسپل

ایڈمن سٹاف ہمراہ پرنسپل

گروپ فوٹو کالج ملازمین

سینئر لائبریری کلرک عمران
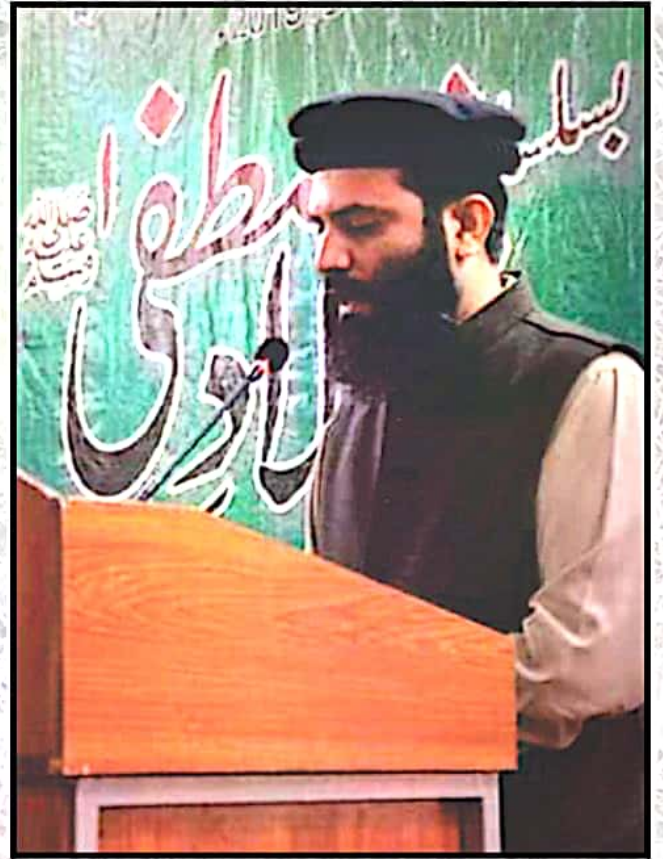
سیرت کانفرنس ﷺ
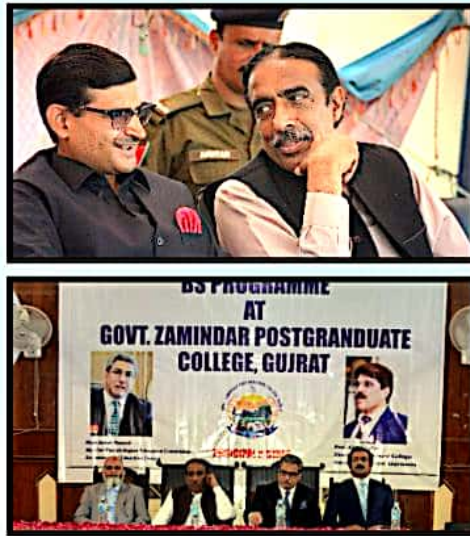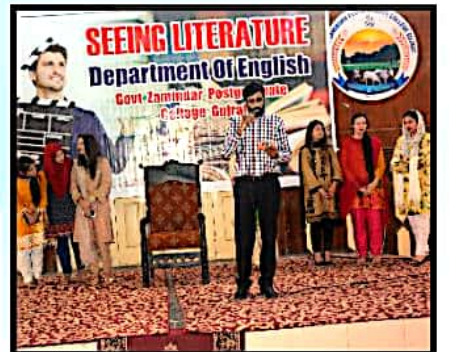
سٹاف سیکرٹری محمد مہدی خاور پرنسپل اور وائس پرنسپل کے ہمراہ

متفرق تقریبات کی تصویری جھلکیاں

CRICKET CLUB

سالانہ سپورٹس گالا
2019

سالانہ سپورٹس گالا
2019

2020

سالانہ سپورٹس گالا
2020
پرنسپل جناب غلام عباس،
پروفیسر اعجاز محمود قریشی صدر شعبہ فزکس
اور پروفیسر طارق صاحب ڈائریکٹر سپورٹس زمیندار کالج
سے منسوب کیا گیا

2020

B.S.F